بلوچستان میں اردو کا نثری ادب: ارتقائی مطالعہ

(از قیام پاکستان تا حال)

(مجوزہ مقالہ برائے پی ایچ-ڈی، اردو)

محقق

فیصل ریحان

رجسٹریشن نمبر: 22-FLL/PHDURDU/F11

نگران

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

کلیۂ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No. [illegible] 94157

PhD
891.4398
ف ي ب

اردو ادب ۔ نثر
" " "
۔ بلوچستان (پاکستان)

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں پی ایچ۔ڈی اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور پی ایچ۔ڈی اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"بلوچستان میں اُردو کا نثری ادب: ارتقائی مطالعہ (از قیام پاکستان تا حال)"**

مقالہ نگار: فیصل ریحان

رجسٹریشن نمبر: 22-FLL/PHDURDU/F11

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف
ڈین
کلیۂ زبان و ادب
آئی آئی یو، اسلام آباد

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
صدر
شعبۂ اُردو
آئی آئی یو، اسلام آباد

پروفیسر ڈاکٹر رشید امجد
شعبہ اُردو
سابقہ ڈین، آئی آئی یو، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز
شعبہ اُردو
نمل یونیورسٹی، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف
شعبہ اُردو
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

جون، 2019ء

انتساب

والدین کے نام

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
انتساب	
پیش لفظ	i
باب اول: بلوچستان: تاریخ، تہذیب اور ادب	۱
حوالہ جات	۳۵
باب دوم: بلوچستان میں اردو زبان و ادب (ابتدأ سے قیام پاکستان تک)	۴۰
حوالہ جات	۱۰۳
باب سوم: بلوچستان میں اردو افسانہ (قیام پاکستان کے بعد)	۱۰۸
حوالہ جات	۱۹۲
باب چہارم: بلوچستان میں اردو ناول (قیام پاکستان کے بعد)	۱۹۶
حوالہ جات	۲۸۴
باب پنجم: اردو نثر کی دیگر تخلیقی اصناف	۲۸۹
حوالہ جات	۳۲۷
حاصل مطالعہ	۳۲۹
کتابیات	۳۳۸
ضمیمہ جات	۳۴۷

پیش لفظ

بلوچستان پاکستان کا ایک اہم صوبہ ہے۔ یہ جس طرح مختلف معدنیات سے مالا مال ہے اسی طرح ادبی خزائن سے بھی پُر ہے۔ بلوچستان کی ادبی روایت اردو، بلوچی، براہوی، پشتو اور فارسی زبانوں کے ادبیات پر مشتمل ہے۔ پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کے بعد جب مقالہ لکھنے کا مرحلہ آیا تو پہلے پہل خیال دوسرے موضوعات کی طرف گیا، مگر پھر سوچا کیوں نہ اپنے صوبے سے متعلق کسی ایسے موضوع پر کام کیا جائے، جو اہم بھی ہو اور اس کی ضرورت بھی ہو۔ بلوچستان کی اردو شاعری سے متعلق ہونے والے کام کے بارے آگاہی تھی، جبکہ یہاں لکھی جانے والی نثر پر بہ طور مجموعی کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ صرف افسانے پر ایک آدھ کتاب موجود ہے، مگر اس میں بھی معیاری تحقیق و تجزیے کا فقدان ہے، سو یوں بلوچستان میں اردو کے نثری ادب کو موضوع تحقیق بنانے کا ارادہ کیا۔ ویسے بھی دل میں ایک تمنا تھی کہ کسی حوالے سے اردو نثر پر کام کیا جائے۔ کچھ ردوکد کے بعد اس موضوع پر ابتدائی خاکہ شعبہ اردو میں پیش کر دیا۔ اساتذہ سے زیر بحث آنے اور قدرے تبدیلی کے بعد خاکہ حتمی منظوری کے لیے پیش کر دیا اور اس کے منظور ہوتے ہی کام کا آغاز کر دیا۔

یہ موضوع جو شروع میں قدرے آسان لگتا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مشکلات سامنے آئیں۔ بلوچستان میں لکھی جانے والی اردو نثر کی اگرچہ اکثر کتب میرے پاس موجود تھیں۔ ایسی کئی کتب بعد میں سامنے آئیں پہلے میں جن کے نام تک سے آشنا نہ تھا۔ ایسی بعض کتب کی دستیابی بھی ایک مسئلہ تھی، مگر تحقیق میں ایسے مسائل تو پیش آتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ نہ صرف تمام اہم کتب مل گئیں بلکہ بعض غیر مطبوعہ اور نایاب مطبوعہ کتب دستیاب ہوئیں، جن پر اولین سیر حاصل گفتگو اس مقالے میں کی گئی ہے۔

اس مقالے میں انیسویں صدی میں بلوچستان میں لکھی جانے والی بعض اہم کتب اور ایک غیر مطبوعہ اردو رپورٹ کی بازیافت ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کے بعد کوئٹہ سے شائع ہونے والے کئی ناول، افسانوی مجموعے، سفرنامے اور دیگر کتب جو اب تک پردہء گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس مقالے میں پہلی بار سامنے آئے یا ان کا پہلی بار تفصیل سے تجزیاتی مطالعہ کیا گیا۔ اس تحقیقی مطالعے میں چند تسلیم شدہ حقائق کو دلائل کے زور پر نہ صرف رد کیا گیا بلکہ ٹھوس اور مدلل بحث کے بعد نئے حقائق بھی پیش کیے گئے۔ اس میں بلوچستان میں اردو کے سب سے پہلے افسانے اور سب سے پہلے ناول کے بارے میں اب تک موجود تمام آراء کو ٹھوس حقائق اور مدلل تجزیے کے بعد

رد کیا گیا ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ، ان اصناف کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے نئے بازیافت شدہ حقائق کی بناء پر بلوچستان میں اردو کے پہلے افسانے اور افسانہ نگار، ناول اور ناول نگار کا از سرِ نوتعین کیا گیا ہے۔اس طرح یہ مقالہ اپنے موضوع کی حد تک پہلے سے موجود علم میں کئی اہم باتوں کا اضافہ کرتا ہے۔امید ہے کہ اس سے اردو تحقیق وتنقید میں نئے سوالات اور مباحث جنم لیں گے اور بلوچستان کی ادبی روایت کی اہمیت اجاگر ہوگی۔

یہ دعویٰ تو ہرگز نہیں کہ پیشِ نظر مقالہ ہرقسم کی اغلاط سے پاک ہے۔البتہ میری کوشش رہی ہے کہ ہر بنیادی ماخذ تک رسائی ہو اور کوئی فاش غلطی سرزد نہ ہو۔اس حوالے سے مولوی محمد شفیع کا وہ جملہ ذہن نشین رہا جو انھوں نے ڈاکٹر وحید قریشی کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ ''اچھا محقق وہ ہوتا ہے جو کم سے کم غلطیاں کرے''۔سو مقالہ لکھتے ہوئے یہ بات دھیان میں رہی کہ کم سے کم غلطیاں راہ پائیں۔

ان تمام حضرات کا شکریہ مجھ پر واجب ہے جنھوں نے کسی نہ کسی حوالے سے اس مقالے کی تسوید میں مدد کی ، کتب فراہم کیں یا کوئی ایسا اشارہ دیا جس سے مجھے راستہ ملا۔ان تمام کتاب دانوں کا بھی شکریہ جن کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ جناب ساجد کوثر کا انتہائی شکر گزار ہوں، جنھوں نے اپنے والد ڈاکٹر انعام الحق کوثر مرحوم کے کتب خانے سے بعض نہایت اہم کتب فراہم کیں۔ایسی کتب جو کہیں اور سے دستیاب نہ ہو پاتیں۔اس مقالے کے نگران ڈاکٹر عزیز ابن الحسن ہیں، اس راہنمائی کے لیے میں ان کا سپاس گزار ہوں۔گذشتہ برس صدر شعبہ اردو ڈاکٹر طیب منیر کی ناگہانی وفات کا دکھ جھیلنا پڑا۔وہ صرف صدر شعبہ اردو ہی نہ تھے، بلکہ ہر سکالر سے ایک پرخلوص رشتہ استوار کرتے تھے۔ان کا رویہ بڑی حوصلہ افزائی کا موجب تھا۔خدا انھیں غریق رحمت کرے ان کی یاد ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔

اپنے والدین کا شکریہ کس طور ادا ہوسکتا ہے کہ وہ ہر وقت آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں اور ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔شریک حیات اور بچوں کی محبت کا بھی مقروض ہوں کہ ان کو دیا جانے والا کافی وقت اس مقالے کی تسوید اور فراہمیِ مواد کی کوششوں میں گزرا۔وہ عین راحت دل کا سبب ہیں۔

امید ہے کہ یہ مقالہ بلوچستان میں اردو نثر کے ارتقائی مطالعے میں معاون ثابت ہوگا اور قارئین کی توجہ حاصل کرے گا۔اگر ایسا ہو پایا تو میں سمجھوں گا، میری محنت رائیگاں نہ گئی۔

فیصل ریحان

باب اول:

بلوچستان: تاریخ، تہذیب اور ادب

بلوچستان آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے چھوٹا، جبکہ رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے۔ یہ اپنے جغرافیائی محل وقوع، مختلف النوع قیمتی معدنیات کے بہت بڑے ذخائر اور گوادر جیسی اہم بندرگاہ کی بدولت نہایت وقعت کا حامل ہے۔ یہ صوبہ گذشتہ ایک عرصے سے انتشار، بدامنی، فرقہ وارانہ تشدد اور مسلح کاروائیوں کا نشانہ ایک تسلسل سے بنا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بلوچستان کی یہی تزویراتی اور معدنی اہمیت ہے۔ گوادر بحری اور بری حوالے سے سی پیک منصوبے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم اس کا مختصر ذکر آگے کیا جاتا ہے۔

بلوچستان کی تاریخی حدود

پہلے باب کی ابتداء میں بلوچستان کا تاریخی، تہذیبی اور لسانی وادبی پس منظر تفصیل سے بیان کیا جائے گا تا کہ ہمارے آئندہ موضوع کی ایک مناسب تصویر سامنے آسکے۔ عام تصورات کے برعکس بلوچستان ادبی، تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے مالا مال ہے۔ اس کا ثبوت یہاں ملنے والے آثار قدیمہ، عہدِ پارینہ کے باقیات، کثیر اللسانی ادبی روایت، قدیم تذکروں اور تاریخی کتابوں میں درج اس کے امتیازی نشانات ہیں۔

بلوچستان کی اصل اور قدیم حدود کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ زمانہء قدیم میں بلوچستان کی حدود بے حد وسیع تھیں۔ اس میں سندھ کا ایک حصہ، بعضوں کے نزدیک پورا سندھ، پنجاب کا ایک حصہ یعنی ڈیرہ غازی خان اور اس کے مضافات، خیبر پختونخواہ کا علاقہ ڈیرہ اسماعیل خان، جنوبی افغانستان کا ایک حصہ اور ایرانی صوبہ بلوچستان وسیستان شامل تھے۔[۱] اس کے برعکس ایک تصور یہ ہے کہ پرانے وقتوں میں بلوچستان، سندھ کا ایک صوبہ تھا، جب پورا برصغیر دو حصوں پر مشتمل تھا ایک کو ہند اور دوسرے کو سندھ کہتے تھے۔ سندھ سے بلوچستان کے انتظامی تعلق کے حوالے سے ایک اشارہ مرزا غالبؔ کے ایک فارسی شعر میں بھی ملتا ہے جو انہوں نے برہان قاطع کی بحث میں مولوی احمد علی کے حوالے سے ایک قطعہ میں لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے بلوچستان کے دو علاقوں کیچ اور مکران کے بارے کہا ہے کہ ان کا تعلق سندھ سے ہے نہ کہ ایران سے ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں:

کیچ و مکراں را کہ از سند است واز ایران جدا
شاملِ اقلیم ِ ایران بے محابا کردہ است[۲]

ترجمہ: [کیچ اور مکران کا علاقہ سندھ میں ہے یہ ایران سے جدا ہے۔ کیسے بلاتکلف سرزمین ایران میں شامل کرلیا گیا ہے۔]

قدیم بلوچستان کی حدود سے متعلق مزید بحث سے گریز کرتے ہوئے ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں جو آج کے بلوچستان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں اس کی حدود، تاریخ وتہذیب، زبانوں اوران کے ادبیات کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا۔لیکن پہلے یہ معلوم کرنا مناسب ہے کہ آج جسے بلوچستان کہا جاتا ہے۔اس کی تشکیل کیسے ہوئی۔

بلوچستان کی موجودہ حدود

موجودہ صوبہ بلوچستان میں ماضی کے جوعلاقے شامل ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ا۔ وہ علاقے جو افغانستان کی دوسری لڑائی کے بعد معاہدہ گنڈمک ۱۸۷۹ء کے تحت افغانستان سے حکومتِ برطانیہ نے حاصل کیے تھے۔ان میں چمن، پشین، شوراوک، شاہرگ، دکی اور سبی شامل ہیں۔

ب۔ وہ علاقے جو خان آف قلات سے اجارہ پر لیے گئے تھے یہ نوشکی، بولان، جھٹ پٹ اور اوستہ محمد وغیرہ ہیں۔

ج۔ ایسے علاقے، جو مقامی لوگوں نے خود بہ رضا انگریزوں کے سپرد کیے۔ان میں ژوب، لورالائی، کوہلو اور دالبندین شامل ہیں۔

د۔ مری بگٹی کا قبائلی علاقہ۔

ر۔ ریاستِ قلات، اس میں تین دیگر نیم خودمختیار ریاستیں یعنی خاران، مکران اورلسبیلہ شامل ہیں۔

ریاست قلات کے علاوہ باقی ماندہ حصے کو قیام پاکستان سے قبل 'برٹش بلوچستان' کہا جاتا تھا۔[۳] یہ سارا علاقہ بعد میں ایک یونٹ کی صورت میں پاکستان کا حصہ بنا اوراسے ۱۹۷۱ء میں صوبے کی حیثیت دی گئی۔

محل وقوع اور جغرافیہ

صوبہ بلوچستان، پاکستان کے انتہائی مغرب میں واقع ہے۔اس کے شمال میں افغانستان، اور صوبہ خیبر

پختونخواہ، مغرب میں ایران، مشرق میں سندھ، پنجاب اور خیبر پختونخواہ کا ایک حصہ اور جنوب میں بحیرہ عرب واقع ہے۔ یہ خط سرطان کے شمال میں ۳۵ اور ۳۲ درجے عرض بلد اور مشرق میں ۶۱ اور ۷۰ درجے طول بلد کے درمیان پھیلا ہوا ایک وسیع عریض علاقہ ہے۔ اس کا کل رقبہ ۳۴۷،۱۸۸ مربع کلومیٹر ہے جو پاکستان کے کل رقبے کا قریباً ۴۵ فیصد بنتا ہے۔ بلوچستان کا صوبائی دارالخلافہ اور سب سے بڑا شہر کوئٹہ ہے جو صوبے کے شمال میں واقع ہے۔ صوبے کے دیگر اہم شہروں میں ژوب، سبی، قلات لورالائی، خضدار، چمن، تربت، گوادر، پنجگور اور حب شامل ہیں۔ بلوچستان پہاڑوں اور صحراؤں کی سرزمین ہے۔ اس کے وسیع پہاڑی سلسلے زیادہ تر خشک اور بنجر ہیں مگران میں کہیں کہیں خوبصورت نخلستان، سرسبز وادیاں، قدرتی چشمے اور آبشار موجود ہیں یہ مجموعی طور پر بلوچستان کے لینڈ سکیپ کو قابل دید بناتے ہیں۔ کوئٹہ، قلات، کان مہترزئی اور زیارت سرد ترین علاقے ہیں۔ جہاں سردیوں میں بعض اوقات پارہ منفی دس تک گر جاتا ہے اور شدید برفباری ہوتی ہے۔ ان کے برعکس سبی اور ڈھاڈر گرم ترین علاقے ہیں۔ جہاں گرمیوں میں بعض اوقات درجہ حرارت پینتالیس درجے سینٹی گریڈ سے بھی اوپر چلا جاتا ہے۔ ان علاقوں کی گرمی کے بارے میں کسی نامعلوم شاعر کا ایک فارسی شعر یوں مشہور ہے کہ:

سبی و ڈھاڈر ساختی
دوزخ چرا پر داختی[۴]

ترجمہ: [اے خدا جب آپ نے سبی اور ڈھاڈر جیسے گرم ترین علاقے بنا دیے تو پھر دوزخ کیوں بنائی]

بلوچستان کے طبعی خدوخال کو قدرتی طور پر درج ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ بالائی پہاڑی علاقے
۲۔ نشیبی پہاڑی علاقے
۳۔ میدانی علاقے
۴۔ صحرائی علاقے
۵۔ ساحلی علاقے

بلوچستان میں قدرتی طور پر پانچ بندرگاہیں واقع ہیں جن کے نام اورماڑہ، پسنی، جیونی، سونمیانی اور گوادر ہیں۔

تاریخی وتہذیبی پس منظر

اس سے پہلے کہ بلوچستان کے تاریخی وتہذیبی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے، بہتر ہے کہ لفظ 'بلوچستان' کی وجہ تسمیہ معلوم کر لی جائے۔

بلوچستان: وجہ تسمیہ

بلوچستان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں تاریخ کے صفحات پر جو مختلف آراء ملتی ہیں ان میں زیادہ تر ہم آہنگی اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹنیکا کے مطابق لفظ بلوچستان دو الفاظ 'بلوچ' اور 'ستان' کا مرکب ہے۔ اور اس کے معنی بلوچوں کے رہنے کی جگہ کے ہیں اس کی اصل انگریزی عبارت یوں ہے:

> The name Baluchistan is derived from the words Baluch and estan and literally means "place or abode of the Baluch people.[۵]
>
> ترجمہ: [بلوچستان کا نام دو الفاظ بلوچ اور استان سے اخذ کیا گیا ہے، اس کے معنی ہیں ''بلوچوں کے رہنے کی جگہ'']

گل خان نصیر (۱۹۱۴ء۔۱۹۸۳ء) اور خدا بخش بجارانی بلوچستان کی تاریخ پر لکھی گئی اپنی کتابوں میں اس نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں۔[۶] یہی بات سردار خان بلوچ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ''بلوچستان کا معنی بلوچوں کا ملک ہے۔ اور یہ نام اس وقت وجود میں آیا جب پندرہویں صدی کے اوائل میں بلوچوں کی ہمہ گیر ہجرت ہوئی۔''[۷]

یہ بعینہ وہی بات ہے جو پہلے انسائیکلو پیڈیا بریٹنیکا کے حوالے سے ہو چکی ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں بھی بلوچستان کو ''بلوچوں کی سرزمین'' کہا گیا ہے۔[۸] اس بارے انعام الحق کوثر (۱۹۳۰ء۔۲۰۱۴ء) بغیر کسی حوالے کے لکھتے ہیں۔ ''انسائیکلو پیڈیا کے مطابق لفظ بلوچستان نادر شاہ افشار کی اصطلاح ہے۔''[۹] یہ واضح نہیں کہ یہ بات انعام الحق کوثر نے کس انسائیکلو پیڈیا کے حوالے سے کہی ہے۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند جلد ۱۴ کے مطابق بلوچستان اس علاقے کا جدید نام ہے، جو گزشتہ دو سو سال سے رائج ہوا۔ اس میں درج ہے۔ ''یہ نام اٹھارویں صدی کی ایجاد ہے۔ اور نادر شاہ نے ملکی انتظام کے لیے

اسے تجویز کیا تھا۔ اس کے معنی ہیں بلوچوں کا ملک۔''[۱۰]

قیاس ہے کہ انعام الحق کوثر نے تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند جلد ۱۴ میں یہ تحریر ملاحظہ کی اور اپنے حافظے پر انحصار کرتے ہوئے اسے کسی انسائیکلوپیڈیا سے منسوب کر دیا۔ دستیاب شواہد کے مطابق نادر شاہ سے منسوب یہ بات پہلے پہل اے۔ ڈبلیو۔ ہیوز نے کی۔ اس کے بقول: ''بلوچستان میں زیادہ تر بلوچ قبیلہ آباد ہے جو کثیر التعداد بھی ہے اور یہ نام اسے ایرانی کشور کشا نادر شاہ نے دیا۔''[۱۱]

ہیوز کے بقول نادر شاہ نے، جو ترک تھا، عظیم ایرانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس نے افغان حملہ آوروں کو شکست دیتے ہوئے غرب سندھ کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اور اس نئے صوبے پر ایک مقامی رئیس مقرر کرتے ہوئے اسے بلوچستان کا نام دیا۔ کیونکہ یہاں بلوچوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ اس علاقے کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ قدیم تاریخوں میں اس علاقے کا نام بلوچستان نہیں ملتا۔ افغانستان کے محقق عبدالحی حبیبی نے طبقاتِ ناصری کی تعلیقات میں بلوچستان کے پرانے نام کے بارے میں مختلف عرب مورخین کے حوالے سے لکھا ہے:

> بیہقی نے باوالس، بالس، والشان کے نام سے مکران، قصدار و طوران [بلوچ علاقوں کے قدیم نام] کا ذکر کیا ہے۔ مقدسی نے بالش لکھا ہے۔ حدود العالم میں بلوش ہے۔ البیرونی نے قانون مسعودی اور میدلہ میں بالش و والشان لکھا ہے۔ یعقوبی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔[۱۲]

اس اقتباس میں ''باوالس، بالس، بالش اور بلوش'' کے الفاظ، لفظ بلوچ کے لیے ہیں جبکہ ''والشان'' کا لفظ بلوچستان کے لیے ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اس سے صوتی مماثلت بھی رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچستان کا لفظ یا ترکیب نادر شاہ افشار سے پہلے یا تو مستعمل تھی، جسے عرب تاریخ نگاروں نے اپنے تلفظ میں والشان کہا۔ یا انہوں نے بلوچ قوم کے حوالے سے اس علاقے کو والشان یعنی بلوچستان کا نام دے کر اس کی ابتدا کی۔ شاہنامہ فردوسی کے حوالے سے بلوچ قوم کی اس سرزمین پر موجودگی قدیم وقتوں سے ثابت ہے (جس کا ذکر آگے آئے گا)۔ اس لیے ہیوز کی یہ بات صحیح نہیں لگتی کہ اس علاقے کو یہ نام نادر شاہ نے دیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ نادر شاہ نے پہلے سے موجود اس نام کے خطے کو ایک باقاعدہ صوبہ قرار دیا ہو۔ یا اسے خودمختار یا نیم خودمختار علاقے کے طور پر قبول کیا ہو

جس کی بناء پر یہ نام اس سے منسوب ہوا۔لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلوچستان، جسے عربوں نے ''والشان'' کہا ایک طویل عرصے سے اس علاقے کا نام چلا آتا ہے اور اس کی وجہ تسمیہ وہی ہے جس کی طرف مختلف مورخین نے اشارہ کیا ہے یعنی بلوچوں کے رہنے کی جگہ یا ان کا وطن۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ قدیم زمانے میں بلوچستان کے کئی علاقے الگ الگ ناموں سے متعارف تھے۔سکندر کے ساتھ آنے والے یونانی مورخین نے اس کے مختلف حصوں کو اپنے نام دیے۔عرب جب آئے تو انہوں نے انہی ناموں کو اپنے لہجے میں جداگانہ شناخت دی۔سید سلیمان ندوی نے ابن حوقل کے حوالے سے بلوچستان کے کئی علاقوں کے قدیم ناموں کا تذکرہ کیا ہے۔[۱۳] بلوچستان کے مختلف قدیم ناموں میں آرکوسیا (سراوان، کچھی، اور قندھار)، ڈرنگیانا (سیستان)، گیدروشیا (جھالاوان، مکران)، کیز (کیچ) اور ڈگاسیرا (گوادر) شامل ہیں۔ان میں سے کچھ کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

بلوچستان کے چند علاقوں کے تاریخی نام

یہ کہنا مشکل ہے کہ زمانہء قدیم میں بلوچستان ایک اکائی کی شکل میں موجود تھا۔البتہ اس کے کچھ علاقے مختلف ناموں سے معروف تھے۔اس کی تفصیل یوں ہے:

کیکانان یا قیقانان

عبدالحق قدوسی کے مطابق بلوچستان کے ایک حصے کو عرب مورخین نے 'کیکانان' کے نام سے پکارا ہے۔[۱۴] بعض لوگوں کا خیال ہے کیکانان، نوشکی کے قریب خضدار اور گنداوا کے درمیان کا علاقہ ہے۔یعنی کوہ سلیمان کے سلسلے کا وہ حصہ، جو دریائے گومل سے شروع ہو کر نوشکی تک پہنچتا ہے گویا یہ ریاست قلات کے ساتھ ساتھ جھالاوان اور سراوان کی ریاستوں پر مشتمل ایک بڑا علاقہ تھا۔قلات اور اس سے ملحقہ علاقے کو 'قلاتِ سیوا' بھی کہا جاتا رہا ہے، جو یہاں کے ہندو راجاؤں سے منسوب ہے۔[۱۵]

سیوی

سبی شہر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ہندو ملکہ سیوی کا قلعہ تھا۔جو مرور زماں سے سبی ہو گیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ آج بھی اس علاقے میں بچیوں کا نام سیوی رکھا جاتا ہے۔جی لی اسٹرینج نے سبی کا ذکر سیبی اور سیوی کے طور پر کیا ہے۔اس کے علاوہ اس نے بلوچستان کے جن علاقوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک شہر اسفنجاء یا سفنجوئے

(موجودہ نام سنجاوی) اور دوسرا مستنگ یا مستنج (موجودہ نام مستونگ) کے نام شامل ہیں۔[١٦]

مکران

مکران کے قدیم ناموں کے حوالے سے کئی باتیں مشہور ہیں۔ اسے عربوں نے اسے 'ماکران' جبکہ ایرانیوں نے 'ماہی خوران' لکھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ علاقہ ایک قدیم قوم 'ماکا' کا وطن رہا ہے۔[١٧] اسی لیے مکران معروف ہوا۔ اس باب میں حقیقت جو بھی ہو لیکن یہ بہرحال اس علاقے میں قدیم عہد میں انسانی آبادی کی داستان سناتی ہے۔

توران

توران کے نام سے مشہور علاقہ بھی دراصل بلوچستان کا ایک حصہ ہے۔ جسے اب خضدار کہتے ہیں۔ اسے قصدار بھی کہا جاتا تھا تاریخ سندھ کے مصنف اعجاز الحق قدوسی (۱۹۰۵ء۔۱۹۸۶ء) کے مطابق مختلف عرب جغرافیہ دانوں کے نزدیک مکران کی شمالی سرحد قصدار سے منسلک تھی۔ قصدار ہی کا پرانا نام توران تھا اور اس کا پایہ تخت قصدار تھا۔ اس وقت یہ دراصل کیکانان (قلات) کا ایک صوبہ تھا اور کیکانان ہی کا جنوبی حصہ توران کہلاتا تھا۔[١٨]

ارمن بیلہ

یہ اپنے زمانے میں آج کے لس بیلہ کے آس پاس ایک شہر تھا۔ اعجاز الحق قدوسی کے مطابق عرب تاریخ نگاروں اور جغرافیہ نویسوں کی کتابوں میں شاید کاتبوں کی غلطی سے اسے ارمابیل، ارمن بیلہ اور ارمیل لکھا گیا ہے۔ ان کے بقول اس بارے یاقوت کا بیان کافی واضح ہے کہ یہ دیبل اور مکران کے درمیان واقع سندھ کا ایک بڑا شہر ہے۔[١٩] مقالہ نگار کے پیشِ نظر یاقوت بن عبداللہ کی کتاب معجم البلدان ہے۔ اس میں ایسے کسی شہر کا تذکرہ نہیں ملتا۔[٢٠]

قنداہیل

چچ نامہ کے مصنف مرزا قلیچ بیگ (وفات ۱۹۲۹ء) نے اسے قندھار سمجھا ہے جو بقول اعجاز الحق قدوسی کے درست نہیں ہے۔ قدوسی کی رائے میں یہ غالباً آج کے گنداوا کی جگہ پر یا اس کے آس پاس واقع تھا۔[٢١]

قنز پور

چچ نامہ ہی میں اسے کنز پور لکھا گیا ہے جو دراصل قنز پور ہی کی دوسری صورت خطی ہے۔ نبی بخش خان

بلوچ کے مطابق عرب جغرافیہ دانوں کی کتابوں میں اسے قنز بور یا قنج بور لکھا گیا ہے۔[۲۲] یہ دراصل آج کا پنجگور ہے۔ اب ایک نظر بلوچ قوم کی اصلیت اور اس کے انساب پر ڈالی جاتی ہے۔

بلوچ

لفظ اور نسل 'بلوچ' کے بارے بحث کا آغاز مستشرقین سے ہوا۔ مگر اس پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے بہتر ہے کہ لغات میں اس کے معنی دیکھ لیے جائیں۔

لفظ ''بلوچ'' کے معنی

برہان قاطع میں بلوچ کے معنی لکھے ہیں۔ مرغ کی کلغی، غیر متمدن لوگ، کم عقل مگر بہادر لوگ۔ برہانِ قاطع کی عبارت یوں ہے:

> ''قومی باشندہ صحرائی و کم عقل و شجاع و علامتی را نیز گویند کہ بر تیزی طاق وایوان نصب کند۔
> و نام ولایتی ہم ہست از ایران تاج خروس را نیز گفتہ اند و آن گوشتی باشد کہ بر سرِ او رستہ است۔''[۲۳]

لفظ 'بلوچ' کے معنی میں جو قدرِ مشترک ہے وہ بلوچ کے صحرا نشین، جنگجو اور بہادر ہونے کی ہے۔ کئی مورخین نے اس لفظ کے ماخذ تک پہنچنے میں تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ علمِ اشتقاق الفاظ سے مدد لی ہے۔ تاہم ان کے نتائج میں افتراق پایا جاتا ہے۔ لانگ ورتھ ڈیمز کے مطابق ''بلوچ کے معنی 'مرغی کی کلغی' کے ہیں کیونکہ وہ فولادی خود پہنے نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ نام ان کی پہچان بن گیا۔''[۲۴]

صاف ظاہر ہے کہ ڈیمز نے درج بالا معنی برہان قاطع سے اخذ کیے۔ سردار خان بلوچ نے مستشرقین کی لفظ ''بلوچ'' کے بارے کیے گئے مباحث کو تفصیل سے رقم کیا ہے۔ وہ ایچ۔ ڈبلیو۔ بیلیو کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ اس لفظ کا ماخذ ایک قدیم راجپوت قبیلہ یا طائفہ، بالاچیہ بتاتا ہے مگر سردار خان اس کے موقف کو مکمل رد کرتے ہیں۔[۲۵] رالنسن کہتا ہے کہ یہ لفظ بیلوس سے ماخوذ ہے۔ جو انجیل کے نمرود شاہ بابل کا لقب تھا۔ اسی بنیاد پر وہ بلوچ قبیلے کو کلدانی الاصل قرار دیتا ہے۔[۲۶]

مستشرقین کے بعد بلوچستان کے مقامی ادیبوں اور تاریخ نگاروں نے لفظ اور قوم 'بلوچ' کے ماخذ اور اس کی

اصل پر مباحث کیے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کے مطالعات مستشرقین کی آراء کے گرد ہی گھومتے نظر آتے ہیں۔ بلوچستان کے پہلے تاریخ نگار لالہ ہتو رام لفظ بلوچ کے ماخذ کی بحث چھیڑے بغیر اس کے معنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''زبانِ حلبی میں بلوچ بادیہ نشین کو کہتے ہیں۔ جو لوگ صحرا اور دامن کوہستان میں خانہ بدوش رہنے والے ہوں ان کو بلوچ کہا جاتا تھا۔'' [۲۷] گل خان نصیر اس موقف کی تائید کرتے ہیں کہ بلوچ کی وجہ تسمیہ خانہ بدوش اور بادیہ نشین کی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> یہ قوم زمانہ قدیم میں عربستان میں دجلہ وفرات کی وادیوں اور حلب کے مرغزاروں میں ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھی۔ مال مویشی پالنا اور گردونواح کے زرخیز، شاداب علاقوں، آبادیوں اور شہروں کو لوٹنا ان کا مرغوب پیشہ تھا۔ [۲۸]

لفظ بلوچ کے ماخذ کے بارے سردار خان بلوچ رقمطراز ہیں:

> The word Baluch is the compound of Sanskrit 'Bal' and 'Och',which means most powerful.[۲۹]

> ترجمہ: [لفظ بلوچ سنسکرت کے دو الفاظ بل اور اُچا کا مجموعہ ہے، جس کا معنی ہے بے حد طاقتور۔]

اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ میں لفظ بلوچ کے ماخذ کی بحث میں لکھا ہے کہ: ''لفظ بلوچ کو مختلف اقوام نے بعل، بلوچ، بلوص، بلوس، بلوش، بعلوث، بلعوث، بیلوس اور بعلوص لکھا اور پھر یوں یہ لفظ بلوچ ہو گیا۔'' [۳۰]

سردار خان بلوچ علم اشتقاق الفاظ کی رو سے بلوچ کا ماخذ بیلوس یا نمرود بیلوس کو تو قرار دیتے ہیں۔ مگر وہ ڈاکٹر بیلیو کے موقف کو سختی سے رد کرتے ہیں۔ جس میں وہ بلوچ کا ماخذ ایک قدیم راجپوت قبیلے یا طائفے بالاچیہ کو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ صوتی اور صوری حوالے سے اس لفظ کے زیادہ قریب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بلوچستان کے پشتون علاقوں یعنی ژوب اور لورائی وغیرہ میں آج بھی بلوچ کا تلفظ ''بلوس'' کیا جاتا ہے۔ [۳۱]

بلوچستان کے قبائل:

بلوچستان میں بنیادی طور پر تین بڑے قبائل بلوچ، براہوی اور پٹھان رہتے ہیں۔ براہوی کو، جو اسی نام سے اپنی ایک الگ زبان بھی بولتے ہیں، بالعموم بلوچ میں شامل ایک طائفہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر پٹھان اپنی جداگانہ

شناخت رکھتے ہیں۔ان تینوں قبائل کا الگ الگ مختصر احوال ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

بلوچ بہ طور قبیلہ:

جس طرح لفظ بلوچ کے ماخذ کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح بلوچ قوم کے بارے بھی مختلف اور متضاد حکایات و روایات ملتی ہیں۔کوئی انہیں سامی النسل اور عرب قرار دیتا ہے تو کوئی کلدانی، اور کسی کے نزدیک یہ آریہ قبائل میں سے ہیں۔غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ان میں سے کچھ آراء کا جائزہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔میر علی شیر قانع اپنی کتاب تحفتہ الکرام میں بلوچ قوم کی اصلیت کی بابت لکھتے ہیں:''جت اور بلوچ محمد بن ہارون مکرانی کی اولاد ہیں، جو کہ مکران کا گورنر تھا، وہ سندھ پر فوج کشی کے وقت محمد بن قاسم کے ساتھ ارمن بیلہ (لسبیلہ) تک آیا تھا۔''[۳۲]

علی شیر قانع، محمد بن ہارون کا سلسلہء نسب آنحضرتﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ سے ملاتا ہے۔جبکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حضرت حمزہؓ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ بظاہر اس دعوے کی بنیاد بہ ظاہر وہ بلوچی گیت اور نظمیں ہیں جو ایک طویل زمانے سے سندھ و بلوچستان میں عام ہیں۔ بلوچستان کے لوک ادب اور شاعری میں بلوچوں کی آمد عرب سے بتائی جاتی ہے اور ان کے حضرت حمزہؓ کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔یہ سب روایتیں صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلتی آئی ہیں اور ان کی حقانیت پر اعتماد کرنا ایک دشوار امر ہے۔

بلوچ کی اصلیت کے بارے بحث کرتے ہوئے ہنری پوٹنگر نے اسے عرب کی بجائے ترکمان الاصل قبیلہ بتایا ہے جو قدیم زمانے میں جنوبی ایشیاء میں آباد ہوئے۔[۳۳] لانگ ورتھ ڈیمز کے بقول بلوچ ایرانی النسل ہیں۔[۳۴] سردار خان بلوچ اور خدا بخش بجارانی کے مطابق بلوچ کلدانی یعنی سامی النسل ہیں۔[۳۵] اس ضمن میں محمد اسماعیل دشتی البلوشی کہتے ہیں کہ بلوچ عرب النسل ہیں اور ان کا بنیادی تعلق یمن کی سے تھا۔[۳۶] نور احمد فریدی بھی بلوچ کے عرب النسل ہونے کے موقف کی تائید کرتے ہوئے ان کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ کے فرزند حضرت اسماعیلؑ سے جوڑتے ہیں۔[۳۷] جبکہ بیلیو کے نزدیک بلوچ نسلاً راجپوت ہیں[۳۸] ہتورام کے بقول:

> یہ لفظ کسی خاص قوم سے وابستہ نہیں بلکہ مختلف قوموں پر اس کا اطلاق ہوتا رہا۔ بلوچستان میں کئی قبیلے ایسے ہیں جن کا نسب نامہ ایک دوسرے سے الگ ہے مگر وہ سب بلوچ کہلاتے ہیں۔[۳۹]

شاہ محمد مری (پ ۱۹۵۴ء) بھی بلوچ کو ایک مخلوط قبیلہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''بلوچوں کی اکثریت کی بنیادی ساخت آریا کی ہے۔اس کے علاوہ ہم سے کچھ عرب سے بھی آئے اور بلوچستان کی خالصتاً قدیم آبادی نے بھی بلوچ کو تشکیل دیا ہے۔''[۴۰]

یہ واضح نہیں کہ 'خالصتاً قدیم آبادی' سے ان کی مراد کیا ہے۔آیا یہ بات براہویوں کے حوالے سے کی گئی ہے جسے دراوڑی قوم کی باقیات قرار دیا جاتا ہے یا پھر ان کا اشارہ میدیوں کی طرف ہے جو ساحل مکران پر آباد ہیں اور دیگر بلوچ قبائل سے جداگانہ نقش و نگار رکھتے ہیں۔انہیں افریقی قبائل سے ماخوذ بتایا جاتا ہے۔مید کا شمار اس علاقے کی قدیم آبادی میں ہوتا ہے۔

براہوی:

براہوی، بلوچ میں شامل ایک قدیم طائفہ ہے۔یہ براہوی زبان بولتے ہیں۔اس زبان کو دراوڑی زبانوں کے گروہ سے بتایا جاتا ہے۔اور اسی وجہ سے براہویوں کے بارے میں یہ عام رائے پائی جاتی ہے کہ وہ برصغیر کے قدیم ترین دراوڑ قبائل کی باقیات ہیں۔ان کی زبان قدیم زندہ زبانوں میں سے ایک ہے۔میسن براہوی کو دراوڑ قرار دینے کی بات رد کرتے ہوئے انھیں بلوچ قوم ہی کی ایک شاخ تصور کیا جاتا ہے۔اس کے مطابق ''بلوچ تین طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں یعنی براہوی، رند اور لمری (یا نمری)۔''[۴۱] وہ لفظ براہوی کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ لفظ با۔روہ۔ای کا بگاڑ ہے جس کے معنی ہیں کوہ و دشت کا۔یہ لوگ مغرب سے بلوچستان میں داخل ہوئے۔براہوی ایک مختلف نسل و زبان کے لوگ ہیں وہ خود کو براہوی اور ٹھیٹ بلوچوں کو ناہروئی پکارتے ہیں۔ناہروئی کا مطلب ہے غیر کوہستانی یعنی میدانی۔

براہوی اگرچہ تاریخی اور نسلی لحاظ سے ایک الگ اور جدا قبیلہ ہے مگر اب یہ بلوچ کہلاتا ہے۔[۴۲] گل خان نصیر براہوی کو بلوچ کا ایک طائفہ قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ بلوچ تین طائفوں میں بلوچستان آئے تھے۔براہوی بلوچوں کا طائفہ اول ہیں جو بلوچ کی عام ہجرت سے کئی صدیاں پیشتر ایرانی بادشاہوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر نقل مکانی پر مجبور ہوئے اور یہاں وارد ہوئے۔گل خان کے مطابق: ''یہ لوگ کوہِ البرز کے رہنے والے تھے۔اسی نسبت سے مقامی لوگ انہیں 'برز کوہی' کہنے لگے جو بعد میں موجودہ صورت یعنی 'بروہی' اختیار کر گیا۔''[۴۳]

تاریخی طور پر ریاست قلات کی عملداری ہمیشہ براہویوں کے پاس رہی ہے۔میر چاکر خان رند کے عہد میں

رند قبائل نے براہویوں کو شکست دے کر کچھ عرصے کے لیے اس پر قبضہ کیا تھا مگر پھر براہویوں نے رندوں سے دوبارہ قلات کی حکومت بزور طاقت چھین لی تھی۔ اس وقت سے قیام پاکستان تک قلات پر براہویوں کی احمد زئی شاخ کی حکومت رہی ہے۔ خان آف قلات اسی قبیلے کا ہوتا ہے۔ چند اہم براہوی قبائل میں زہری، بنگلزئی، مینگل اور رئیسانی شامل ہیں۔ براہوی اب زیادہ تر اپنی الگ شناخت ختم کر کے بلوچ ہی کہلاتے ہیں۔ ان کا یہ انضمام جدید قومی شعور اور بلوچ قوم پرست تحریکوں کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ جن مقامی مورخین نے براہوی کو بلوچ قرار دیا ہے وہ سب سرگرم قوم پرست سیاسی کارکن تھے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ براہوی کو 'بلوچیانے' میں نسل اور زبان کی بجائے معروضی زمینی حقائق اور سیاسی بندوبست نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

بلوچ نسل کے اصل اور اس کے ماخذ پر سامنے آنے والی تحریروں کے تجزیاتی مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مورخین کی اکثریت انہیں ایک اعلیٰ اور برتر نسل قرار دیتی ہے۔ اس میں مقامی مورخین کا حصہ زیادہ ہے۔ جو بلوچ کا شجرہ دنیا کی مختلف اعلیٰ اور برتر اقوام وملل سے جوڑتے نظر آتے ہیں۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں کا زیادہ زور اسی پہلو پر رہا۔ ہر مورخ اور محقق نے اس حوالے سے اپنی الگ اور منفرد رائے قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے اور کسی ایک رائے کو باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچ قوم کو مختلف نسلوں اور قبیلوں نے تشکیل دیا ہے۔ مثلاً مکران کے لوگ جو رنگ و نسل کے اعتبار سے افریقی خدوخال کے حامل ہیں اور مید کہلاتے ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ جاموٹ، جدگال اور کرد (ترکی کا ایک ممتاز قبیلہ) بھی بلوچ قوم کا حصہ ہیں، جبکہ گچکی اور لانگو بھی جو اصلاً راجپوت تھے، اب بلوچ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح بگٹی اور مری جیسے اہم بلوچ قبائل میں ہندی نژاد مرہٹہ کے نام سے الگ الگ دو ذیلی قبیلے موجود ہیں جو ہندی اثرات کی علامت ہیں۔ ان کے علاوہ ریاست قلات کے دو بااثر قبیلے یعنی رئیسانی اور زرک زئی اصل میں افغان سمجھے جاتے ہیں، جبکہ بعض لوگ تو احمد زئی (قلات کا حکمران قبیلہ) کے بارے میں بھی یہی خیال ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایسے قبیلے ہیں جن کی اصل کچھ اور ہے مگر وہ بلوچ میں ضم ہو کر اب بلوچ کہلاتے ہیں۔ اس طرح مختلف النوع قبائل کے اشتراک سے بلوچ قوم کی تشکیل کے حوالے سے حمید بلوچ لکھتے ہیں:

> بلوچ قوم کے اجزائے ترکیبی میں وہ تمام نسلی گروہ شامل ہیں جو بلوچستان میں تاریخ کے مختلف ادوار میں آ کر اس خطے میں بود وباش اختیار کر گئے تھے۔ یہ تمام نسلیں تاریخی

اور معاشی اشتراک سے ایک مشترکہ قوم کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے اور بلوچ کہلائے۔[۴۴]

حمید بلوچ کی رائے نہایت صائب ہے۔انہوں نے بلوچ قوم کی تعریف کے حوالے سے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک قبیلے کے طور پر بلوچ کی موجودگی زمانہ قدیم سے ثابت ہے۔مثلاً شاہنامہ فردوسی میں ان کا ذکر ایرانی بادشاہ کیخسرو کے ایک دستے کے طور پر ملتا ہے۔فردوسی ان کی بہادری کے بارے میں لکھتا ہے۔

سپاہش زگردانِ کوچ و بلوچ
سگالیدہ جنگند، مانند غوچ
کسے در جہان پشت ایشان ندید
زآہن یک انگشت نامد پدید
سپہ دارِ شاں آشکس تیز ہش
کہ بارائے دل بود ومغز وہوش
در فشِ بیاودوہ پیکر پلنگ
ہمی از درفش بیا رند چنگ[۴۵]

ترجمہ:اس کا لشکر کوچ اور بلوچ پر مشتمل تھا،وہ جنگجو تھے اور سروں پر تاج سجاتے تھے۔کسی نے دنیا میں ان کی پشت نہیں دیکھی،نہ ان کی ایک انگلی تک ننگی دیکھی [یعنی ہر وقت جنگی لباس میں ملبوس رہتے]۔ان کا سپہ سالار ایک بہادر آشکس تھا،جو صاحب دل،ذہین اور عقلمند تھا۔چیتوں کی طرح یہ بہادر پرچم اٹھائے ہوئے تھے اور ان پرچموں سے جنگ ٹپکتی تھی۔

اکثر بلوچ مورخین،بلوچ قوم کی قدامت اور اس کے ایک با اثر قبیلے کی حیثیت سے اس کی موجودگی کے بارے اس شعر کو بہ طور ثبوت پیش کرتے ہیں۔شاید بلوچ کے ایرانی النسل ہونے کی بات بھی شاہنامہ فردوسی میں ان کے تذکرے کی بابت کی گئی ہے۔درج بالا اشعار میں 'کوچ و بلوچ' سے یہ سمجھا گیا ہے کہ ان دونوں الفاظ سے بلوچ مراد ہیں۔[۴۶] اس مقالہ نگار کی رائے میں یہ خیال سو فیصدی درست نہیں۔یہ امکان ہے کہ کوچ و بلوچ دو

الگ الگ قبائل کے بارے کہا گیا ہو۔ ہوسکتا ہے اس سے بلوچ و براہوی کی تفریق ظاہر کی گئی ہو، جو اُس زمانے میں زیادہ واضح ہو۔ ایک اور پہلو یہ ہے کہ 'کوچ' سے پٹھان یا پشتون مراد ہوسکتے ہیں، جو افغانستان اور بلوچستان کے شمالی علاقوں میں صدیوں سے آباد ایک قوم کے طور پر متعارف ہیں۔ شمالی بلوچستان میں واقع پہاڑ تختِ سلیمان کے دامن سے یہ روایت بھی منسوب ہے کہ پٹھانوں کے جدِ امجد کا تعلق اسی علاقے ژوب سے تھا۔ یہیں سے اس قوم نے مختلف قبائل کی صورت میں دوسرے علاقوں کی طرف مراجعت کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ژوب اور اس کے مضافات میں خانہ بدوش پٹھانوں کو آج بھی عرفِ عام میں کوچی (یعنی کوچ کرنے والا، خانہ بدوش) کہا جاتا ہے۔ پشتو لوک گیتوں اور شاعری میں یہ لفظ آج بھی انہی معنوں میں مستعمل ہے۔ پس یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ فردوسی نے جب کوچ و بلوچ کہا تو اس سے اس کی مراد پٹھان اور بلوچ ہر دو قبائل سے ہو۔

پٹھان:

عام طور پر پٹھان یا پشتون کو افغانستان سے متعلق سمجھا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے مگر جیسا کہ قبل ازیں بتایا جا چکا ہے۔ شمالی بلوچستان میں کچھ ایسے علاقے ہیں جو پہلے افغانستان کا حصہ تھے۔ انگریزوں نے ان کو افغانستان سے الگ کر کے اپنی حکومت میں شامل کیا تھا اور انھیں 'برٹش بلوچستان' کا نام دیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے یہ علاقے صوبہ بلوچستان میں شامل ہیں۔ بلوچستان کے تاریخی مطالعے کے تناظر میں ان پٹھان علاقوں اور قبائل کا ذکر ناگزیر ہے۔ لہٰذا ان کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

بعض مورخین نے پٹھانوں کو بنی اسرائیل کی نسل بتایا ہے۔ ان کے خیال میں بنی اسرائیل کے بادشاہ ملک طالوت پٹھانوں کے جدِ امجد ہیں۔[۴۷] پریشان خٹک نے مختلف مورخین کی جو آراء دی ہیں۔ ان میں اس قبیلے کو یونانی، ترک، ایرانی اور مخلوط النسل قرار دیا گیا ہے۔[۴۸] مگر وہ خود اس حوالے سے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ کچھ مورخین کے نزدیک پٹھان ایک آریا الاصل قبیلہ ہے۔ مثلاً سلطان محمد صابر کے بقول ''پشتونوں کی اصل و نسل ان آریائی قبائل پر مشتمل ہے۔ جنہیں سیتی، سیتھین یا اسکائی کہا جاتا ہے۔''[۴۹]

سلطان محمد صابر کے خیال میں بلوچستان کے شہر چمن میں آباد قبیلہ اچکزئی دراصل اسکائی ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے، بہ الفاظ دیگر یہ قبیلہ سیتی قبائل کی ایک شاخ ہے۔ یعنی صابر کہنا چاہتے ہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اشکانی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی طرح ایک اور قبیلے 'بڑیچ' کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ عراق کی وادی

’بریسا‘ کے رہنے والے ہیں۔ جو بخت نصر کے زمانے میں وادی ہلمند اور سیستان کی طرف آئے۔ سلطان محمد صابر بلوچستان کے بعض علاقوں کے ناموں کو اسی ہجرت کی یادگار قرار دیتے ہیں۔ مثلاً کوئٹہ کا تفریحی مقام ہنہ اوڑک اور کووان وشرغلہ وغیرہ۔[۵۰] یہاں یہ ذکر غیر محل نہ ہوگا کہ ہندوستان میں معروف پٹھان قبیلہ ’روہیلہ‘ دراصل کوئٹہ کے بڑیچ قبیلے کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ گویا ہندوستان میں ریاست ’روہیل کھنڈ‘ کی بنیاد رکھنے والے لوگ دراصل بلوچستان سے گئے تھے۔

پشتو کی ایک مقامی روایت کے مطابق، جس کی حقانیت غیر واضح ہے، پٹھان یا پشتون ایک بزرگ شخصیت قیس عبدالرشید کی اولاد ہیں، جنھوں نے عہدِ نبوی ﷺ میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ جس کے بعد وہ واپس اپنے علاقے کوہ سلیمان کے دامن میں لوٹ آئے تھے۔ انہی قیس عبدالرشید کی اولاد پھلتے پھولتے موجودہ پٹھان قبائل کی صورت اختیار کر گئی۔ قیس عبدالرشید کا قیام تختِ سلیمان کے دامن میں تھا۔ مقامی زبان میں اس پہاڑ کو قیسا غر یا شن غر کہتے ہیں۔ اس پہاڑ کی بلند ترین عمودی چٹان پر تختِ سلیمان ایک بڑے پتھر کی صورت میں پیوست ہے۔ مقامی روایات میں اسے حضرت سلیمانؑ سے منسوب تخت بتایا جاتا ہے اور لوگ اس کی زیارت کے لیے دشوار گزار سفر کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ژوب کا علاقہ حضرت سلیمانؑ کی جیل تھا جہاں وہ نافرمان جنات کو قید کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب روایات ہیں مگر ان سے اس علاقے کی تاریخی اہمیت ضرور اجاگر ہوتی ہے۔

شمالی بلوچستان کے چند اہم پٹھان قبیلوں میں اچکزئی، بابڑ، ترین، شیرانی، کاکڑ، مندوخیل اور موسیٰ خیل وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب میں کاکڑ قبیلہ سب سے بڑا اور اثر ونفوذ کا حامل ہے۔ پٹھانوں کا نواب اسی قبیلے کی ایک شاخ جوگیزئی سے تعلق رکھتا ہے۔ کاکڑ قبیلے کی حدود ژوب سے کوئٹہ تک قریباً تین سو کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہیں۔ دوسرا بڑا قبیلہ شیرانی کا ہے۔ اس کی حدود ژوب سے خیبر پختونخواہ کے شہر ڈیرہ اسماعیل خان تک ہیں۔ اردو کے اولین محقق ،نقاد اور ماہرِ لسانیات حافظ محمود خان شیرانی اور ان کے بیٹے شاعرِ رومان اختر شیرانی، اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ مظہر محمود خان شیرانی نے حافظ محمود خاں شیرانی کی علمی و ادبی خدمات پر لکھے گئے اپنے تحقیقی مقالے میں شیرانی قبیلے کو ژوب کے کوہِ سلیمان ہی میں آباد بتایا ہے۔[۵۱] اور یہ حقیقت بھی ہے بلکہ اب شیرانی قبیلے کے علاقے کو ژوب سے جدا کر ضلع شیرانی کی حیثیت دی گئی ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ تاریخِ اردو ادب کی یہ دونوں معروف

شخصیات دراصل ''فرزندانِ بلوچستان'' ہیں۔

بلوچستان کا تہذیبی پس منظر:

علم آثار قدیمہ اور حضریات کی تحقیق کی بناء پر کسی بھی علاقے کی زمانہء ماقبل کی تاریخ کی گرہ کشائی ایک حقیقت بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم قدیم مصر کے بارے میں کافی سے زیادہ اور باوثوق معلومات رکھتے ہیں۔ ایران، چین اور عراق کے علاوہ پاک وہند میں بھی مختلف جگہوں کی کھدائی سے بیتے زمانوں کے شہروں، تہذیبوں، اوراس عہد کے انسانوں کے بارے میں اہم معلومات ملی ہیں۔ کئی جگہ تو پورے پورے شہر دریافت ہوئے ہیں جیسے ہڑپہ اور ٹیکسلا وغیرہ۔ بلوچستان بھی آثار قدیمہ اور حضریاتی تحقیق کے حوالے سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا کے باقی علاقوں میں اس حوالے سے جس قدر تحقیق ہوئی ہے۔ اس کا عشرعشیر بھی یہاں نہ ہوسکا جس کی کئی وجوہات ہیں۔ بلوچستان میں اب تک جس قدر انکشافات واکتشافات ہوئے ہیں۔ وہ خاصے چونکا دینے والے ہیں اوراس سرزمین پر ماضی کے انسان کے ابتدائی تمدن کی داستان سناتے ہیں جسے عام طور پر ایک پسماندہ علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ بلوچستان میں آثارِ قدیمہ کا دائرہ کافی وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔ مغربی اور یورپی ماہرین آثارِ قدیمہ قیام پاکستان سے قبل اس طرف متوجہ ہو چکے تھے اور پاکستان بننے کے بعد بھی یہ تحقیقاتی سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ جن مختلف ماہرین نے یہاں آثار قدیمہ کی باقیات کی تلاش وجستجو کی اوران پر مضامین لکھے ان میں سر آریول اسٹائن، ایچ ہارگریوز، ای جے راس، پروفیسر سٹیورٹ پیگٹ، ڈکٹر ویلر، ڈاکٹر ہنری فیلڈ، موسوزین میری کاسل اور مس بیٹرائس ڈی کارڈی جیسے معروف ماہرین شامل ہیں۔ ان ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیقات کی بدولت بلوچستان کے مختلف علاقوں میں جو تہذیبی آثار دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں درج ذیل ثقافتوں کے نشانات ملے۔

۱۔ ژوب، کوئٹہ، سوراب، کلی اور نال کی ثقافتیں جن کا زمانہ تین تا چار ہزار سال ق م کا ہے۔ ماہرین کے مطابق ان پر کوٹ ڈیجی (سندھ) کی ثقافت کے اثرات نظر آتے ہیں۔

۲۔ پانچ ہزار سال ق م میں پائی جانے والی کیچ (مکران) کی ثقافت، جس کے رابطے ایران اور خلیجی ممالک سے قائم تھے۔

۳۔ بولان میں دریافت ہونے والی مہر گڑھ کی تہذیب، جس کا زمانہ ایک اندازے کے مطابق ۸ سے نو ہزار سال ق م کا ہے۔

وادی ژوب اور کلی گل محمد کی ثقافتوں کا زمانہ ۳۰۰۰ سے ۴۰۰۰ ق م کا ہے۔ان کے علاوہ بھی کئی علاقوں مثلاً لورالائی، سوراب، خاران، گنداوا، وڈھ اور وسطی مکران میں کئی جگہوں پر حضری آثار ملے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی بستیاں ہی آگے چل کر ہڑپہ اور موہنجوڈارو جیسے شہروں کی تشکیل کا باعث بنے تھے۔اس کے علاوہ جھالاوان اور پنجگور کے علاقے میں پانی کے بڑے بڑے مصنوعی بند بھی ملے ہیں، جنہیں گبر بند کہا جاتا ہے۔ ماہرین کا قیاس ہے کہ یہ بند نہ صرف اس علاقہ میں بارشوں کی زیادتی کی علامت ہیں، بلکہ یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ماضی میں یہاں کثیر آبادی رہائش پذیر تھی۔اس کے علاوہ بلوچستان کو مختلف تہذیبوں کا سنگم بھی کہا جاتا ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب کا پاکستان کے مغربی مما لک کی تہذیبوں سے رابطہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔قدیم زمانے میں ایرانی، وسط ایشیائی، سمیری اور بابلی تہذیبوں کے مابین ثقافتی رشتے کسی نہ کسی سطح پر ضرور قائم رہے ہیں۔سمیری اور بابلی تہذیبوں کے مابین ایک اہم کڑی کے طور پر اس علاقہ کی افادیت اجاگر کرتے ہوئے محمد ادریس صدیقی لکھتے ہیں:

> بلوچستان ان دونوں تہذیبوں کے علاقوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے کم وبیش ایک سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہاں خاصا کام کیا گیا ہے۔ شمالی اور جنوبی بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں سر آریول اسٹائن اور ھارگریوز نے بڑی محنت اور جانفشانی سے باقیاتی تفتیش کی ہے۔[۵۲]

عہدِ قدیم سے مغربی حملہ آور بلوچستان کے راستے گزرتے رہے ہیں۔شاید اس لیے یہ خیال پیدا ہوا کہ آریا اسی راستے ہندوستان وارد ہوئے تھے۔ بلوچستان میں مہر گڑھ کے مقام پر سندھ کی تہذیب سے بھی زیادہ قدیم تمدن کے آثار ملے ہیں۔ دوسری طرف ابن حنیف عراق کی قدیم سومیری قوم کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ شاید سومیری قوم بلوچستان سے نقل مکانی کر کے عراق پہنچی ہو اور اپنے ساتھ مختلف رواج اور تہذیبی عناصر عراق لے گئی ہو۔[۵۳]

مہر گڑھ تہذیب:

کوئٹہ سبی روڈ پر ڈھاڈر سے قریباً چار میل کے فاصلے پر مغرب میں مہر گڑھ واقع ہے۔ جہاں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں فرانسیسی ماہرین آثار قدیمہ نے کھدائی کا کام شروع کیا جو ۲۰۰۱ء تک جاری رہا۔ان ماہرین نے یہاں مدفون ایشیا کی قدیم تہذیب دریافت کی اور اسے مہر گڑھ کی نسبت سے مہر گڑھ تہذیب کا نام دیا۔[۵۴]

ان ماہرین کی تحقیقات کے مطابق مہرگڑھ تہذیب کئی مرحلوں پر مشتمل ہے۔اس کا پہلا اور قدیم ترین دور نو ہزار سال ق م کا ہے۔دوسرا دور سات ہزار سال ق م کا ہے۔ماہرین کے مطابق اس زمانے کا انسان برتنوں کے استعمال سے واقف نہ تھا مگر اس نے ٹوکری بنانے کی ابتدا کر لی تھی۔اس ٹوکری کو پختہ کرنے کے لیے اس پر تارکول کا لیپ دیا جاتا جس کی اس علاقے میں کمی نہ تھی،آج بھی یہ اس علاقے میں وافر پایا جاتا ہے۔مہرگڑھ میں چار ہزار سال ق م کے زمانے میں تانبے کا استعمال اور زراعت کا فروغ نظر آتا ہے۔مختلف فصلیں اگائی جاتی تھیں اور بھیڑ بکری گائے وغیرہ پالے جاتے تھے۔سعید بلوچ نے یہاں پانچ ادوار کا ذکر کیا ہے۔[۵۵] مہرگڑھ پر ہونے والی تحقیقات کا سلسلہ فی الوقت رکا ہوا ہے۔جب کبھی یہ تحقیقات دوبارہ شروع ہوں گی اور ان پر حضریاتی تحقیق مکمل ہو گی۔اس وقت مہرگڑھ تہذیب کے بارے میں حتمی مطالعات سامنے آسکیں گے۔

بلوچستان میں تاریخ کے دو اہم سفر:

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ ماضی میں مغربی اور وسطی ایشیا سے بلوچستان کے ثقافتی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں۔زمانہءقدیم میں بھی یہ خطہ تجارتی،تمدنی،دفاعی اور سیاسی حوالوں سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔دوسرے علاقوں سے منسلک اس خطے کے چار اہم راستے ہیں۔پہلا راستہ درہ بولان کا ہے جو کولپور سے رندلی تک پھیلا ہوا ہے،دوسرا درہ مولا کا راستہ ہے یہ دریائے مولا کے دہانے سے انجیرہ کے قریب شروع ہوتا ہے۔تیسرا لسبیلہ اور مکران کا بری راستہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ ہے،اور چوتھا بحری راستہ ہے۔ان راستوں پر تاریخ کے مختلف ادوار میں کئی قبیلوں ،قوموں اور فوجی لشکروں کی آمدورفت ہوتی رہی ہے۔ان میں دو سفر نہایت اہم ہیں جنہوں نے تاریخ کے صفحات پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ایک سفر سکندر اعظم کا ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف تھا۔دوسرا سفر محمد بن قاسم نے مغرب سے مشرق کی سمت کیا تھا۔جب اس نے سندھ فتح کیا تھا اور پھر اسلام ہندوستان بھر میں پھیل گیا۔کامل القادری نے ان دونوں سفروں کی تفصیل اپنی کتاب قدیم بلوچستان میں نہایت وضاحت سے دی ہے۔مصنف نے اس کتاب کی تسوید کے لیے خود ان علاقوں کا دورہ کیا اور اس بارے میں سیر حاصل معلومات فراہم کی ہیں۔ان کی قلمی کاوش کو سید سلیمان ندوی،مولوی محمد شفیع اور غلام رسول مہر جیسے محققین نے بہ نظرِ تحسین دیکھا ہے۔[۵۶]

بلوچستان باب الاسلام:

عام طور پر مشہور ہے کہ سندھ کو پہلے پہل محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا اور پھر یہاں سے اسلام ہندوستان بھر

میں پھیلا۔اسی وجہ سے سندھ کو'باب الاسلام' بھی کہتے ہیں۔ بلوچستان کے بعض مورخین اس نظریے کو تاریخی حقائق کی بنیاد پر جھٹلاتے ہیں۔ان میں کامل القادری، انور رومان، انعام الحق کوثر اور عبدالرحمن براہوی شامل ہیں۔ باقی لوگوں نے تو اس موضوع پر مضامین لکھے ہیں جبکہ عبدالرحمن براہوی نے اپنی کتاب بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور ان کی حکومتیں میں متعدد تاریخی کتب سے استفادہ کرتے ہوئے بلوچستان میں عربوں کی اولین پیشقدمی اور فتوحات کا احوال تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ محمد بن قاسم سے کافی عرصہ قبل بلوچستان اور اس کے مختلف علاقوں کو عرب افواج نے حضرت عمرؓ کے عہد میں ہی فتح کر لیا تھا۔ [۵۷] اس وقت یہاں اسلام پہنچ گیا تھا جو بعد میں ملحقہ علاقوں تک پھیل گیا۔اس لیے بلوچستان کے محققین بلوچستان کو ہی 'باب الاسلام' کہتے ہیں۔

سی پیک میں گوادر کی اہمیت

بلوچستان کی ساحلی پٹی ۷۷۸ کلومیٹر طویل ہے یہ پاکستان کے ساحل کے قریباً ۸۰ فیصد حصے پر مشتمل ہے۔ اس طویل ساحلی پٹی پر گوادر کے علاوہ حب، گڈانی، کلمت، اور ماڑہ، پسنی اور جیونی جیسی کئی چھوٹی بڑی بندرگاہیں ہیں۔ گوادر کئی خصوصیات کی بناء پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ گوادر پورٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قدرتی طور پر گہرے پانی (Deep Sea) کی بندرگاہ ہے۔ عام طور پر بندرگاہ کی سمندر میں گہرائی نو یا دس میٹر تک ہوتی ہے جبکہ گوادر سترہ، اٹھارہ میٹر تک گہرائی رکھتا ہے۔ دوسری بندرگاہوں میں سمندر میں ہتھوڑے کے سرے (Hammer Head) جیسی جگہ مصنوعی طریقے سی بنانی پڑتی ہے تاکہ سمندری پانی کا کٹاؤ روکا جا سکے جبکہ گوادر میں یہ ہیمر ہیڈ بھی قدرتی طور پر بنا ہوا ہے۔ گوادر کی تیسری بڑی خصوصیت اس کا تزویراتی محل وقوع ہے۔ یہ خلیج اومان اور خلیج فارس کی تمام بندرگاہوں کے سرے پر واقع ہے۔اس طرح عسکری اور معاشی حوالے سے دیدبان کے کام بھی آ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بعض طاقتور ملک اس منصوبے کے خلاف ہیں۔ وہ اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں اور اس کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ سی پیک کی مخالفت کی ایک وجہ دنیا بھر میں چین کے بڑھتے ہوئے اقتصادی اور سیاسی اثر ونفوذ کو روکنا بھی ہے۔ سی پیک کی پوری اہمیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چین کے اس وژن کو سمجھا جائے جس کے بل پر وہ مستقبل میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھر سکتا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے چینی ماہرین نے مختلف عظیم الشان منصوبے بنائے ہیں۔ان تمام منصوبوں کے بارے میں تفصیلی گفتگو یہاں

ممکن نہیں۔لہٰذا صرف سی پیک اوراس کے تناظر میں بلوچستان کی اہمیت بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سی پیک (China Pakistan Economic Corridore) دراصل چین کے عظیم اقتصادی منصوبے''اوبار''(One Belt One Road) کا بنیادی جزو ہے۔''اوبار'' کوٹریلین ڈالر کا منصوبہ بتایا جاتا ہے جس میں دنیا بھر کے کم وبیش ساٹھ ممالک شامل ہوں گے۔چین آنے والی صدیوں میں دنیا بھر سے جو تجارت کرے گا اس میں جنوب مغربی ایشیاء اور جنوب مشرقی یورپ کے لیے گوادر کی بدولت ہزاروں میل فاصلہ کم ہو جائے گا۔اس سے نہ صرف وقت کی بچت ہوگی بلکہ سفری لاگت میں نمایاں کمی ہوگی۔اس کے ساتھ ساتھ گوادر کے ذریعے ایک جانب خلیج فارس سے عرب دنیا اور دوسری جانب افریقی ممالک تک بھی چین کی رسائی آسان ہو جائے گی۔گوادر پورٹ سے اگرچہ حقیقی فوائد چین کو حاصل ہوں گے اسی وجہ سے وہ یہاں بڑی سرمایہ کاری کر رہا ہے تاہم پاکستان بھی ان معاشی سرگرمیوں سے فائدہ اٹھا کر مستقبل قریب میں اپنی معیشت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرسکتا ہے۔

بلوچستان کا لسانی وادبی پس منظر:

بلوچستان میں صدیوں سے بیک وقت کئی زبانیں یعنی براہوی، بلوچی، پشتو اور فارسی نہ صرف بولی جاتی ہیں۔ بلکہ ان میں تخلیق شدہ ادب کی ایک طویل روایت موجود ہے۔ یہاں ان زبانوں اوران کے ادبیات کا الگ الگ مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔تاکہ بلوچستان کے لسانی اورادبی پس منظر سے کسی حد تک آگاہی ہو سکے۔

براہوی زبان وادب:

براہوی، دراصل براہویوں کی زبان ہے،مگر بلوچستان کے بعض غیر براہوی قبیلے بھی یہ زبان بولتے ہیں۔ یہ بلوچستان میں قلات اوراس کے ملحقہ علاقوں جھالاوان اور سراوان میں بولی جاتی ہے۔اس کے علاوہ نوشکی، خاران، نوکنڈی اور دالبندین میں بھی یہ مستعمل ہے۔اسی بنا پر اس کے تین لہجے قرار دیے گئے ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

ا	سراوانی لہجہ:	یہ کوئٹہ، قلات، مستونگ، دشت، سبی اور نصیر آباد کے علاقوں میں رائج ہے۔اسے براہوی کا ادبی وعلمی لہجہ قرار دیا گیا ہے۔

ب	جھالاوانی لہجہ:	یہ خضدار، نال اور وڈھ کے علاقوں میں بولا جاتا ہے۔

ج	رخشانی لہجہ:	یہ نوشکی، چاغی، نوکنڈی، خاران اور دالبندین وغیرہ میں مستعمل ہے۔

براہوی زبان کی خاص انفرادیت اس کا ایک مخصوص حرف اور مشکل صوتیہ ل ہے۔ وہ لوگ جن کی مادری زبان براہوی نہ ہو اس کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکتے۔ یہ صوتیہ کسی لفظ کی ابتداء میں نہیں آتا بلکہ صرف آخر یا درمیان میں آتا ہے۔ اس سے بنے ہوئے چند الفاظ یوں ہیں:

لفظ	معانی
تیل	بچھو
خل	درد
سیل	موسم سرما
پال	دودھ

براہوی رسم الخط کی قدیم ترین مثال افغانستان سے ملنے والے کوہستانی خاندان کے قدیم سلوں پر درج جملوں کو سمجھا جاتا ہے۔ گل خان نصیر نے اس رسم الخط کی بنیاد پر ہی براہوی کو دراوڑی کی بجائے کوشانی یا ایرانی زبان قرار دینے پر طویل بحث کی ہے۔ [۵۸] جبکہ دوسری طرف براہوی اعداد میں سے صرف پہلے تین اعداد ۱، ۲ اور ۳ کے لیے براہوی الفاظ بالترتیب اسٹ، ارٹ اور موسٹ ہیں۔ چوتھے عدد سے تمام اعداد فارسی میں بولے جاتے ہیں۔ باقی تمام اعداد کے لیے خالصتاً براہوی الفاظ موجود نہیں ہیں۔

براہوی ادب کا ابتدائی سرمایہ لوک ادب پر مشتمل ہے۔ یہ ادب نثر و نظم ہر دو صورتوں میں موجود ہے۔ لوک شاعری میں مزاحیہ نظمیں، عشقیہ اور رزمیہ قصے، لوریاں اور لوک گیت شامل ہیں۔ جبکہ نثر میں لوک کہانیاں، لطائف، قصے اور پہیلیاں پائی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے اس لوک ادب کو مستشرقین نے ہی جمع کر کے شائع کیا۔ ان میں ٹی جے ایل میئر، ڈینس برے اور آر ایچ نکلسن کے نام آتے ہیں۔ مقامی لوگوں میں کامل القادری، انور رومان اور عبدالرحمٰن براہوی شامل ہیں جنہوں نے براہوی لوک ادب کی جمع آوری اور اسے منظر عام پر لانے کے لیے سنجیدہ کوششیں کیں۔ براہوی لوک ادب میں شاعری کی مختلف اصناف پائی جاتی ہیں جن کے الگ الگ نام اور ہیئتیں ہیں۔ ان میں لولی، زہیری، ہلو ہالو، سوزو، برنازنا، ماہ لنج، لیلیٰ مور، نازل، لعل نادانہ، لیلڑی اور مودہ شامل ہیں۔ ان تمام اصناف میں سے ہر ایک مختلف اوقات میں یعنی پیدائش، شادی بیاہ اور مسرت و غم یا پھر موت کے موقع پر گائی جاتی ہے۔ براہوی مورخین نے براہوی ادب کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے جن کو ذیل میں مختصراً بیان کیا

جاتا ہے:

الف۔ ابتدائی دور (۱۲۹۲ء۔۱۸۳۸ء):

یہ براہوی ادب کا ابتدائی دور ہے۔ جس میں براہوی نثر میں چند ابتدائی مسودے ملتے ہیں۔ ان کا موضوع مذہبی مسائل یا پھر تعویزات وغیرہ ہے۔ اسی دور میں محمد حسن براہوی اور ملک داد قلاتی کی براہوی شاعری شامل ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی سے بھی براہوی میں چند اشعار منسوب کیے جاتے ہیں۔ [۵۹]

ب۔ وسطی دور (۱۸۸۲ء۔۱۹۴۷ء):

اس دور میں براہوی میں خاصا علمی و ادبی کام ہوا ہے۔ اس کی ابتداء مذہبی ادب سے ہوئی جس کی شروعات انگریزوں نے بیسوی صدی کے آغاز میں انجیل کے براہوی زبان میں ترجمے سے کی۔ تب مقامی علماء مسلمان آبادی کو ان تراجم کے مضر اثرات سے بچانے کے لیے مقامی علماء سرگرم ہوئے اور انہوں نے اس کے ردعمل میں اسلام سے متعلق معلومات براہوی میں لکھنا اور شائع کرنا شروع کیں۔ اس کا باقاعدہ آغاز محمد فاضل درخانی نے مکتبہ درخانی کی بنیاد رکھتے ہوئے کیا۔ ان سے متاثر کئی لوگ براہوی میں اسلامی موضوعات کو نظم و نثر میں پیش کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس رجحان نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ مکتبہ درخانی کی اس تحریک کے تحت لکھنے والوں میں عبدالحی درخانی، حاجی نبو جان، عبدالمجید اور عمر دین پوری وغیرہ شامل ہیں۔ عمر دین پوری کا سب سے اہم کارنامہ قرآن مجید کا براہوی ترجمہ ہے۔ [۶۰] اس دور کے اہم شعراء میں ریکی، مزار بنگلزئی، صدیقی پنجگوری اور تاج محمد تاجل کے نام آتے ہیں۔

ج۔ جدید دور (قیام پاکستان تا حال):

یہ براہوی ادب کا جدید دور کہلاتا ہے۔ اس میں براہوی میں نظم و نثر کی قریباً سبھی اصناف میں تخلیقات سامنے آئی ہیں۔ براہوی میں غزل کا رواج بھی اسی دور میں ہوا اور جدید نظم بھی لکھی جانے لگی۔ جبکہ افسانہ اور ناول بھی لکھے گئے یہ اگرچہ فنی حوالے سے کمزور ہیں۔ براہوی میں تحقیق و تنقید کے پہلو بہ پہلو لسانیاتی مطالعات بھی سامنے آئے۔ کوئٹہ میں پہلے ریڈیو اور پھر ٹی وی سٹیشن قائم ہونے پر یہاں براہوی میں ڈراما نگاری کا شعبہ کھلا۔ اس کے ساتھ ساتھ براہوی میں ترجمے کا چلن شروع ہوا۔ اقبال، فیض اور منیر نیازی

کے کلام کے بعض حصے ترجمہ ہوئے۔ عالمی ادب میں سے ٹالسٹائی، چیخوف اور کئی انگریزی ناولوں اور نظموں کے منظوم تراجم ہوئے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں براہوی ادب نئی منزلوں سے آشنا ہوا یعنی اولین عہد کی نسبت معیار ومقدار کے لحاظ سے اچھا ادب سامنے آیا۔ حکومت نے بھی براہوی زبان کے ارتقا کے لیے کوئٹہ میں براہوی اکیڈمی بنائی۔ اس ادارے کے تحت بیسیوں کتب شائع ہو چکی ہیں اور مزید کام جاری ہے۔ تعلیمی سطح پر دیکھا جائے تو جامعہ بلوچستان میں براہوی زبان وادب کا شعبہ قائم ہے۔ جہاں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جدید دور کے اہم براہوی شعراء میں نادر قمبرانی، غلام محمد شاہوانی، ظفر مرزا، موسیٰ طور، نور محمد پروانہ، پیر محمد زہرانی، قیوم بیدار، افضل مراد اور وحید زبیر شامل ہیں جبکہ نثر میں عبدالرحمٰن براہوی، گل بنگلزئی، تاج رئیسانی، عزیز مینگل، عارف ضیا اور وحید زہیر کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

بلوچی زبان وادب:

بلوچی زبان بلوچستان میں سب سے زیادہ علاقوں میں بولی جانے والی زبان ہے۔ یہ جنوبی افغانستان، مشرقی ایران، بعض عرب ریاستوں سمیت سابقہ سویت یونین کے مختلف حصوں میں لوگوں کی ایک معقول تعداد کا وسیلہ اظہار ہے۔ ماہرین لسانیات نے بلوچی زبان کا شمار زبانوں کے ہند یورپی خاندان میں کیا ہے اور اسے اس گروہ کی ذیلی شاخ ہند ایرانی یا ہند آریائی گروہ کا رکن بتایا ہے۔ کامل القادری نے بلوچی اور کردی زبانوں کی ابتداء کا مقام بحیرہ خزر کے جنوب مشرقی ساحل کو سمجھا ہے اور اس کا ماخذ مادی زبان بتایا ہے۔[۶۱] ایران میں ہخامنشی بادشاہوں کے یادگاری کتبوں اور لوحوں کی تحریروں کو بلوچی سے مشابہت کی بناء پر اسے بلوچی کی ابتدائی صورت قرار دیا جاتا ہے۔[۶۲]

بلوچی زبان کے بھی تین لہجے قائم ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

ا: مکرانی لہجہ — یہ بلوچستان کے مغربی علاقوں میں مروج ہے جو مکران کے مختلف علاقوں گوادر، پنجگور اور تربت وغیرہ میں بولا جاتا ہے۔ بلوچی کے اس لہجے پر فارسی کے اثرات زیادہ ہیں۔

ب: سلیمانی لہجہ — یہ بلوچستان کے مشرقی علاقوں میں بولا جاتا ہے۔ ان میں ڈیرہ بگٹی، کوہلو، ڈیرہ غازی خان کا پہاڑی علاقہ اور کوہ سلیمان کی اترائیوں میں آباد دیگر قبائل شامل ہیں۔ اس لہجے پر سرائیکی اور سندھی زبانوں کے گہرے اثرات ہیں۔

ج: رخشانی لہجہ یہ بلوچستان کے مختلف علاقوں خاران، چاغی، نوشکی اور دالبندین وغیرہ میں رائج ہے۔ ایران اور افغانستان کے بلوچوں کا بھی یہی لہجہ ہے۔ یہی رخشانی لہجہ ہی بلوچی کا معیاری لہجہ قرار دیا جاتا ہے۔

بلوچی ادب کو چار ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ قدیم عہد:

بلوچی میں ابتدائی لوک ادب صرف شاعری پر مشتمل ہے۔ اس میں نثر بالکل ناپید ہے۔ شعری ادب میں اصناف ملتی ہیں ان میں لوری، ہالو، لاڑوگ، سپت، مُوتک، سوت، داستانک اور مورو وغیرہ شامل ہیں۔ اندازاً یہ پندرہویں صدی سے پہلے کا ادب ہے۔ اس کے بعد کا جو بلوچی ادب ملتا ہے۔ اسے چاکر رند کی معرفت سے رند عہد کا ادب کہا جاتا ہے۔ اس عہد کی شاعری میں بلوچوں کی نسلی تاریخ، دلیری و بہادری کے کارنامے، عرب سے ہجرت کا بیان، مختلف رومانوی داستانیں اور وعظ و نصیحت پر مبنی منظومات ملتی ہیں۔ اس زمانے کے اہم شعراء میں شے مرید، میر ببرک اور بالاچ گورگیج اہم ہیں۔ بلوچستان کی کئی رومانوی داستانیں مثلاً حانی شہ مرید، ببرک وگراں ناز اور شہداد ومہناز اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ یوں اس عہد اور اس میں تخلیق پانے والے ادب کو بلوچی ادب کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

ب۔ دورِوسطیٰ:

رند عہد کے بعد ایک عرصہ تک بلوچی ادب میں خاموشی کا وقفہ آتا ہے۔ جب سترھویں صدی کے اوائل میں ریاست قلات ایک نیم وفاق کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس وقت یعنی ریاست قلات کی تشکیل سے بلوچستان پر برطانوی قبضے ۱۸۵۰ء تک کا زمانہ وسطی دور کہلاتا ہے، اسے عہدِ خوانین بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور کے اہم شعرا میں جام درک اور ملا فاضل شامل ہیں۔ جام درک میر نصیر خاں نوری کے دربار کا شاعر تھا۔ اس نے پہلی بار بلوچی شاعری کو ایک خوبصورت لب ولہجہ اور پیرایہء اظہار عطا کیا۔ اس سے پہلے کی شاعری میں سیدھے سادے خیالات منظوم کر لیے جاتے تھے۔ جام درک کے کلام میں بلوچی شاعری فنی طور پر نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اس میں تشبیہ، تمثیل، اشارہ و کنایہ، استعارہ اور نزاکت خیال ایسی خصوصیات ملتی ہیں۔ جام درک کے کلام میں نغمگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ اس لیے اسے بلوچی کا پہلا بڑا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔[۶۳] اس وسطی عہد میں بلوچی نثر کی پہلی کتاب ہــو تـمــان کلمتی ۱۷۶۳ء کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کتاب کے علاوہ کوئی اور نثری تحریر نہیں ملتی۔

ج۔ انگریزی دور:

انیسویں صدی کے وسط میں بلوچستان پر عملاً انگریزوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ خانیت کا ادارہ موجود تھا مگر خوانین کی حیثیت انگریز کے تنخواہ دار ملازمین سے زیادہ نہ تھی۔ بلوچستان کے سیاہ وسفید میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہ زمانہ ۱۸۵۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک یعنی قریباً سو سال پر محیط ہے۔ بلوچی ادب کی تاریخ میں یہ پہلا دور ہے جس میں کئی اچھے اور اہم بلوچی شاعر سامنے آئے۔ ان میں رحم علی مری، مست توکلی، چگھا بزدار اور جوانسال بگٹی وغیرہ شامل ہیں۔ ان شعراء میں مست توکلی کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔ مست کی تمام تر شاعری اپنی محبوبہ 'سموٗ' کے گرد گھومتی ہے۔ 'سموٗ' حسن ومحبت کی علامت ہے اور مست اس کا والہ وشیدا اور اس کے حسن کا جادو بیان شاعر ہے۔ مست کی شاعری کے طفیل اس کی داستانِ محبت ایک 'لیجنڈ' کی حیثیت اختیار چکی ہے۔ بلوچستان بھر میں مست اور سمو کی رومانوی داستان بہت مشہور ہے۔ بلکہ اب تو اس کی خوشبو صوبے سے نکل کر ملک باقی حصوں تک پھیل چکی ہے۔ بعض لوگ 'سموٗ' کو محض ایک استعارہ سمجھ کر مست کی شاعری کو صوفی روایت کا تسلسل سمجھتے ہیں اور اسے پاکستان کے چند اہم صوفی شعراء میں شامل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض ہم عصر بلوچی نقاد ان تصورات کو رد کرتے ہوئے مست کو عشق ومحبت کا پیامبر شاعر قرار دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مست اپنی شاعری کی بدولت بلوچی ادب اور بلوچ معاشرے میں ''شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں'' جگہ پا چکا ہے۔ اس دور میں بھی بلوچی میں نثری ادب تقریباً مفقود ہے۔ صرف ایک کتاب لفظ بلوچی کا تذکرہ ملتا ہے۔

د۔ قیام پاکستان کے بعد:

پاکستان معرض وجود میں آنے اور اس میں بلوچستان کی شمولیت کے بعد جدید بلوچی ادب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں بنیادی تبدیلی یہ پیدا ہوئی ہے کہ نظم ونثر کی قریباً تمام اصناف میں بلوچ ادیب اپنا تخلیقی اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ شعری اصناف میں غزل، نظم معریٰ، آزاد نظم اور ہائیکو وغیرہ لکھے گئے۔ اصناف کے ساتھ ساتھ موضوعات کے حوالے سے بھی بلوچ شعراء کی تخلیقات میں ارتقاء نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں حریت پسندی، روشن خیالی، بلوچ قوم کی یک جہتی کا پیغام حُب الوطنی کا اظہار، سرداروں کے ظلم وجبر سے نفرت، مزاحمت، بُری سماجی روایات پر تنقید اور جذبۂ حسن ومحبت اور جمالِ محبوب کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس دور کے اہم بلوچی شعراء میں گل خان نصیر، آزاد جمالدینی، عطا شاد، اکبر بارکزئی، مراد ساحر، بشیر بیدار اور اللہ بشک بزدار وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ان کے

علاوہ بھی دیگر شعراء ہیں ۔ اگر ایک طرف گل خان نصیر بلوچ قوم پرستی کی توانا آواز ہے تو دوسری طرف آزات جمالدینی ایک انسان دوست شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں جبکہ عطا شاد کو بلوچی میں آزاد نظم کا بانی اور جدید طرز احساس کا پختہ کار شاعر گردانا جاتا ہے۔ بلوچی نثر کے میدان میں افسانہ اور ناول ہر دو اصناف میں کئی لکھنے والوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ بلوچی کا پہلا ناول نـــازک ہے، جس کے مصنف سید ظہور ہاشمی ہیں۔ یہ ناول اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔[٦٤] دیگر ناول نگاروں میں منیر بادینی، ستار پردلی، فقیر محمد، غنی پرواز اور حاجی خدا بخش بزدار شامل ہیں۔

بلوچی میں افسانے کی ابتدا تراجم سے ہوئی۔ مختلف زبانوں کے عالمی طور پر مشہور افسانہ نگاروں کے کئی افسانے بلوچی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ بعد میں طبع زاد افسانہ لکھنے کا رواج شروع ہوا۔ بلوچی کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں شیر محمد مری، صورت خان مری، ظہور شاہ ہاشمی، مراد ساحر، نسیم دشتی، عبداللہ جان جمالدینی، اکبر بارکزئی اور عبدالرحمٰن غور وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ان کے بعد جو لوگ بلوچی ادب کے افق پر طلوع ہوئے ان میں عزیز محمد بگٹی، منیر عیسیٰ، الفت نسیم، حکیم بلوچ، غنی طارق، غنی پرواز، نعمت اللہ گچکی اور منیر بادینی شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر ادیبوں کے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد کوئٹہ میں نشر و اشاعت کی سہولیات دستیاب ہونے کے بعد بلوچی میں ریڈیو اور ٹی وی ڈرامے بھی لکھے جانے لگے۔ ڈرامہ نگاری کے پہلے دور میں میں عطا شاد کا نام نمایاں ہے۔ دیگر نثری اصناف میں سفرنامے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ کوئٹہ میں بلوچی اکیڈمی قائم کی گئی ہے۔ جس نے قریباً تین سو سے زائد کتب بلوچی میں شائع کی ہیں۔ جبکہ جامعہ بلوچستان میں شعبہ بلوچی قائم ہے۔ اس میں ایم۔ اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پاکستان کی بعض دیگر جامعات میں بھی بلوچی بطور اختیاری مضمون کے پڑھائی جاتی ہے۔ جامعہ بلوچستان میں تحقیق کے فروغ کے باعث تحقیقی و تنقیدی مقالات و مضامین بھی لکھے جا رہے ہیں۔ البتہ بلوچی تنقید ابھی ابتدائی شکل میں ہے، اس میں تقریظ کا رجحان حاوی ہے۔

پشتو زبان و ادب:

پشتو زبان کی ابتداء اور اس کی لسانی شناخت پر ماہرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس خطے کی دیگر زبانوں کی طرح پشتو کو بھی ایرانی یا ہند آریائی خاندان سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ دی کیمبرج انسائیکلوپیڈیا آف

لینگوئجز میں جن زبانوں کو ہند ایرانی کہا گیا ہے ان میں فارسی، تاجکی، کردی، پشتو اور بلوچی شامل ہیں۔ [۶۵] گریرسن کے مطابق پشتو ایرانی یا ہند آریائی کی بجائے ایک الگ اور زیادہ قدیم زبان ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آریا دراصل پشتون تھے۔ انہی آریاؤں کی قدیم زبان آریک کہلائی تھی جس سے سنسکرت اور ژند زبانیں وجود میں آئیں۔ کئی پشتون محقق اس نظریے کی تائید کرتے ہیں اور وہ پشتو اور پشتون کو ایرانی الاصل کی بجائے آریا النسل ہونے پر قرار دیتے ہیں۔ مثلاً عبدالحی حبیبی کا موقف ہے کہ پشتو آریک سے زمانہ ماقبل کی زبان ہے۔ ان کے بقول خود لفظ سنسکرت کے جو معنی ہیں یعنی برابر کی ہوئی یا بنائی ہوئی یہ دراصل پشتو کے دو الفاظ سمہ+کڑتہ کا مرکب یا اس کی تبدیل شدہ شکل ہے۔ ان الفاظ کے معنی آج کی پشتو میں بھی یہی ہیں یعنی برابر کرنا یا ٹھیک کرنا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آریا یا آرین کا مطلب شریف، اصل اور نجیب ہے اور پشتو میں آریا کا ابتدائی جز و یعنی 'آر' آج بھی انہی معنوں میں مستعمل ہے۔ چنانچہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ پشتو زبان آریاؤں کی آریک اور سنسکرت سے قبل اپنا الگ وجود رکھتی تھی۔ اور یہ ان دونوں زبانوں سے زیادہ قدیم ہے۔ [۶۶] پشتو زبان کے قدیم ترین رسم الخط کے جو نمونے دریافت ہوئے ہیں۔ وہ ایران میں واقع کوہ بے ستون کے پتھروں پر نقش وہ جملے ہیں، جو آج بھی پشتو میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ یہ کچھ یوں ہیں:

اصل الفاظ	ترجمہ
نہ اڑ یکہ اوم	نہ ضدی ہوں
نہ دروجنہ اوم	نہ جھوٹا ہوں
نہ زورکڑہ اوم [۶۷]	نہ جابر ہوں

ا: بلوچستان میں پشتو ادب کا قدیم دور:

بلوچستان میں پشتو ادب کے اولین آثار میں وہ تاریخی حمد یہ نظم ہے جو پشتو ادب کی پہلی تخلیق تصور کی جاتی ہے۔ یہ نظم شیخ بیٹنی (۳۰۰ھ۔۴۰۰ھ) سے منسوب کی جاتی ہے۔ شیخ کو عرف عام میں بیٹ نکہ کہتے ہیں۔ یہ حمد یا مناجات پشتونوں میں بے حد مقبول ہے۔ اس حمد یہ نظم کا ایک بند مع ترجمہ حسب ذیل ہے۔

نظم	ترجمہ
لویہ خدایہ! لویہ خدایہ	اے عظیم رب اے عظیم رب
ستا پہ مینہ ہر ہر حایہ	تیری محبت میں ہر ہر مقام پر

غرو لاڑ دی درناوی کشے	پہاڑ اپنی پوری گرانباری سے کھڑے ہیں
ٹولہ ژوی پہ زاری کشے	تمام خلائق بندگی میں زندگی بسر کر رہے ہیں
دلتہ دی دَغرو لمنی	یہاں پہاڑوں کے دامن میں
زموز کز دی دی پکے پلنے	ہمارے خیمے ان میں نصب ہیں
داو کری ڈیر کڑی خدایہ	اے رب اس خاندان کو وسعت دے
لو یہ خدایہ !لو یہ خدایہ![۶۸]	اے عظیم رب اے عظیم رب

قریباً ایک ہزار سال قبل لکھی گئی اس مناجات کے بیشتر الفاظ آج بھی انہی معنوں میں مستعمل ہیں۔ بیٹ نیکہ کے بیٹے اسماعیل کو پشتو کا دوسرا شاعر سمجھا جاتا ہے، مگر اس کے شعری آثار دستیاب نہیں۔ اس کے فوراً بعد کے زمانے میں دو اور شعراء خرشبون اور ملک یار غرشین کا بھی صرف تذکرہ ہی ملتا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اس خطے کے ادبی افق پر کسی شاعر یا نثر نگار کا نام نظر نہیں آتا۔ نویں صدی ہجری میں ژوب میں بابر خان کا نام ملتا ہے مگر ان کے بھی قلمی آثار موجود نہیں۔

ب۔ دورِ وسطی:

بلوچستان میں پشتو ادب کا دوسرا دور احمد شاہ ابدالی کے عہد سے تعلق رکھتا ہے جب اس خطے کا پہلا اہم شاعر پیر محمد کاکڑ منظر عام پر آیا۔ یہ ژوب اور کوئٹہ کے درمیان واقع قصبے مسلم باغ سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس نے مشکل حالات کی وجہ سے ترک وطن کیا اور قندھار جا کر آباد ہوا۔ قندھار ہی میں اس نے وفات پائی۔ پیر محمد کاکڑ کی شاعری کتابی صورت میں موجود ہے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا مجموعہ کلام ۱۱۹۶ھ میں مکمل کر لیا تھا۔ پیر محمد نے پشتو نثر کی ایک کتاب معرفت الافغانی بھی تصنیف کی۔[۶۹] اس عہد کے دیگر شعراء میں میاں فقیر اللہ اور ملا جان محمد شامل ہیں۔

ج: نوآبادیاتی دور:

بلوچستان میں پشتو کا تیسرا دور انگریزوں کی آمد سے قیام پاکستان تک ہے۔ اس میں کئی اہم شعراء پیدا ہوئے۔ جن کے ادبی نقوش محفوظ ہیں۔ اس دور کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس عرصے میں یہاں کی ایک لوک صنفِ شعر 'کاکڑی غاڑے' کا رواج ہوا۔ یہ ایک شعر کی صورت دو مختصر مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ 'کاکڑی غاڑے' ہم قافیہ بھی ہو سکتے ہیں اور بغیر قافیہ کے بھی۔ اس صنف کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کا کوئی واحد تخلیق کا

نہیں ہوتا۔ اسے ایک اجتماعی صنف سخن کہا جا سکتا ہے۔ عموماً عورتیں اس صنف میں اظہار خیال کرتی ہیں مگر مرد بھی 'کاکڑی غاڑے' کہتے ہیں۔ اس میں عموماً عشق و محبت کے مضامین، محبوب کا حسن و جمال، فطرت کی نیرنگی، وطن سے محبت اور اس کی خوبصورتی کا بیان اور اپنے عہد کے سماجی و سیاسی مسائل پر رمز و کنائے اور دلکش پیرائے میں گفتگو کی جاتی ہے۔ مثلاً اپنے وطن کے بارے میں کہا گیا ہے:

تر ساڑہ شمال دی جارسم
لہ پی پورتہ خراسانہ [۷۰]

ترجمہ: اے وطن تیری ٹھنڈی ہواؤں پر قربان ہو جاؤں اے خراسان تم دودھ سے زیادہ اُجلے اور شیریں ہو۔

وادی ژوب کے ایک بڑے حصے کو خراسان بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ژوب میں جب انیسویں صدی کے اختتام میں انگریزوں نے ریلوے لائن بچھائی تو ان کے اس عمل پر اعتراض کرتے ہوئے اپنے نوجوانوں کو غیرت دلاتے ہوئے ایک 'کاکڑی غاڑے' میں کہا گیا:

حہ سول تر بوران
پر ژوب گاڈی وھی گور گیان [۷۱]

ترجمہ: ہمارے بھائی کیا ہوئے؟ (ان کی غیرت کہاں گئی) کہ فرنگی ژوب کی زمین پر ریل گاڑی چلانے کی جرات کر سکے۔

اس دور میں اگرچہ پہلا نام سید یعقوب شاہ کا ملتا ہے مگر سب سے اہم شاعر عبدالعلی اخوند زادہ (۱۱۸۹ھ ۔۱۲۶۴ھ) ہے۔ اسے اب تک بلوچستان کی پشتو شاعری کا سب سے اہم نام تصور کیا جاتا ہے۔ وہ پشتو اور فارسی کے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عالم، فاضل اور محقق بھی تھے۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ کابل و قندھار کے علمی حلقوں تک تھا۔ شاخِ گل ان کا پشتو اور فارسی کلام پر مشتمل مجموعہ کلام ہے۔ عبدالحق زبور، حافظ خان محمد، عبدالسلام اچکزئی اور مولوی رحمت اللہ اس دور کے دیگر اہم نام ہیں۔ عبدالسلام کے مجموعہ کلام سوسن چمن کو انگریز حکومت نے ضبط کر کے جلا دیا تھا۔ [۷۲]

د: جدید دور (قیام پاکستان تا حال):

قیام پاکستان کے بعد اس خطے میں پشتو ادب کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف کئی اچھے شعراء سامنے آئے بلکہ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی با قاعدہ کام کا آغاز ہوا، افسانے، ڈرامے اور ناول لکھے گئے۔ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد آنے والے جن لوگوں نے نظم و نثر کی مختلف اصناف میں بہتر تخلیقی کام کیے، ان میں عبدالخالق تارن، سید محمد رسول فریادی، عبدالحمید کاکڑ، سلطان محمد صابر، سلطان محمد پانیزئی، فاروق سائلزئی، نظیر درانی، عبدالغفور درانی، محمد زمان اچکزئی، عبداللہ خان مندوخیل، عبدالحق بوستانی، ظفر اللہ خان اور ملک محمد عثمان شامل ہیں۔ ان کے بعد جدید تر دور کے شعرا میں رب نواز مائل، سعید گوہر، سرور سودائی، سید خیر محمد، عبداللہ درویش، معصوم خان معصوم، درویش درانی، راز محمد راز، محمود ایاز، رؤف رفیقی اور علی کمیل قزلباش قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے پشتو شاعری میں جدید رجحانات کا اضافہ کیا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ اسی دور میں پشتو افسانہ اور ڈرامہ نگاری کا ارتقا ہوا۔ دُر محمد کاسی، فاروق سرور اور یعقوب شاہ غرشین اہم افسانہ نگار ہیں۔ طبع زاد فکشن کے علاوہ تراجم بھی ہوئے۔ والٹیئر کے کاندید کا پشتو ترجمہ کمال خان شیرانی نے کیا۔[۳۷] پشتو میں تحقیق و تنقید میں بھی خاطر خواہ کام ہوا۔ صاحبزادہ حمید اللہ اور سیال کاکڑ نے درجنوں مقالات اور کتب لکھیں۔ پشتو اکیڈمی کوئٹہ، بلوچستان کے ادیبوں کی قلمی کاوشیں منظر عام پر لا رہی ہے۔ جبکہ جامعہ بلوچستان میں پشتو میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کی تعلیم دی جاتی ہے۔

فارسی زبان و ادب:

فارسی ایران و افغانستان کی قومی زبان کی حیثیت سے دنیا بھر میں ممتاز ہے۔ یہ ایک خودمختار اور بڑی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ وقیع ادب کا عظیم سرمایہ رکھتی ہے۔ دنیا بھر میں اپنی متنوع خوبیوں کے باعث مقبول ہے۔ یہاں فارسی زبان کی اصل اور تاریخ بیان کرنے کی بجائے بلوچستان سے اس کا تعلق اور ادبی سرمائے پر ایک نظر ڈالنا مفید ثابت ہوگا۔ بلوچستان جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر فارسی زبان کے دو اہم مراکز یعنی ایران و افغانستان سے متصل ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ خطہ انتظامی طور پر ان ہی دو ممالک کے زیر اثر رہا ہے جس کی وجہ سے یہاں کی علمی و ادبی فضا میں فارسی کی شرکت ایک اہم عنصر کے طور پر رہی ہے۔ سترھویں صدی میں تشکیل پانے والی ریاست قلات کی، جو قیام پاکستان تک برقرار تھی، سرکاری زبان فارسی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ادوار کے مختلف تاریخی معاہدے، عدالتی فیصلے، خط و مراسلت اور اس نوع کی دیگر دستاویزات فارسی زبان میں موجود ہیں۔ بلوچستان کے مختلف تاریخی

حوالے اسی زبان میں لکھی گئی کتب میں ملتے ہیں۔ ریاست قلات میں لکھی گئی کتب اور شاعری کے دیوان بھی زیادہ تر فارسی میں ہی ملتے ہیں۔ بلوچستان کے اکثر ذوالکسان شاعر بلوچی، براہوی، پشتو اور دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ کئی شعراء کے فارسی شعری آثار بھی موجود ہیں، جبکہ بعض کے ہاں تو مقدار کے لحاظ سے فارسی کا پلہ بھاری ہے۔

بلوچستان میں فارسی ادب کا آغاز بھی دیگر زبانوں کی طرح شاعری سے ہوا۔ بعد میں مختلف لکھنے والوں نے نثر کے میدان میں بھی اپنے تخلیقی امکانات ظاہر کیے۔ بلوچستان میں تخلیق ہونے والے فارسی ادب کی ادوار بندی نہیں کی گئی۔ تاہم اسے ابتداء سے ریاست قلات کے قیام تک، ریاست قلات سے انگریزوں کی آمد یا قیام پاکستان تک اور قیام پاکستان سے تا حال کے مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ قدیم دور:

بلوچستان میں فارسی کے اولین شعری آثار رابعہ خضداری کی شاعری کی صورت میں ملتے ہیں۔ رابعہ خضداری کا تعلق نویں صدی سے ہے۔ اس کے شعری آثار نہ صرف بلوچستان کی ادبی روایت میں قدیم تر حیثیت رکھتے ہیں بلکہ یہ ہندوایران کی ادبی روایت میں قدیم ترین حیثیت سے مسلمہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ رابعہ خضداری کو فارسی زبان کی اولین شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ یہاں کے عرب گورنر کی بیٹی اور فارسی شاعری کے باوا آدم رودکی کی ہمعصر تھی۔[۴] عبدالشکور احسن نے بلوچستان کے شہر خضدار سے رابعہ کے تعلق پر مدلل بحث کی ہے۔ اور اسے رابعہ کا مولد و مسکن بتایا ہے۔[۵] ان کے مطابق رابعہ کی شاعری فنی پختگی، قدرت کلام اور جذبہ و احساس کے بھرپور اظہار کا مرقع ہے۔ رابعہ خضداری کی ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں:

عشق اوباز اندر آور دم بہ بند
کوشش بسیار نامد سود مند
عشق دریائی کرانہ نا پدید
کی توان کردن شنا ای ہوشمند
عاشقی خواہی تا پایاں بری
پس بباید ساخت باہر ناپسند

زشت باید دید، انگارید خوب
زہر باید خورد ، پندارید قند[۲۶]

ترجمہ: ہزار جتن کے باوجود میں پھر اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ عشق ایک بیکراں سمندر ہے، اس کا پار کرنا بھلا کب ممکن ہے۔ اگر عشق کو انجام تک لے جانا ہے تو ہر ناپسند شے کو بھی قبول کرنا ہوگا۔ برے کو اچھا اور زہر کو قند سمجھنا ہوگا۔

ب۔ وسطی دور:

رابعہ ہی کے زمانے میں دو شعراء عثمان مختار خضداری اور حمید الدین حاکم کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان کے بعد ایک عرصے تک بلوچستان میں فارسی ادب کا تذکرہ نہیں ملتا اور کئی صدیاں خاموشی سے گزر جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کے مطابق شاید ان صدیوں میں تخلیق ہونے والا ادب مرورِ زمانہ سے ناپید ہو گیا۔ سترھویں صدی کے آخر میں ایک فارسی شاعر شے محمد درخشاں کا نام آتا ہے۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی کے آغاز میں پیر محمد کاکڑ جو پشتو کے شاعر ہیں (پشتو ادب کے ذیل میں ان کا تذکرہ قبل ازیں ہو چکا ہے) نے فارسی کو بھی ذریعہء اظہار بنایا۔ اٹھارویں صدی میں ہی قاضی نور محمد گنج آبوی فارسی کے ایک اور شاعر ہو گزرے ہیں، وہ ریاست قلات کے حکمران میر نصیر خان نوری کے ہمعصر ہی نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ایک خصوصی تعلق بھی رکھتے تھے۔ قاضی نور محمد گنج آبوی سے منسوب ایک مثنوی 'جنگ نامہ' ہے۔

ج۔ انگریزی دور:

ان کے بعد انیسویں صدی میں فارسی کی نثری کتب سامنے آتی ہیں۔ جو زیادہ تر شرعی مسائل، پند و نصائح، مذہبی احکامات، تفاسیر و قرآنی تراجم پر مشتمل ہیں۔ اسی زمانے میں دو فارسی شاعر سامنے آتے ہیں یہ ناطق مکرانی اور محمد حسن براہوی ہیں۔ ناطق مکرانی جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے خطہ مکران سے تعلق رکھتے تھے ان کا نام گل محمد اور ناطق تخلص تھا۔ انھوں نے کٹھن حالات کے باعث ترکِ وطن کیا اور کچھ عرصہ حیدر آباد میں مقیم رہے۔ وہاں سے دلی اور لکھنؤ کا رُخ کیا اور لکھنو میں ہی وفات پائی۔ ان کا ایک مجموعہ کلام جوہرِ معظم کے نام سے موجود ہے۔ ناطق مکرانی کے مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تعلقات اور خط و مراسلت تھی۔ انھوں نے غالب کی ایک مثنوی 'درد و داغ' میں ایک غلطی کی نشاندہی بھی کی تھی۔ ان کے نام مرزا غالبؔ کا ایک فارسی خط بھی ملتا ہے، جس میں غالب اپنی

غلطی تسلیم کرتے ہیں۔ [۷۷]

محمد حسن براہوی انیسویں صدی کے ایک اہم شاعر ہیں، انہیں نہ صرف ریاست قلات کے حکمرانوں کا تقرب حاصل رہا بلکہ انہوں نے ریاست کے بعض سرداروں سے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں اور اس رشتہ داری کے عوض قلات کے وزیر اعظم رہے۔ انعام الحق کوثر نے محمد حسن براہوی کے فارسی میں چار قلمی مجموعوں کا تذکرہ کیا ہے۔ [۷۸] حسن براہوی نے اردو میں بھی ایک شعری مجموعہ ترتیب دیا جس کی بنا پر انہیں بلوچستان میں اردو کا پہلا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ (اس کا تفصیلی ذکر اگلے باب میں ہوگا)۔ محمد حسن براہوی کے فارسی کلام میں سادگی اور روانی پائی ہے۔ ان کے ہاں عاشقانہ مضامین اور معاملہ بندی وافر ہے جو سبک ہندی کی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی بڑے فارسی شعراء کے کلام پر تضمینات بھی لکھی ہیں۔ اس زمانے کے دیگر فارسی شعراء میں فاضل، فیض محمد کلاتی، تائب، علیم اللہ علیم، احمد اور مولا داد شامل ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے وسط یعنی قیام پاکستان تک بلوچستان میں فارسی شعراء کی ایک اور نسل سامنے آتی ہے۔ ان میں خاکی، نبوجان، شیدا، یوسف عزیز مگسی، ابوبکر مستونگی، عبدالعلی اخوندزادہ، عابد شاہ عابد حنفی، محمد یعقوب، زیب مگسی، اسماعیل اور دوسرے بہت سے نام ہیں۔ ان میں یوسف عزیز مگسی اور ان کے بڑے بھائی زیب مگسی کے نام نمایاں ہیں۔ یوسف عزیز مگسی قبیلے کے نواب تھے وہ اپنی سیاسی جدوجہد کی بناء پر پاک و ہند میں معروف ہوئے۔ یوسف عزیز مگسی کی اردو اور فارسی شاعری کے بہت کم آثار ملتے ہیں مگر ان کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کا موضوع سیاسی وسماجی فلاح ہے۔ وہ شاعری سے سماجی اصلاح اور اخلاق حسنہ کے بیان کا کام لیتے ہیں اور اپنی قوم کو بیدار ہونے، آزادی حاصل کرنے اور دنیا میں ترقی اور عزت پانے کا سبق دیتے ہیں۔ یوسف عزیز کی شاعری میں پیش کیے گئے خیالات وموضوعات پر اقبال کی گہری چھاپ واضح نظر آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ یوسف عزیز مگسی کا پیغام صرف اپنی بلوچ قوم کے لیے ہے، تاکہ بلوچستان کی پسماندگی اور محرومی ختم ہو اور یہاں بھی ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح علمی اور سماجی ترقی ہو۔ اس زمانے کا دوسرا اہم شاعر کوئی اور نہیں بلکہ یوسف عزیز مگسی کا بھائی زیب مگسی ہے۔ ان کا پورا نام گل محمد خان تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی علم وادب کی آبیاری میں گزاری۔ اسی بناء پر وہ دنیاوی جاہ وجلال اور سیاسی معاملات سے دور رہے۔ زیب کو ہفت زبانی شاعر کہا جاتا ہے، وہ اردو، بلوچی، براہوی، سرائیکی، سندھی، پنجابی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں ان کے دو مجموعے طبع ہوئے۔ گلدستہ زیب اور

خزینتہ الاشعار پہلی بار نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئے تھے۔[۹] ان میں سے پہلا مجموعہ غزلوں، جبکہ دوسرا مخمسات پر مشتمل ہے جو مختلف فارسی شعرا کے مصرعوں پر لکھے گئے ہیں۔ اس دور کے دیگر فارسی شعراء میں عابد شاہ عابد، ولی پنجگوری، حنفی، محمد حسین عنقا، مولوی محمد یعقوب، فیصل فقیر، اسماعیل پھلا بادی، شیدا، اور امیر وغیرہ شامل ہیں۔

ج۔ جدید دور:

قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں لکھی جانے والی فارسی نظم اور نثر ہر دو شعبوں میں ترقی ہوتی نظر آتی ہے۔ اسے ان لوگوں نے مہمیز دی جو ہندوستان کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی نثر میں بھی کام ہوا۔ کہانیاں اور افسانے بھی لکھے گئے مگر لکھنے والوں کا زیادہ رجحان تحقیق و تنقید کی طرف تھا۔ کوئٹہ میں ایران کے ثقافتی مرکز کے قیام نے بھی یہاں فارسی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ فارسی مشاعرے اور ادبی تقاریب منعقد ہونے لگیں۔ اس دوران کئی نئے لکھنے والے سامنے آئے۔ اس عہد میں آغا صادق حسین، انعام الحق کوثر، محشر رسول نگری، خاوری، عاطفی، ماہر افغانی، دستگیر ناشاد، نور محمد ہمدم، شرافت عباس اور کئی دوسرے لوگ شامل ہیں۔ ان میں آغا صادق، محشر رسول نگری اور ماہر افغانی نے شاعری میں نام پیدا کیا جبکہ تحقیقی نثر میں انعام الحق کوثر کا نام نمایاں ہے۔ اردو اور فارسی زبان میں مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ فارسی شعراء کے تذکرے بھی لکھے گئے اور ان پر تنقیدی مضامین لکھنے کا رجحان شروع ہوا۔ کئی اہم فارسی کتب کے اردو میں تراجم بھی کیے گئے۔ اوپر جن لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا شمار اب اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر اب وفات پا گئے ہیں۔ موجودہ دور میں فارسی میں لکھنے والوں میں علی کمیل قزلباش، صدف چنگیزی، محبوب نقوی، محمد نبی حجازی اور محمد ناصر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں زیادہ تر فارسی کے شاعر ہیں جبکہ بعض نثر نگار بھی ہیں۔ بلوچستان کی دیگر زبانوں کی طرح کوئٹہ میں سرکاری سطح پر فارسی اکیڈمی تو نہیں ہے مگر ایران کا ثقافتی مرکز خانہ فرہنگ اس کی کمی بڑی حد تک پوری کر رہا ہے۔ یہاں نہ صرف فارسی زبان سکھائی جاتی ہے بلکہ فارسی کتب سے استفادہ کے لیے ایک بڑی لائبریری بھی قائم ہے۔ خانہ فرہنگ کوئٹہ یہاں کے ادیبوں کی فارسی کتب بھی شائع کرتا ہے اور مشاعرے و ادبی تقاریب بھی منعقد کرتا ہے۔ جامعہ بلوچستان میں شعبہ فارسی قائم ہے جہاں فارسی میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے بلوچستان کا مسئلہ ازعنایت اللہ بلوچ، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

۲۔ قدرت نقوی، سید، مرتبہ، ہنگامہ دل آشوب انجمنِ ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۴

۳۔ دیکھئے تاریخِ بلوچستان از لالہ ہتورام سنگ میل، لاہور، ۱۹۸۵ء اس کتاب کے علاوہ بھی ماقبل تقسیم دور کی دستیاب تحریروں میں ''برٹش بلوچستان'' کی اصطلاح ملتی ہے۔

۴۔ ہتورام نے اس شعر کے پہلے مصرعے میں سبی وڈھاڈر کی بجائے تونسہ ومنگروٹہ لکھا ہے۔ دیکھئے: تاریخِ بلوچستان از لالہ ہتورام، سنگ میل لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۲۵

۵۔ دی نیو انسائیکلو پیڈیا بریٹنیکا، جلد ۲، ولیم بینٹن پبلشر، لندن، ۷۴۔۱۹۷۳ء، ص ۶۷۷

۶۔ مزید تفصیل کے لیے درج ذیل کتابیں دیکھئے:

الف۔ بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں از گل خان نصیر، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، ۱۹۸۲ء

ب۔ تاریخ بلوچ وبلوچستان، جلد اول ازآغا احمد خان احمد زئی، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ۱۹۸۸ء

۷۔ بلوچ، سردار خان، بلوچ قوم کی تاریخ، جلد اول، مترجم: انور رومان، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ، ۱۹۸۰ء، ص ۴۵

۸۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد ۴، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۸۶۷

۹۔ کوثر، انعام الحق، ڈاکٹر، بلوچستان چند پہلو، ادراہ تصنیف وتحقیق، کوئٹہ، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳

۱۰۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد ۱۴، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۳۴۵

۱۱۔ ہیوز، اے۔ ڈبلیو، سرزمینِ بلوچستان، مترجم، انور رومان، گوشہ ادب، کوئٹہ، ۲۰۱۱ بار دوم، ص ۴۹

۱۲۔ منہاج سراج، طبقاتِ ناصری، مترجم، غلام رسول مہر، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۳۸

۱۳۔ سلیمان ندوی،سید، عرب و ہند کے تعلقات کریم سنز پبلشرز،کراچی،۱۹۷۶ءص۱

۱۴۔ قدوسی،اعجاز الحق، تاریخ سندھ ،حصہ اول،مرکزی اردو بورڈ،لاہور،۱۹۷۱ء،ص۳۷

۱۵۔ اختر رضوی ،مترجم،چچ نامہ ،سندھی ادبی بورڈ،حیدر آباد،۱۹۶۳ء،ص۶۳

۱۶۔ اسٹرینج،جی۔لی، جغرافیہ خلافتِ مشرقی مترجم؛محمد جمیل الرحمٰن ،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۸۶ءص۵۲۴

۱۷۔ حمید بلوچ،مکران: عہد قدیم سے عہد جدید تک ہاشمی ریفرنس لائبریری،کراچی،۲۰۰۹ءص۱۹

۱۸۔ قدوسی،اعجاز الحق،تاریخ سندھ،حصہ اول،مرکزی اردو بورڈ،لاہور،۱۹۷۱ء،ص۳۶

۱۹۔ ایضاً،ص۳۴

۲۰۔ ملاحظہ ہو معجم البلدان از یاقوت عبداللہ،تلخیص: غلام جیلانی برق،شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور،سن ندارد

۲۱۔ قدوسی،اعجاز الحق،تاریخ سندھ،حصہ اول،مرکزی اردو بورڈ،لاہور،۱۹۷۱ء،ص۳۶

۲۲۔ نبی بخش خاں بلوچ کے مطابق بلاذری نے اسے قنزبور لکھا ہے۔دیکھئے تعلیقات چچ نامہ،۱۹۶۳ء،ص۴۳۸

۲۳۔ برہانِ قاطع ،جلد اول،شرکت طبع کتاب،اسفند،۱۳۱۸ھ،شہر ندارد،ص۲۲۸

۲۴۔ ڈیمز،لانگ ورتھ،اے ٹیکسٹ بک آف دی بلوچی لینگویج ،بلوچی اکیڈمی،کوئٹہ،۱۹۹۱ء باردوم

۲۵۔ بحوالہ بلوچ قوم کی تاریخ جلد اول از سردار خان بلوچ،ص۳۴

۲۶۔ بحوالہ بلوچستان تاریخ کی روشنی میں ۱۹۸۵ءازمحمد سعید دہوار ص۶۵

۲۷۔ ہتورام،لالہ،تاریخِ بلوچستان،سنگ میل،لاہور،باردوم،۱۹۸۵ء،ص۲۵،۲۶

۲۸۔ نصیر،گل خان،تاریخ بلوچستان، جلد اول دوم،قلات پبلشرز،کوئٹہ،باردوم،۱۹۷۹ء،ص۱

۲۹۔ بلوچ،سردار خان:بلوچ قوم کی تاریخ،جلد اول،ص۱

۳۰۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، ص۸۶۱

۳۱۔ مقالہ نگار ژوب [بلوچستان] کا رہائشی ہے۔وہ لوگوں سے بار ہا بلوچ کا تلفظ 'بلوس' سن چکا ہے۔اس علاقے میں اب تک بلوس خان یا بلوچ خان نام رکھے جاتے ہیں۔اس سے یہ نظریہ تقویت پاتا ہے کہ پرانے زمانے میں یہ کسی تاریخی شخصیت کا لقب تھا۔

۳۲۔ قانع،میر علی شیر،تحفتہ الکرام مترجم:اختر رضوی،سندھی ادبی بورڈ،جامشورو،بار دوم،۲۰۰۲ء، ص۹۲

۳۳۔ پوٹنگر،ہنری،سفرنامہ بلوچستان و سندھ مترجم؛انور رومان،نساء ٹریڈرز،کوئٹہ،بار دوم۱۹۸۳ء ص۲۸۸

۳۴۔ ڈیمز،لانگ ورتھ، بلوچ نسل مترجم گل خان نصیر،قلات پبلشرز،کوئٹہ،بار دوم،۱۹۸۳ءص۱۰۰

۳۵۔ دیکھئے ا۔ بلوچ قوم کی تاریخ ازسردار خان بلوچ

۲۔ بلوچستان تاریخ کے آئینے میں ازخدا بخش بجارانی،نساء ٹریڈرز،کوئٹہ،۱۹۹۱ء

۳۶۔ البلوشی،محمد اسماعیل دشتی، بلوچ تاریخ اور عرب تہذیب ،النمری بلوچ،کراچی،۱۹۹۹ء، ص۴۵

۳۷۔ فریدی،نور احمد،بلوچ قوم اور اس کی تاریخ،قصرالادب نور محل،ملتان،۱۹۶۸ءص۵۴

۳۸۔ بحوالہ سردار خان بلوچ،بلوچ قوم کی تاریخ،جلد اول،ص۲۱

۳۹۔ ہتورام،تاریخ بلوچستان ،ص۶۲

۴۰۔ مری،شاہ محمد،بلوچ قوم قبائلی اور جاگیرداری عہد،گوشہء ادب،کوئٹہ،۲۰۱۴ء،ص۸

۴۱۔ چارلس میسن،سفر نامہ قلات مترجم؛انور رومان،نساء ٹریڈرز،کوئٹہ، ۱۹۹۱ءص۱۳

۴۲۔ انور رومان،کوئٹہ قلات کے براہوی مترجم؛انعام الحق کوثر،قریشی پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۸۷ء،ص۴۵

۴۳۔ نصیر،گل خان،بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں،نساء ٹریڈرز،کوئٹہ،۱۹۸۲ء

۴۴۔ حمید بلوچ، مکران ص ۳۶۔ ۳۸

۴۵۔ فردوسی،ابوالقاسم،شاہنامہ ء فردوسی ، جلد دوم،وزارت فرہنگ وارشاد اسلامی،تہران،۱۳۸۳ھ

۴۶۔ ملاحظہ کیجئے کوچ وبلوچ از گل خان نصیر،قلات پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۸۳ء

۴۷۔ ہروی،نعمت اللہ،تاریخ جہانی و مخزن افغانی ،مترجم: ڈاکٹر محمد بشیر حسین،مرکزی اردو بورڈ،

لاہور، ۱۹۷۸ء ص ۳۴

۴۸۔ پریشان خٹک، پشتون کون ، پشتو اکیڈمی، پشاور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴

۴۹۔ صابر، سلطان محمد، قدیم پشتو اور پشتون ، مترجم: عبدالفتح، پشتو اکیڈمی، کوئٹہ، ۱۹۷۷ء، ص ۷

۵۰۔ ایضاً

۵۱۔ شیرانی، مظہر محمود، حافظ محمود شیرانی کی علمی وادبی خدمات ،مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۳ء ص ۲۱

۵۲۔ صدیقی، محمد ادریس، وادی سندھ کی تہذیب، مکتبہ نیا راہی، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۷

۵۳۔ ابن حنیف، سات دریائوں کی سر زمین فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۷ء ص ۱۸۸

۵۴۔ کوثر، انعام الحق، بلوچستان ایک مطالعہ، ادارہ تصنیف و تحقیق، کوئٹہ، ۲۰۰۷ ص ۳۷

۵۵۔ بلوچ، محمد سعید، ملک، بلوچستان ما قبل تاریخ بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ۱۹۷۱ء، ص ۶۷

۵۶۔ کامل القادری، قدیم بلوچستان ، بولان بک ڈپو، کوئٹہ، ۱۹۷۱ء ص ۹

۵۷۔ عبدالرحمٰن براہوی، بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور ان کی حکومتیں، قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۹۰ء

۵۸۔ نصیر، گل خان، بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں ص ۲۰۷

۵۹۔ براہوی، عبدالرحمٰن، براہوی زبان و ادب کی مختصر تاریخ مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۹۱۔۹۲

۶۰۔ قرآنِ مجید مترجم بزبانِ براہوی ، ادارہ تاریخ وتہذیب وتمدنِ اسلامی، اسلام آباد، ۱۴۰۳ھ

۶۱۔ کامل القادری، مہمات بلوچستان گوشہ ادب، کوئٹہ، باردوم ۲۰۰۸ء ص ۲۱۹

۶۲۔ مری، شیر محمد، بلوچی زبان و ادب کی تاریخ مترجم: نصیر خان احمد زئی، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، س ن، ص ۴۸۔۵۰

۶۳۔ کامل القادری، مہمات بلوچستان ص ۱۹۲

۶۴۔ ظہور شاہ ہاشمی، نازک ،مترجم:غوث بخش صابر، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء

۶۵۔ گریرسن۔جی۔اے، لینگوسٹک سروے آف پاکستان اکیوریٹ پرنٹرز، لاہور، س ن، ص۵

۶۶۔ حبیبی، عبدالحئی، دپختو ادبیاتو تاریخ (جلد دوم) پختو ٹولنہ، کابل، بار دوم ۱۳۴۲ھ ص۳

۶۷۔ ایضاً، ص۱۶

۶۸۔ ثقافت وادب وادی بولان میں نظامت ثقافت بلوچستان، کوئٹہ، ۲۰۱۳ء بار دوم، ص۱۰-۱۱

۶۹۔ ایضاً، ص۳۴۵

۷۰۔ ایضاً، ص۹

۷۱۔ ایضاً، ص۱۰

۷۲۔ ایضاً، ص۴۲

۷۳۔ کمال خان شیرانی نے کاندید کا جو پشتو ترجمہ کیا ہے وہ اسپیحلے کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۷۴۔ کوثر، انعام الحق، جوئے کوثر بابر سٹیشنری مارٹ، کوئٹہ، ۱۹۷۶ء، ص۲۲

۷۵۔ عبدالشکور احسن، ''رابعہ خضداری''، مشمولہ: اقبال ریویو، اقبال اکیڈمی لاہور جولائی ۱۹۷۷ء، ص۶۵

۷۶۔ کوثر، انعام الحق، بلوچستان میں فارسی شاعری، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ۱۹۶۸ء، ص۲۵۔۲۶

۷۷۔ پرتو روہیلہ، مرتب ومترجم، کلیات مکتوباتِ فارسی غالب نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۴۱۰

۷۸۔ دیکھئے مقدمہ کلیاتِ محمد حسن براہوی مرتب: انعام الحق کوثر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء

۷۹۔ ان دونوں مجموعہ ہائے کلام کو انجمنِ فارسی بلوچستان، کوئٹہ نے ۹۶۔۱۹۹۵ میں دوبارہ شائع کیا ہے۔

باب دوم:

بلوچستان میں اردو زبان وادب

(ابتداء سے قیام پاکستان تک)

بلوچستان میں اُردو زبان وادب کے ارتقاء کی داستان دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات افزا بھی ہے۔ یہ خطہ برصغیر کے معروف ادبی اور علمی مراکز سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں اُردو زبان شروع سے رائج نہیں تھی۔ اس لیے اردو ادب کی تاریخ بھی زیادہ پرانی نہیں۔ اس مختصر ادبی تاریخ کے باوجود بلوچستان کے بعض محققین اپنی تحریروں میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بلوچستان ہی اُردو کا پہلا مولد و مسکن ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو کی اولین نشو ونما اسی خطے میں ہوئی۔

بلوچستان میں اردو زبان:

بلوچستان میں اردو زبان کی پیدائش کی رائے سب سے پہلے کامل القادری نے پیش کی، ان کے بقول:

> اردو کی تشکیل کی ابتداء بلوچستان سے ہوئی کیونکہ یہی بلوچستان ہے جو خلافت مشرقی کا صوبہ طوران ہوتا تھا اور محمد بن قاسم کی مہم کے بعد ایک زمانے تک اس علاقے میں عربی، فارسی اور سندھی زبانیں بولنے والے لشکریوں کا میل ملاپ ہوتا رہا اور ان کی بول چال سے نئی زبان تشکیل پانے لگی۔[1]

محولہ بالا اقتباس میں وہی بات کی گئی ہے جو اردو زبان کی پیدائش کے بارے میں پنجاب، دکن، دہلی، سندھ اور دیگر علاقوں کے حوالے سے بالعموم کی جاتی ہے۔ اس میں صرف محل وقوع بدل گیا ہے باقی دلائل تقریباً وہی ہیں۔ جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے بلوچستان کے محققین سندھ کی بجائے بلوچستان ہی کو "باب الاسلام" کہتے ہیں۔ اُن کے مطابق محمد بن قاسم بلوچستان کے راستے سندھ گیا تھا (دیکھئے باب اول، ص۱۹)۔ چنانچہ یہاں عربی اور دیگر زبانوں کا پہلا اختلاط ہوا، جس سے اردو کا ابتدائی ہیولیٰ تیار ہوا۔ اس نظریے کے حق میں لکھنے والوں میں انور رومان، انعام الحق کوثر، عبدالرحمٰن براہوی اور عبدالرزاق صابر وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اس موضوع پر مضامین لکھے، جبکہ بعض نے کسی اور موضوع پر لکھتے ہوئے برسبیل تذکرہ اس دعوے کی تائید کی، مثلاً انعام

الحق کوثر کلیاتِ محمد حسن براہوی کے مقدمے میں اس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بلوچستان میں اردو زبان کے ارتقاء کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

عرب، ایرانی اور بلوچستانی تہذیبوں، ثقافتوں اور زبانوں کا پہلا سنگم قزدار [خضدار] ہی تھا اور لازماً یہیں ایک ایسی زبان کی داغ بیل پڑی جو دلی، آگرہ اور دکن کے وسیع تر اسلامی مراکز میں اردو کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔۲

بلوچستان سے اردو کے لسانی رابطے:

اردو کی پیدائش کے نظریے سے قطع نظر، بلوچستان اردو زبان سے کب روشناس ہوا، اس بارے میں بھی مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ ان مختلف آراء کی بنیاد بعض تاریخی واقعات پر رکھی گئی ہے۔ انعام الحق کوثر کے مطابق بلوچستان سے اردو کے لسانی رابطے مختلف ادوار میں قائم ہوتے رہے جس سے یہاں رفتہ رفتہ اردو کا چلن عام ہوا۔ انھوں نے جن تاریخی واقعات کے حوالے سے یہ ادوار قائم کیے، ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ بلوچستان سے اردو کا پہلا رابطہ اس وقت ہوا جب سولہویں صدی عیسوی میں میر چاکر خان رند اور گہرام خان لاشاری کی سرداری میں ان دو معروف بلوچ قبائل یعنی رند اور لاشاری میں تیس سال تک جنگ لڑی گئی۔ تب ان قبائل کے لوگ بڑی تعداد میں پنجاب اور سندھ کی طرف گئے جہاں ان کا واسطہ اردو سے پڑا۔ چاکر رند کا قبیلہ ملتان اور اس کے قرب و جوار میں آباد ہوا اور وہ خود ساہیوال میں فوت اور سپردِ خاک ہوا۔ اسی طرح ان قبائل کے لوگ اردو سے روشناس ہوئے۔

۲۔ اردو کا دوسرا رابطہ تب ہوا جب اٹھارویں صدی میں خان قلات میر نصیر خان اوّل نے افغان حکمران احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دیتے ہوئے ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی۔ وہ احمد شاہ ابدالی کی فوج کا حصّہ تھے۔ اس بلوچ لشکر کی تعداد پچیس ہزار افراد کے قریب تھی۔ اس وقت مختلف بلوچ قبائل کے لوگ پنجاب میں رہے۔ انہوں نے مرہٹوں کے خلاف پانی پت کی تیسری لڑائی میں فتح پائی۔ اس جنگ میں شرکت کے باعث بلوچ اردو زبان سے واقف ہوئے۔

۳۔ تیسرا رابطہ سید اسماعیل شہید کی تحریک جہاد کے دوران استوار ہوا جب سید احمد شہید قریباً چھ سو ساتھیوں کے

ہمراہ یہاں آئے۔ انہوں نے بلوچستان کے مختلف علاقوں میں جہاد کے لیے تبلیغی اجتماعات کیے۔ ان کا ذریعہ اظہار اردو تھی۔ اس لیے ان حضرات کے طفیل بلوچستان کی فضا اردو زبان سے آشنا ہوئی۔

۴۔ بلوچستان سے اردو کا چوتھا رابطہ انگریز عہد میں قائم ہوا جب وہ ۱۸۷۲ء کے لگ بھگ اس علاقے میں وارد ہوئے۔ صرف آٹھ دس سال کے عرصے میں انہوں نے اس تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ریاست قلات کی حکومت تو برقرار رکھی گئی مگر اس کے اصل حاکم انگریز ہی تھے۔ انگریزوں نے بلوچستان میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ اسی زمانے سے یہاں اردو زبان میں تعلیم و تدریس اور اُردو ادب کا باقاعدہ ارتقاء ہوتا نظر آتا ہے۔۳

حقیقت یہ ہے، کہ اہل بلوچستان سے اردو کے جن اولین رابطوں کا سطورِ بالا میں ذکر ہوا ہے؛ ان میں سے بیشتر ہنگامی نوعیت کے رابطے ہیں۔ یہ رابطے اگر ہوئے بھی ہیں تو یہ کسی جنگ کی تیاری یا جنگ کی حالت میں ہوئے ہیں، سو ان سے کسی زبان کے ارتقاء کی امید محض خوش فہمی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے، کہ اس وقت بلوچستان میں منظم شہری آبادیوں کا فقدان تھا اور زبان کی نشر و اشاعت کی سہولیات موجود نہ تھیں؛ ان حالات میں کسی زبان کی پرورش و پرداخت کا امکان ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہوتا ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے، کہ بلوچستان سے اردو کے لسانی رابطے مذکورہ جنگی رابطوں سے بہت پہلے موجود تھے۔ یہ رابطے ہندوستان کے ان لوگوں نے استوار کیے، جو یہاں بہت پہلے سے بغرض تجارت آتے رہے؛ یہ لوگ نہ صرف بلوچستان آتے، بلکہ اس راستے سے افغانستان اور ایران تک تجارتی قافلوں کی صورت جاتے۔ اس سفر کے دوران ان کو یہاں قیام کا موقع ملتا اور مقامی لوگوں سے گفت و شنید کی راہ نکلتی، جبکہ اہل بلوچستان بھی قدیم وقتوں سے بغرض تجارت ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے تھے۔ وہاں ان میں سے بعض لوگ عارضی اور بعض مستقل رہائش رکھتے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے، کہ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں ہندوؤں کی موجودگی عہد قدیم سے ثابت ہے؛ سبی اور قلات کے نام تک ہندی اثرات رکھتے ہیں۔ اسی طرح زیارت کا معروف پہاڑ کوہِ خلیفت اصل میں کالی پت ہے، جبکہ ہنگلاج میں ہندو مذہب کے قدیم آثار اور بلوچستان کے مختلف علاقوں میں بہت پرانے مندر اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اردو کا چلن یہاں ایک طویل عرصے سے جاری ہے، یہ دو چار صدیوں کی بات نہیں جیسا کہ انعام الحق کوثر کا دعویٰ ہے۔ بلوچستان تاریخ کے مختلف ادوار میں ایران و افغانستان اور ہندوستان کے زیر اثر رہا ہے۔ وہاں اٹھنے والی سیاسی، سماجی اور ادبی لہروں سے اس کا متاثر ہونا یقینی امر ہے۔ اگر تلاش کیے جائیں تو ادب اور تاریخ کے صفحات پر

اس کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔مثلاً ولی دکنی (۱۶۶۸ء۔۱۷۲۵ء) کا ایک شعر ہے:

ولی ایران و توران میں ہے مشہور
وطن گو اس کا گجرات و دکن ہے[۴]

پہلے باب میں بلوچستان کے قدیم ناموں کے حوالے سے بتایا جا چکا ہے، کہ توران بلوچستان ہی کے ایک علاقے کو کہا جاتا تھا۔یہ خضدار اور اس کے نواح کا علاقہ ہے، جو قدیم تاریخوں اور تذکروں میں توران کے نام سے مذکور ہے۔ولی کے شعر میں توران سے مراد بلوچستان ہی ہے؛ ولی جب توران میں اپنی یا اپنے کلام کی شہرت کی بات کرتا ہے تو اس کا اشارہ اسی خطے کی طرف ہی ہے۔ولی کی شہرت اور اس کے شعری اثرات کا ثبوت ہمیں بلوچستان کے پہلے اردو شاعر کے کلام میں ملتا ہے۔گویا یہ بات طے ہے کہ انگریزوں کی آمد سے بہت پہلے بلوچستان میں اردو کے لسانی نشانات ملتے ہیں؛ اور یہاں ایک طبقہ ضرور ایسا موجود تھا جو نہ صرف اردو زبان سے آشنا تھا بلکہ اسے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا ذریعہ بھی بنائے ہوئے تھا۔اس کی سب سے اہم اور مستند مثال ریاست قلات کے وزیراعظم محمد حسن براہوی کی دستیاب ہونے والی اردو شاعری ہے۔

بلوچستان میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر:

دستیاب شواہد کے مطابق محمد حسن براہوی (وفات ۱۸۵۵ء) بلوچستان میں اردو کے پہلے باقاعدہ شاعر ہیں۔وہ دراصل فارسی میں شعر کہتے تھے، جس میں ان کے چار غیر مطبوعہ دیوان بتائے جاتے ہیں؛ اس کے ساتھ ساتھ وہ براہوی میں بھی کم کم شعر کہتے تھے۔ان دونوں زبانوں کے علاوہ اردو میں بھی ان کا کلام موجود ہے۔ان سے پہلے بلوچستان میں اردو شاعری کی کوئی مثال دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔اس لیے انہیں بلوچستان میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔انعام الحق کوثر نے محمد حسن براہوی کا اردو دیوان دریافت کر کے مرتب کیا، جو ۱۹۷۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا۔انعام الحق کوثر کے قیاس کے مطابق محمد حسن براہوی ۱۸۴۷ء میں اپنا اردو دیوان ترتیب دے چکے تھے؛ ان کے اردو دیوان میں ۷۸ غزلیں، دو مخمس، دو ترجیع بند، ایک مستزاد اور کچھ رباعیات شامل ہیں۔جبکہ کل اشعار کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔[۵] حسن براہوی کے موضوعات، غزل کی کلاسیکی روایت کی پیروی میں سراسر عشقیہ اور عشقِ مجازی سے متعلق ہیں۔ان میں محبوب کی سراپا نگاری ایک حاوی رجحان کے طور پر نظر آتی ہے۔اس طرح ان کے کلام پر ولی کے اثرات کی گہری چھاپ نظر آتی

ہے۔حسن براہوی کے کلام سے چند شعری مثالیں ملاحظہ ہوں:

زندگی ہے چو آب تجھ لب کا
منتظر میں چو آب تجھ لب کا
لب ترا روح بخش ہے میرا
روح افزا شراب تجھ لب کا

ترے مکھ نے چھپایا ہے صنم اس چار اشیاء کو
قمر کو ، مشتری کو، شمس کو خورشید اعلا کو
پری رخسار نے تیرے کیا شرمندہ در گلشن
سمن کو یاسمن کو لالہ کو اور پھول رعنا کو

تری قامت قیامت کی علامت
قیامت ہے تری قامت قیامت
نہیں جس دل کو تیرا درد جاناں
اُسی کو تاقیامت ہے ندامت[۶]

انعام الحق کوثر اپنے مقدمے میں ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> محمد حسن کے کلام کا انداز اردو کے پہلے با قاعدہ شاعر ولی دکنی سے ملتا جلتا ہے۔ان دونوں کے مضامین میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ولی کی وہ خوبی جو حاصلِ کلام ہے، وصفِ بت پرستی اور سراپا نگاری سے عبارت ہے۔۔۔ملا محمد حسن ایک اچھے سراپا نگار ہیں۔وہ محبوب کی رفتار وگفتار وکردار کا ایسا دلربا نقشہ کھینچتے ہیں کہ وہ اور ولی دکنی ایک ہی کشتی کے سوار معلوم ہوتے ہیں۔[۷]

یہ درست ہے کہ محبوب اور محبوب سے وابستہ جمالیاتی پیرایۂ اظہار ولی کی شاعری کی اساس ہیں اور یہی چیز محمد حسن براہوی کے کلام میں وافر نظر آتی ہے،مگر یہ کہنا مناسب نہیں ہے، کہ ''وہ اور ولی ایک ہی کشتی کے سوار ہیں''۔ حقیقت یہ ہے کہ ولی اس طرزِ احساس کے موجد ہیں،ان کے بعد کی شعری روایت پر ولی کے گہرے اثرات ہیں؛ محمد

حسن براہوی ان کے رنگِ سخن کے محض ایک پیروکار ہیں۔ وؔلی دکنی کی شاعری سلاست و بلاغت، سادگی، خلوص اور جمالِ محبوب کے اظہار میں جن منزلوں کو چھوتی نظر آتی ہے اور بعض جگہ اس میں جو فلسفیانہ گہرائی پائی جاتی ہے؛ حسن براہوی اس کی گرد کو بھی نہیں چھو سکے۔ یہ سوال ضرور اٹھتا ہے، کہ آخر ان کی شاعری پر وؔلی دکنی کے اس قدر اثرات کیوں ہیں۔ اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے، کہ محمد حسن براہوی کوئی عام شخص نہ تھے؛ وہ ریاست قلات کے وزیرِاعظم تھے، ان کا دہلی آنا جانا تھا۔ ان کے پاس وؔلی دکنی اور کئی دوسرے اردو شعراء کے دیوان موجود رہے ہوں گے۔ وہ ایک بالا دست طبقے کے فرد تھے، انھیں ولی کا نشاطیہ آہنگ پسند آیا ہوگا؛ سو جب انھوں نے اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا تو شعوری طور پر رنگِ ولی کی تقلید کی، جو اس زمانے میں مقبول تھا۔ دیوان ولی کے سندھ آنے اور یہاں اس کی مقبولیت کے شواہد موجود ہیں۔ نبی بخش خاں بلوچ کے مطابق سندھ کے شاعروں کو ولی نے خاصا متاثر کیا تھا۔[۸] انھوں نے ٹھٹھہ سے تعلق رکھنے والے شاعر میر محمود صابر (۱۱۱۰ھ۔۱۱۸۱ھ) کا جو غیر مطبوعہ کلام دیوانِ شوق افزا کے نام سے بازیافت کے بعد شائع کیا ہے؛ اس کے کلام پر نہ صرف وؔلی کے اثرات صاف نظر آتے ہیں، بلکہ وہ کئی جگہ اپنے شعروں میں ولی کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دو شعر ملاحظہ ہوں:

سن ریختہ وؔلی کا دل خوش ہوا ہے صابر
حقا ز فکر روشن ہے انوری کے مانند
گر ریختہ ولیؔ کا لبریز ہے شکر سوں
مضمون شعر صاؔبر قند و شکر تری ہے[۹]

وؔلی گجرات میں نغمہ سنج رہے، جو سندھ کا ہمسایہ ہے اور سندھ بلوچستان کا ہمسایہ ہے۔ گجرات کے وؔلی کی شہرت اور کلام کے اثرات پہلے سندھ اور پھر سندھ کے راستے بلوچستان تک پہنچتے رہے؛ خود ولی نے بھی اپنی شہرت ایران و توران تک پہنچنے کی بات کی ہے، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ صرف شاعرانہ تعلّی نہیں، بلکہ اس میں حقیقت بھی ہے؛ اسی وجہ سے کلام وؔلی کے اثرات محمد حسن براہوی پر مرتب ہوئے، جو اس کے کلام میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

وؔلی اور صاؔبر کے مقابلے میں، حسؔن براہوی کی اُردو شاعری مقدار میں بہت قلیل اور معیار میں کم تر سطح کی سہی، مگر بلوچستان میں اردو شاعری کے ارتقاء میں اپنی اولین حیثیت سے اس کی اہمیت مسلمہ ہے؛ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلوچستان کے پہلے صاحبِ دیوان اردو شاعر ہونے کا سہرا فی الوقت انہی کے سر ہے، عین ممکن ہے ان

سے پہلے یہاں ایسے لوگ موجود رہے ہوں، جو نہ صرف اردو زبان جانتے ہوں، بلکہ اردو میں تخلیقی اظہار پر قدرت بھی رکھتے ہوں؛ ابھی ان کے آثار پردہء اخفاء میں ہوں، جو شاید کبھی سامنے آجائیں۔ جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> محمد حسن کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے صاف اور سادہ ہے۔ اس پر فارسی کا اثر بھی گہرا ہے۔ اس کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بلوچستان کا پہلا شاعر نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے کے شعراء کا کلام یا تو دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا یا کسی نجی کتب خانے کی زینت بنا ہوا ہے اور دریافت کا منتظر ہے۔[۱۰]

جمیل جالبی کے بیان میں صداقت نظر آتی ہے کہ بلوچستان اگرچہ اردو کے اہم ادبی مراکز سے کٹا ہوا علاقہ ہے، مگر اس کے قرب و جوار میں اردو کا چلن قدیم وقتوں سے نظر آتا ہے۔ چاہے وہ پنجاب کا علاقہ ملتان ہو اور یا پھر سندھ کا قدیم شہر ٹھٹھہ ہو؛ ان علاقوں میں اردو زبان وادب کا رواج کافی عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ شاہدہ بیگم کے مطابق سندھ کے مختلف علاقوں میں اردو شاعری کا آغاز سولہویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ انھوں نے اسے سندھ میں قطب شاہ اور ولی دکنی کے عہد سے مماثل قرار دیا ہے۔[۱۱] یہ امر دلچسپ ہے کہ سندھ میں اردو شاعری کے اس اہم دور کے کئی شعراء کا تعلق بلوچ قبائل سے ہے، جو سندھ میں کئی صدیوں سے اقامت گزیں تھے۔ اس سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ محمد حسن براہوی سے قبل بھی بلوچستان میں اردو پڑھنے لکھنے والے لوگ موجود تھے؛ اور یہاں اردو زبان وادب کا اثر ونفوذ انگریزوں کی آمد سے بہت عرصہ پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس کا ایک ثبوت محمد حسن براہوی کا یہ اردو کلام ہے۔

نو آبادیاتی عہد میں بلوچستان میں اردو کا ارتقاء:

بلوچستان میں اردو زبان کا باقاعدہ رواج اور چلن نو آبادیاتی دور میں اس وقت ہوا، جب انگریز اس علاقے پر قابض ہوئے اور انھوں نے اردو کو یہاں کی سرکاری زبان قرار دیا۔ انگریزوں نے بلوچستان میں اردو زبان کو چلن کیوں دیا اور اس کی سرپرستی کیوں کی؛ ان سوالوں کے جواب انگریزوں کی مجموعی حکمت عملی کے پس منظر میں ملتے ہیں۔ انگریز ایک غیر ملک سے وارد ہو کر اس علاقے پر بہ زور شمشیر قابض ہوئے تھے؛ انھوں نے بلوچستان کا انتظام اس وقت سنبھالا، جب انھیں ہندوستان میں حکومت کرتے ہوئے لگ بھگ دو صدیوں سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا۔

انھوں نے ہندوستان میں اپنے اثر ونفوذ اور بہتر حکومت کے لیے جولسانی پالیسی تشکیل دی تھی؛ اس کے مطابق انھوں نے یہاں صدیوں سے رائج فارسی زبان کو دیس نکالا دیا۔ فارسی کی بجائے انھوں نے بظاہر ہندوستانی، مگر دراصل اپنی زبان یعنی انگریزی کی ترویج واشاعت پر زور دیا۔ فارسی چونکہ مسلمانوں کی ادبی، ثقافتی اور علمی زبان کے طور پر مسلمہ حیثیت کی مالک تھی؛ لہٰذا اس قوم کو پوری طرح شکست دینے کے لیے انہوں نے اس زبان کی بالادستی ختم کی۔ فارسی کی بدولت ہندوستان [اس میں بلوچستان بھی شامل تھا] ایران وافغانستان اور دوسرے قریبی مسلم ممالک کے ساتھ ایک لسانی رشتے میں جڑا ہوا تھا۔ اس کی برتری اور نفوذ کے اختتام سے ہندوستان کا اپنے ہمسایہ برادر ملکوں سے ثقافتی، تمدنی اور لسانی تعلق کمزور پڑتا گیا۔ فارسی کی بجائے اردو کو نافذ کرتے ہوئے بھی انگریزوں نے منافقت سے کام لیا۔ اسے رسم الخط اور چند الفاظ کے افتراق کی بناء پر اردو اور ہندی یعنی دو زبانوں کے تنازع میں تقسیم کر دیا گیا۔ اردو مسلمانوں کی زبان قرار پائی اور ہندی ہندوؤں کی۔ اُردو ہندی کے اس تنازعے سے برصغیر کے لوگوں کے دلوں میں آپس کے فاصلے بڑھتے چلے گئے اور انگریز اپنے مقصد یعنی مقامی آبادی کو تقسیم کر کے حکومت کرنے میں کامیاب ہوتے گئے۔۱۲ ہندوستان کے جدید اذہان اور اس کے تعلیم یافتہ طبقے کو زبان کے تنازعے میں الجھا کر سیاسی انتشار میں مبتلا کر دیا گیا؛ کچھ عرصے کے بعد انگریزی ہی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ یوں ہندوستان پر فوجی قبضے کے بعد مغرب کے ثقافتی اور تمدنی غلبے کی راہ ہموار ہوتی چلی گئی، جس کا ایک اہم ذریعہ انگریزی زبان تھی۔ انگریزوں کی یہ لسانی پالیسی ایسی کارگر ثابت ہوئی کہ آج تک پاک وہند کی مقامی زبانیں سیاسی، سماجی اور علمی میدانوں میں عروج حاصل نہ کر سکیں اور انگریزی آج بھی یہاں اپنا اقتدار برقرار رکھے ہوئے ہے۔

انگریزوں کی آمد سے قبل ریاست قلات کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ ریاست قلات ماضی میں بھی ایک خودمختار ریاست نہیں تھی۔ یہ پہلے ایران اور بعد میں افغانستان کے حکمرانوں کے ماتحت تھی۔ ان ممالک کے زیر اثر یہاں کی دفتری اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ ان ممالک سے تمام تر تحریری امور فارسی میں ہی نبٹائے جاتے تھے۔ انگریزوں نے پہلے پہل بلوچستان کے جن علاقوں پر قبضہ کیا، ان میں کوئٹہ، ژوب، لورالائی، سبی، ڈیرہ بگٹی، کوہلو اور پشین وغیرہ شامل تھے۔ اس تمام علاقے کو 'برٹش بلوچستان' کا نام دیا گیا، جبکہ ریاست قلات بظاہر پرانے بندوبست کے مطابق یعنی خان آف قلات کے زیر انتظام رہی؛ مگر اس کا اصل اقتدار انگریزوں کے پاس تھا۔ انگریزوں نے برٹش بلوچستان میں دفتری کارروائی کے لیے اردو زبان کو رائج کیا؛ تمام سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو بروئے کار آنے لگی۔ بلوچستان میں اردو کے نفاذ کے لیے الگ سے قانون سازی نہیں کی گئی، بلکہ اسے ''عدالت چیف کورٹ پنجاب کے قواعد واحکام'' کے

زمرے میں اختیار کیا گیا۔ جس کے مطابق:

> زبان عدالت ہائے فوجداری نمبر ۱۰۳ بموجب احکام دفعہ ۱۵۵۶ ایکٹ (۱)، ۱۸۸۲ء مجموعہ ضابطہ فوجداری نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر یہ قرار دیتے ہیں کہ اس علاقے کے اندر جس پر پنجاب گورنمنٹ حکمران ہے۔ عدالت ہائے فوجداری کی زبان اردو متصور ہوگی۔ [۱۳]

اس حکم نامے کے تحت بلوچستان میں، جو انگریزوں کی پنجاب گورنمنٹ کے ماتحت تھا، سرکاری طور پر اردو نافذ کر دی گئی اور تمام دفتری امور اردو میں نمٹائے جانے لگے۔ بلوچستان کا دارالخلافہ یعنی کوئٹہ، انگریزوں کی آمد سے پہلے ریاست قلات کی ایک سرحدی چوکی تھا؛ اس سے قندھار اور درہ بولان کو جانے والے راستوں پر دیدبان کا کام لیا جاتا تھا۔ انگریزوں کی آمد کے کچھ عرصہ بعد، یعنی ۱۸۸۲ء میں، اس علاقے میں جدید تعلیم کا پہلا ادارہ سنڈیمن اینگلو ورنیکلر مڈل سکول کھولا گیا؛ جس میں اردو اور دیگر مضامین کی تدریس شروع ہوئی۔ [۱۴]

غیر مقامیوں کی آمد:

بلوچستان میں اردو زبان کا رواج صرف سرکاری اداروں تک محدود نہ تھا۔ اس میں ایک اہم عنصر غیر مقامی آبادی کی سکونت بھی شامل ہے۔ جب انگریزوں نے جب کوئٹہ، ژوب، لورالائی، سبی اور کچھ دیگر علاقوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور شہر بسائے، تو ان میں مختلف نوعیت کے کاروبار اور صنعت وحرفت کے نئے شعبے اور مواقع بڑی تعداد میں پیدا ہوئے۔ پنجاب اور متحدہ ہندوستان کے دیگر علاقوں سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد فوجی ملازمت کے علاوہ دیگر سول ملازمتوں اور بہتر کاروبار کی غرض سے آئی، جن میں مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی سبھی شامل تھے۔ ان میں اردو اور پنجابی بولنے والوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد تھی۔ ان نئے آنے والوں کا مقامی لوگوں سے رابطہ ہوا، تو اس میں اردو نے معاونت کی۔ اس لسانی رابطے سے بلوچستان میں اردو زبان کے فروغ کو مدد ملی اور رفتہ رفتہ مقامی لوگ بھی اردو بولنے لگے۔ مختلف زبانوں کے لوگ آپس میں اردو ہی بولتے اور اس میں تبادلۂ خیال کرتے کہ یہ ایک مشترکہ زبان تھی۔ اس طرح اردو نے یہاں آہستہ آہستہ لنگوا فرانیکا کی حیثیت حاصل کر لی۔ جو اسے آج تک حاصل ہے۔ آج بھی براہوی، بلوچ، پٹھان اور ہزارہ قبائل کے لوگ آپس میں اور مستقل سکونت پذیر غیر مقامی آبادی سے زیادہ تر بات چیت اردو میں ہی کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ انگریزوں کے بہت سے مقامی ملازم اردو لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے۔ انگریزوں نے جب

بلوچستان کی مقامی آبادی یعنی بلوچ پشتون قبائل، اس سرزمین کے جغرافیائی خدوخال، موسموں اور دوسری کیفیات اور یہاں کی تاریخ وثقافت پر انگریزی میں لکھنے کا آغاز کیا تو ان کی دیکھا دیکھی اردو جاننے والوں نے اردو میں ایسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مثلاً لالہ ہتورام نے اردو میں اپنی کتابیں گل بہار ۱۸۷۱ء بلوچی نامہ ۱۸۷۵ء اور تاریخ بلوچستان ۱۹۰۷ء میں تصنیف کیں (ان کی تفصیل آگے آئے گی)۔ اس طرح ذاتی خط وکتابت اور دفتری مراسلت بھی اردو میں ہونے لگی۔

دفتری اردو کے آثار:

بلوچستان میں اردو کے جو ابتدائی دفتری مراسلات دریافت ہوئے ہیں وہ عموماً عدالت میں درج کیے گئے مقدمات وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اس قسم کا ایک دفتری مراسلہ جو ۱۸۸۷ء میں لکھا گیا یہاں پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس عہد کی تحریری اردو ملاحظہ کی جا سکے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بیشتر جو لوگ یہاں اردو زبان میں دفتری امور نبٹاتے تھے۔ انہیں اس زبان پر کیسا عبور حاصل تھا۔

بحضور جناب قاضی محمد جلال الدین خان صاحب تحصیل دار پشین

سید تمر ولد سید شیر وقوم سید سکنہ موضع پائیند علاقہ پشین - مدعی

بنام

سید محمد حسن ولد سید پائیند ذات شکرزئی، سکنہ ایضاً - مدعا علیہ

دعوی ملکیت اراضی خشکابہ مالیتی ۷۵ روپے

واقع موضع سید پائیند علاقہ پشین

جناب عالی

مدعی حسب ذیل عارض ہے:

۱۔ اراضی متنازعہ خشکابہ ہے اور مدعی باپ دادا سے قابض ہے۔ اس کو کاشت کرتا آیا ہے۔ محصول سرکار معاف ہے۔ حق ملکیت وملکی بھی کسی کو نہیں دیا جاتا۔

۲۔ مدعا علیہ زبردست ہے۔ ۲ سال ہوئے کہ مدعی ہندوستان بتقریب سوداگری گیا ہوا تھا۔ مدعا علیہ نے عدم موجودگی مدعی کے قلبہ رانی کر کے قبضہ کر لیا۔ سال گزشتہ جب مظہر مدعی

واپس آیا اورعندالتحریر سخت بیمار ہوگیا تب سے مدعا علیہ نے کاشت کیا۔ اب پھر قلبہ رانی شروع کر دی ہے۔ مدعا علیہ کا کچھ غرض نہیں صرف سینہ زوری سے قبضہ کرتا ہے۔ امیدوار ہوں کہ مدعی کی حق رسی فرمائی جاوے۔

۳۔ ۲ سال ٹکڑہ اراضی خشکابہ جو بلا اشتراک ہے جملہ باشندگان حصہ دار ہیں اس میں بھی مدعی علیہ حصّہ نہیں دیتا۔

مورخہ یکم فروری ۱۸۸۷ء

از عدالت

آج یہ عرضی مدعی نے عالت ہذا میں پیش کی لہٰذا حکم ہوا کہ

مقدمہ درج رجسٹر کیا جاوے۔ مدعا علیہ باخذ طلبانہ باجرای سمن

ضابطہ طلب کیا جاوے مقدمہ ۷ فروری ۱۸۸۷ء پیش ہووے۔ [15]

دستخط الرقوم یکم فروری ۱۸۸۷ء

اس بات سے قطع نظر کہ اس تحریر کے لکھنے والے مقامی افراد تھے یا باہر سے آ کر یہاں رہائش رکھنے والے لوگ تھے یہ لوگ عمدہ اردو لکھنا جانتے تھے اور اس میں تمام مسائل کو پیش کرنے کی دسترس رکھتے تھے۔ اس درخواست کے اسلوب میں کچھ نکتے ایسے ہیں جو اردو کے بلوچستانی لہجے کو نمایاں کرتے ہیں مثلاً بتقریب سوداگری، باپ دادا سے قابض ہے، اور سینہ زوری سے قبضہ کرتا ہے۔ ایسے الفاظ اور جملے ہیں جو بلوچستان میں بولی جانے والی اردو میں آج بھی سننے کو ملتے ہیں۔ یعنی اس دور کی ابتدائی تحریروں میں بھی اردو کے مقامی لہجے کی جھلک نظر آتی ہے۔

مشاہیر اردو کی آمد:

انگریزوں کے زیرِ انتظام آنے کے بعد بلوچستان میں عام ہندوستانیوں کے علاوہ بعض مشاہیر اردو کی آمد کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ نہ صرف ان کی آمد کا بلکہ یہاں ان کے قلمی نقوش بھی دستیاب ہوئے ہیں یا اس بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے۔ ایسے معروف لوگوں میں امراؤ جان ادا کے مصنف مرزا محمد ہادی رسوا، علامہ اقبال، مولوی عبدالحق، عبدالرحمن بجنوری، مولانا ظفر علی خان، نسیم حجازی اور بعض دیگر لوگ شامل ہیں۔ انہیں آزادی سے قبل مختلف اوقات میں بلوچستان آنے اور یہاں رہنے کا موقع ملا۔ مرزا رسوا کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنا

معروف ناول امراؤ جان ادا بلوچستان میں ہی لکھا تھا[اس کی تفصیل آگے آئے گی]۔علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا اللہ اپنی ملازمت کے دوران کچھ عرصہ ژوب میں تعینات رہے۔ جہاں ان پر ایک مقدمہ بن گیا تھا۔اقبال ان کی دادرسی کے لیے۱۹۰۳ءمیں ژوب (فورٹ سنڈیمن) آئے تھے۔[16] اقبال نامے میں ایک خط شامل ہے جو ژوب سے لکھا گیا تھا۔نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام لکھے گئے اس خط میں اقبال لکھتے ہیں:

مخدوم ومکرم خان صاحب!

السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ لاہور ہوتا ہوا مجھے یہاں ملا۔ میں ایک مصیبت میں مبتلا اس وقت لاہور سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر برٹش بلوچستان میں ہوں۔آپ بھی خدا کی جناب میں دعا کریں کہ اس کا انجام اچھا ہو۔آپ کا خط حفاظت سے صندوق میں بند کر دیا ہے۔نظر ثانی کے وقت آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاؤں

گا۔اگر میری ہر نظم کے متعلق آپ اس قسم کا خط لکھ دیا کریں تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا۔

آپ کا اقبال

از فورٹ سنڈیمن، برٹش بلوچستان[17]

۱۵۔مئی ۱۹۰۳ء

مولوی عبدالحق قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں کوئٹہ آتے رہے۔ بعد کے سالوں میں کوئٹہ سے لکھے گئے ان کے چند خطوط ملتے ہیں۔قیام پاکستان سے قبل ان کا کوئی خط تو نہیں مل سکا مگر ان کی ایک تحریر ایسی ہے جو کوئٹہ میں قیام پاکستان سے قبل لکھی گئی ہے، یہ وہ مقدمہ ہے جو انہوں نے باغ و بہار کو مرتب کرتے ہوئے لکھا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا انہوں نے باغ و بہار کی تدوین وترتیب کوئٹہ میں کی یا اس کا کوئی حصّہ یہاں مرتب کیا۔تاہم یہ امر واضح ہے کہ انہوں نے ترتیب کے بعد اس کا مقدمہ کوئٹہ میں اپنے قیام کے دوران لکھا۔ان کے لکھے ہوئے مقدمے کے آخر میں نام کے نیچے کوئٹہ ۱۹۳۲ء لکھا نظر آتا ہے۔ یہ مقدمہ ان کے مرتب کردہ باغ و بہار کی متعدد اشاعتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔[18]

بلوچستان میں اردو نثر:

بلوچستان میں انگریز دور میں اردو میں باضابطہ کام کرنے والوں میں سرفہرست نام لالہ ہتورام کا ہے۔ ان کی تحریر کردہ کتابیں بلوچستان میں اردو کے اولین آثار میں سے ہیں۔ ان کا سارا کام بلوچستان کی زبان، ثقافت اور تاریخ سے متعلق ہے۔ ذیل میں ہتورام کا مختصر تعارف اور ان کی کتب کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

لالہ ہتورام:

ہتورام تحصیل راجن پور ضلع ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے تھے۔ اس وقت یہ علاقہ بلوچستان میں شامل تھا۔ اس لیے خود کو بلوچستانی لکھتے تھے۔ محکمہ اسسٹنٹی سب ڈویژن راجن پور میں ملازم تھے۔ بلوچی زبان لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ رابرٹ سنڈیمن جب پہلی بار ریاست قلات کی طرف آیا تو یہ ان کے ساتھ تھے اور مقامی لوگوں کے ساتھ گفت وشنید میں اس کے مددگار و معاون بنے۔ پھر ترقی پا کر سی آئی ای چیف نیٹو اسسٹنٹ ایجنٹ گورنر جنرل بلوچستان کے عہدے تک پہنچے اور رائے بہادر کا خطاب پایا۔ وہ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۷۵ء تک راجن پور اور اس کے بعد یعنی ۱۸۹۶ء تک بلوچستان میں ملازمت کرتے رہے۔[19] ابتداء میں جب انگریزوں نے بلوچی زبان اور بلوچستان کے بارے میں انگریزی میں کتابیں لکھیں، اُن کی تقلید میں لالہ ہتورام نے یہی کام اُردو میں کیا۔ دستیاب شواہد کے مطابق ہتورام کی کتابیں بلوچستان میں اردو نثر کا نقطہ آغاز ہیں۔

اردو نثر کا نقشِ اول:

انعام الحق کوثر نے بلوچی نامہ کو ہتورام کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے[20]، جو درست نہیں۔ ہتورام کی پہلی تصنیف گل بہار ہے۔ یہ ۱۸۷۱ء کے لگ بھگ لکھی گئی جب کہ بلوچی نامہ ۱۸۷۵ء میں مکمل ہوئی۔ انعام الحق کوثر کی کتاب بلوچستان میں اردو میں گل بہار کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری یا انھوں نے اسے بہ نظر غائر نہیں دیکھا، کیونکہ بلوچی نامہ کے دیباچے میں گل بہار اور اس کے سالِ تصنیف کا تذکرہ موجود ہے۔ ہتورام لکھتے ہیں:

> بعد چندے جب راقم کچھ ماہر ہوگیا۔ اشتیاق ترتیب، قواعد زبان ہذا کا پیدا ہوا۔ چنانچہ سال ۱۸۷۱ء میں بہ وقت تصنیف کتاب گل بہار متضمن تواریخ ضلع ہذا و سرحد بلوچستان

درباب تالیف بلوچی نامہ ہذا وعدہ دیا گیا تھا۔لیکن بہ سبب نہ دیکھنے چنداں شوق باحدی بندہ خاموش رہا۔[۲۱]

یعنی انہوں نے گل بہار کی تالیف کے دوران ہی بلوچی نامہ کی تحریر کا وعدہ کیا تھا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوچی نامہ کی تصنیف سے چار پانچ برس قبل وہ گل بہار لکھ چکے تھے۔شاید انعام الحق کوثر نے یہ دیباچہ بھی پوری توجہ سے نہیں پڑھا،ورنہ وہ گل بہار کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے۔

گل بہار:

اس کتاب کا پورا نام گل بہار ، بلوچ قبائل ہے اور یہ لالہ ہتورام کی پہلی تصنیف ہے۔مقالہ نگار کے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو ۱۹۸۲ء میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے شائع کیا۔اس پر پہلے ایڈیشن کی تاریخ ۱۸۶۲ء دی گئی ہے، جو درست نہیں۔اس کتاب پر نظر ثانی کے طور پر عزیز محمد بگٹی کا نام ہے، حالانکہ اس پر کوئی نظر ثانی نہیں کی گئی ؛ اس میں الفاظ کا وہی پرانا املا ہے، جو آج متروک ہو چکا ہے، مثلاً بھی ، پھل اور دیکھے کا املا بالترتیب ''بہی ، پہل اور دیہکے'' لکھا گیا ہے۔اس کے آغاز میں عزیز محمد بگٹی کا مختصر سا دیباچہ لکھا ہوا ہے، جس میں وہ اس کی دوبارہ اشاعت کی وجہ اس کی تاریخی اہمیت قرار دیتے ہیں۔کتاب کے آخری صفحے پر لالہ ہتورام نے کتاب کا سن تصنیف ۱۲۹۰ھ بمطابق ۱۸۷۱ء دیا ہے یہ کتاب کے آخری صفحے پر لکھی گئی منظوم اردو و فارسی قطعہ تاریخ کے عین نیچے مندرج ہے۔[۲۲] ہتورام نے اپنی کتاب تاریخ بلوچستان میں اس کتاب یعنی گل بہار بلوچ قبائل کا سن اشاعت ۱۸۷۰ء دیا ہے۔اس کتاب کے آخر میں چار صفحات میں اغلاط و ترامیم کی گئی ہیں۔

گل بہار کے آغاز میں مصنف کا تحریر کردہ مختصر دیباچہ ہے۔اس میں سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب کے سرکلر نمبر ۱-۳ مورخہ ۲ جنوری ۱۸۶۹ء کا حوالہ دیا گیا ہے، جس میں اس وقت کے کمشنر وغیرہ کو اس علاقے کے حالات کے بارے لکھنے کو کہا گیا تھا۔مسٹر بروس نے اس پر تعمیل کرتے ہوئے ایک کتاب لکھی تھی۔ ہتورام چونکہ انگریز سرکار کا ملازم تھا۔اسے بھی اس علاقے کے مختلف حالات واقعات اور تاریخ سے آگاہی ہوئی۔اس نے پنجاب کی سرحد پر واقع علاقے میں رہائش پذیر مختلف بلوچ قبائل ان کی اصلیت اور ان کے ساتھ ساتھ ریاست قلات کے بعض اہم بلوچ قبائل کے حوالے سے اردو میں یہ کتاب تصنیف کی۔جس کا مقصد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب سے ریاست قلات [موجودہ صوبہ بلوچستان] کے حالات اور تاریخ سے انگریزی حکومت کے کارندوں کو معلومات فراہم کی

جائیں۔ گویا یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو ہندوستان بھر کے مختلف علاقوں میں یہاں کے رسم ورواج، شہروں کی تہذیب، علاقوں کا احوال اور قبیلوں کے کوائف کے بارے میں انگریزوں کی پالیسی کا حصّہ تھی۔ گل بہار میں معروف بلوچ قبائل کے کوائف اور انگریزوں سے ان کی اولین ملاقاتیں، مراسم، تعلقات اور آمدورفت کے حالات مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب انیسویں صدی کے آخری ربع میں شائع ہونے کی بنا پر علمی وادبی حوالے سے اُردو کے اہم آثار میں شامل ہے۔ مگر اردو نثر کے ارتقاء کے تحقیقی وتنقیدی مطالعات میں اسے یکسر نظرانداز کیا گیا ہے۔ پاکستان میں اردو نثر کی تاریخ پر قلم اٹھانے والے یا تو ان کتب سے واقف نہیں اور یا انہوں نے جان بوجھ کر اسے نظرانداز کیا۔ اس کی وجہ جو بھی ہو ہتورام کی ان کتابوں اور اس کی اردو نثر سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ جبکہ مابعد نوآبادیاتی مطالعات میں ایسی کتب کی افادیت مسلمہ ہے۔ بلوچستان میں اردو ادب بالخصوص اردو نثر کی تاریخ میں ان کتب کو اولیت کا اعزاز حاصل ہے۔ اس لیے گل بہار کا تجزیاتی مطالعہ یہاں بہ تفصیل پیش کیا جاتا ہے۔
ہتورام نے کتاب کے دیباچے میں اس کے نام کی جو وجہ تسمیہ لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر بے ساختہ باغ و بہار کے مصنف میر امن کا دیباچہ یاد آجاتا ہے۔ ایک قدر مشترک ان دونوں کتابوں کے ناموں میں لفظ بہار کی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ دونوں کتابیں بالکل الگ ہونے کے باوجود ہتورام کی تحریر پر میر امن کے داستانی اسلوب کے اثرات صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہتورام لکھتے ہیں:

> نام اس کتاب کا گل بہار تجویز ہوا۔ یہ گل چار چمن میں کھلا جس میں سولہ گل معہ چند برگ اور دو چار مختلف رنگ اور مختلف خوشبودار شگفتہ ہیں چنانچہ اہل علم کو سیر اس گلزار سے صداقت اس امر کی ہوگی۔ ازانجا کہ راقم کو مدت سے شوق بنانے باغیچہ کا دامن گیر ہو رہا تھا۔ سوشکر الحمداللہ صد والمنۃ کہ مراد دلی برآئی۔ ظاہراً کہ جو لوگ باغ بناتے ہیں دو امید کے واسطے اول ناموری دوم منفعت۔ سو جب یہ گل ہمارا کامل ہوگیا یقین ہے کہ ہماری دونوں امیدیں اسی سے حاصل ہوں گی۔ اور یہ گل اور لوگوں کے باغات سے بعض باتوں میں فوقیت رکھتا ہے۔ کیا معنی کہ لوگوں کے باغ موسم بہار میں شگفتہ اور خزاں میں اجاڑ ہو جاتے ہیں۔ یہ گل ہمیشہ سرسبز اور شگفتہ رہے گا۔[۲۳]

درج بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف نہ صرف میر امن کی باغ و بہار سے آشنا ہے۔ بلکہ وہ

اس سے اتنا متاثر ہے کہ اس کے اسلوب کی تقلید کرتا ہے۔ پہلی سطر کا جملہ 'یہ گل چار چمن میں کھلا' بتا تا ہے کہ یہ کتاب زمانہ قدیم کے انداز میں چار فصلوں میں منقسم ہے۔ ہر فصل میں ابواب کی تعداد میں فرق ہے۔ ہر باب کو گل اور ذیلی ابواب کو برگ کا نام دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں دیئے گئے دو مختصر ابواب کو دو خار کا نام دیا گیا ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے موضوع کے منفی نکات بیان کیے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو پیش کش اور طریقہ کار کی نیرنگی اس کتاب کے آغاز میں ہی ابواب کی تقسیم سے نظر آ جاتی ہے۔ اور لکھنے والے کے ہنر، سلیقہ اور اپنے موضوع سے لگاؤ کا حال بیان کرتی ہے۔

مصنف کی زبان سے شکر الحمداللہ کا کلمہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ لکھنے والا اگر چہ ہندو ہے مگر وہ جس علاقے اور سماج میں رہتا ہے وہاں کی اکثریت مسلمان ہے۔ وہ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی اپنے کام کی تکمیل پر مذہباً نہیں بلکہ رواجاً کلمہ تشکر بجا لاتا ہے۔ باغ و بہار کی تقلید میں وہ اپنی کتاب کو ایسا باغ قرار دیتا ہے جو ہمیشہ سرسبز اور شگفتہ رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ میر امن کی باغ و بہار سے اردو پڑھنے لکھنے والا ہر شخص بخوبی واقف ہے مگر ہتو رام کی گل بہار کے نام سے بھی اکثریت آگاہ نہیں ہے۔

گل بہار بنیادی طور پر ضلع و شہر ڈیرہ غازی خان اور اس کے اطراف کی بستیوں اور وہاں رہائش پذیر قبائل کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ انگریز جب پنجاب پر قابض ہوا تو ڈیرہ غازی خان اس طرف سرحد پر واقع آخری علاقہ تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں افغانستان پر قبضے کے لیے جانے والی انگریز فوج کا گزر بلوچ خطے یعنی ریاست قلات اور دیگر علاقوں سے ہوا۔ اس دوران بلوچ قبائل سے انگریز فوج کی کئی لڑائیاں بھی ہوئیں اور ان کے ساتھ تصفیے بھی کیے گئے کہ ان کا مطمع نظر بہر حال افغانستان پر قبضہ تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان پر بیرونی نظریں گزشتہ دو سو سال سے مرکوز رہی ہیں۔

گل بہار کے ابتدائی باب کا آغاز ڈیرہ غازی خان اور اس کے اطراف کی قدیم تاریخ کے بیان سے ہوتا ہے۔ مصنف کے خیال میں ان اطراف میں زمانہ قدیم میں ہندو راجاؤں کی حکومت رہی ہے۔ اس نے ایک راجہ کا نام ہرناکس بتایا ہے۔ بلوچستان کے شہر زیارت کی اترائی میں ایک شہر ہرنائی کے نام سے آج بھی آباد ہے۔ ہتو رام کی بتائی ہوئی قدیم ریاست ہرناخس یا ہرناکیھس اور ہرنائی میں جو صوتی اور صوری مشابہت ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ قیاس ہے کہ ہرنائی دراصل ہرناکیھس کی موجودہ شکل ہے۔

دوسرے باب میں ڈیرہ غازی خان کی چار تحصیلوں ڈیرہ غازی خان، سنگھڑ، حسام پور، راجن پور اوران کے اطراف کے دیہات کا احوال رقم کیا گیا ہے اور یہاں کے سرکردہ افراد کا شجرہ نسب لکھا گیا ہے۔ بعض بستیوں کے نام کی وجہ تسمیہ بھی بتائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پیدا ہونے والی فصلوں اور موسم کا حال تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ منگھر وٹہ تحصیل کے ضمن میں اس علاقے کے ایک معروف روحانی بزرگ سخی سرور کا تذکرہ مع ان کے شجرے کے دیا گیا ہے۔ اوراس مزار پر منعقد ہونے والے سالانہ میلے کا احوال بھی رقم کیا گیا ہے۔ یہ میلہ آج بھی منایا جاتا ہے۔

تیسرے باب میں اس ضلع کا حدودداربعہ، نقشہ، ہیئت ضلع اور اطراف کے پہاڑوں اور قبائل کا حال ذیلی ابواب میں تقسیم کر کے بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ڈیرہ غازی خان شہر کی آبادی اور اطراف کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ فصل دوم جسے چمن کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس میں چار ابواب کے تحت بلوچستان کے اہم قبائل کی تاریخ، ان قبائل کی آپس میں تقسیم، نئے قبائل کا ظہور، سرداروں کا حال اوران کا شجرہ نسب بہ تفصیل بیان کیا گیا ہے۔

فصل چہارم بھی چار ابواب میں تقسیم ہے۔ اس میں بلوچستان کی آمدنی، خرچ کی تفصیل، مکمل انتظام کی صورت حال، پولیس اور عدالت کا حال تعلیمی مدرسہ جات کا بیان، جنگی انتظام اور آئینی و قانونی بندوبست پر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں اردو اور فارسی میں کتاب ہذا کی تاریخ پر مشتمل قطعہ تاریخ ہے۔ جس کے مطابق یہ ۱۲۹۰ھ بمطابق ۱۸۷۱ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

اسلوب:

ہتورام نے گل بہار داستانوی اسلوب میں تحریر کی ہے۔ اس کے جملوں کی ساخت اسی قدیم طرز کی ہے۔ اس میں جا بجا عربی و فارسی کی تراکیب ملتی ہیں۔ فارسی کے بہت سے اشعار نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسے لفظ بھی ملتے ہیں جو اردو میں کم مستعمل ہیں مگر بلوچستان کی مختلف زبانوں میں آج بھی عام استعمال ہوتے ہیں۔ ہتورام کے اسلوب کی ایک مثال دیکھیے:

> سخی سرور اہل فقر اور صاف باطن تھے براہ خدا انہوں نے بہت محنت اٹھائی، سبب شہرہ آفاق ہونے کا یہ ہے کہ ان کے دروازہ پر تین شخص بیمار ایک مجذوب یعنی کھوڑا دوسرا نابینا تیسرا غین

یعنی نامرد سائل شفایابی کے آئے۔ حق تعالیٰ نے ان کو شفا بخشی سب درست چاغ ہو گئے۔[۲۴]

''چاغ''، پشتو الاصل لفظ ہے اور بلوچستان کی پشتو اور اردو روزمرہ میں آج بھی مستعمل ہے۔ اس مختصر اقتباس سے ہتورام کے اسلوب کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ انہیں اردو زبان پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ ان کا جملہ سازی کا انداز داستانوی ہے جو تاریخ کی کسی کتاب کے لیے مناسب نہیں۔ اگر یہ مدِنظر رکھا جائے کہ یہ کتاب آج سے قریباً ڈیڑھ سو سال قبل بلوچستان کے ایک رہائشی نے لکھی ہے، جب اس وقت یہاں اردو زبان بولنے والے لوگ بہت کم تھے تو قاری اس کتاب کی خوبیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کی تاریخ پر کام کرنے والے محققین کے لیے یہ کتاب ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں کئی ایسے واقعات درج ہیں جو بلوچستان کی تاریخ میں اہم حیثیت رکھتے ہیں اور آج بھی مؤرخین کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

کتاب بلوچی نامہ:

بلوچی نامہ پہلی بار ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس کا نام کتاب بلوچی نامہ لکھا ہے۔ بعد کی اشاعتوں میں صرف بلوچی نامہ ملتا ہے مقالہ نگار کے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۸۹۶ء میں مطبع مفید عام لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اسے بلوچی زبان کی تعلیم کی غرض سے شائع کیا گیا تھا۔ انگریزوں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے بلوچوں سے واسطہ پڑا تھا لہٰذا ان سے بہتر روابط رکھنے کی خواہش کے پیش نظر بلوچی زبان سیکھنا لازمی قرار پایا تھا۔ اس لیے اس کی اشاعت مفید سمجھی گئی تھی۔ واضح رہے کہ یہ اردو میں بلوچی زبان وقواعد پر لکھی گئی پہلی کتاب ہے۔ اس سے قبل انگریزی میں بلوچی قواعد پر لکھا جا چکا تھا۔ ہتورام کو ایک تو بلوچوں کے ساتھ رابطے کی بناء پر بلوچی سے براہ راست واقفیت ہوئی۔ دوسرا وہ ان انگریز افسران کے ماتحت رہا تھا جو نہ صرف بلوچی زبان جانتے تھے بلکہ اس کے اصول وقواعد پر خود بھی تحقیق وتصنیف میں مصروف تھے۔ ان انگریز افسروں کی حوصلہ افزائی اور ایما پر ہی اس نے یہ کتاب اردو میں لکھی تھی۔ اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے ہتورام دیباچے میں لکھتا ہے:

> یہ کمترین بخدمت ہر چار صاحبان مقدم الوصف دریافت ماہیت وانکشاف اصلیت زبان ہٰذا میں شامل رہا۔ اس بحرِ بے کنار سے جیسا جیسا گوہر مقصود کا ہاتھ لگتا گیا بطور یادداشت جمع

کرتا گیا۔ اب حسب الارشاد مسٹر گلیڈ سٹون صاحب بہادر و بفرمائش پرزیبائش صاحب
سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب ان اجزاءِ مختلفہ کو حسب ناقص عقل خود بقرینہ موافق ترتیب دے کر
یہ بلوچی نامہ تصنیف کیا۔[۲۵]

بلوچی نامہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں بلوچی الفاظ کے اردو اور فارسی معنی دیے گئے ہیں ۔ یہ معنی فارسی میں زیادہ ہیں اردو میں کم۔ اس میں پہلے انسانی رشتوں کے بلوچی الفاظ دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد حیوانات، نباتات، ملبوسات، اسلحہ کے نام، اشیائے خورد و نوش اور دیگر متفرق الفاظ دیے گئے ہیں جو عام استعمال ہونے والے بلوچی الفاظ ہیں۔

دوسرے باب میں مختلف افعال کی گردانیں دی گئی ہیں۔ پھر سوال و جواب کی صورت میں روزمرہ گفتگو دی گئی ہے۔ ایک طرف بلوچی جبکہ اس کے سامنے فارسی جملہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بلوچی شاعری سے کئی مثالیں دے کر ان کے نیچے اردو میں جملوں کے سادہ اور رواں معنی دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد بلوچی میں چند قصے کہانیاں شامل کیے گئے ہیں۔

تیسرے باب میں بلوچ اور براہوی قبائل کا مختصر تاریخی احوال رقم کیا گیا ہے۔ تمام عبارتوں میں اس امر کا خیال رکھا گیا ہے کہ ان میں بلوچی ثقافت اور رسم و رواج کے اہم عناصر شامل کیے جائیں تاکہ پڑھنے والے کو زبان کے ساتھ ساتھ بلوچی ثقافت سے بھی آگاہی حاصل ہو۔

چوتھے اور آخری باب میں بلوچی اور فارسی کا لغت مرتب کیا گیا ہے جو کل ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

اسلوب:

بلوچی نامہ میں فارسیت کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے جبکہ اردو بہت کم استعمال کی گئی ہے۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی تھی جب اردو میں اس طرح کا کوئی کام سرے سے ناپید تھا۔ اس میں اگرچہ کئی خامیاں پائی جاتی ہیں مگر اپنے وقت میں یہ بلوچی زبان سیکھنے کے لیے ایک اہم کتاب تھی۔ آج اس کی تمام تر اہمیت لسانی سے زیادہ تاریخی ہے۔

تاریخ بلوچستان:

لالہ ہتورام کی تصنیف تاریخ بلوچستان اردو میں بلوچستان کی پہلی باقاعدہ تاریخ ہے۔ یہ کتاب پہلی

بار ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیام پاکستان تک اردو میں بلوچستان کی تاریخ پر کوئی دوسرا کام سامنے نہیں آیا البتہ قیام پاکستان کے بعد بلوچستان کے مختلف اہل قلم نے اردو اور انگریزی میں بلوچستان کی کئی تاریخیں لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض میں ہتورام کی تاریخ بلوچستان سے استفادہ بھی نظر آتا ہے۔ اس میں بیان کیے گئے واقعات کے حق اور رد میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب ۵۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل اور اس کے چار ابواب ہیں۔ اس کا دیباچہ مصنف کے قلم سے ہے، وہ اس کتاب کے لکھنے کی غرض بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک تو وہ خود بلوچستان کے رہنے والا ہے [مصنف کا تعلق راجن پور سے تھا تب یہ علاقہ بلوچستان کا حصّہ تھا]۔ دوئم انگریز سرکار میں نوکری کی وجہ سے اس کا یہاں کے سیاسی حالات واقعات سے براہ راست رابطہ رہا لہٰذا اس نے بلوچستان کی تاریخ پر یہ مبسوط کتاب قلم بند کی۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے تاریخ بلوچستان چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا آغاز رند بلوچ سرداروں کے شجرہ نسب سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس قوم کی بلوچستان میں آمد کا حال بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق یہ عرب کے علاقے حلب سے دو طبقوں یعنی رند بلوچ اور اقوام براہوی کی صورت میں یہاں وارد ہوئے۔ ان معلومات کے لیے بلوچ روایات پر تکیہ کیا گیا ہے۔ ان سے اس قوم کی قدامت اور بعض تاریخی واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد بلوچستان کے معروف علاقے اور ریاست قلات کے صدر مقام قلات کی تاریخ بیان کی گئی ہے مصنف نے قلات میں کالی دیوی، مستونگ میں مہادیو اور شال [کوئٹہ کا پرانا نام] میں سادھ جوگی پانی نتھ کی بابت ہندی یعنی اردو میں ایک قدیم شعر کا حوالہ بغیر شاعر کے دیا ہے۔ وہ شعر یوں ہے:

کالی دسے قلات میں مہادیو مستونگ
بڈھڑا جوگی شال میں پانی ناتھ بلوچ [۲۴]

تاریخ بلوچستان کا دوسرا باب قریباً ایک سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتداء میں ہتورام نے ریاست قلات پر براہویوں کی حکومت کے بارے لکھا ہے، ان کے بقول براہویوں کی حکومت کا آغاز میر قمبر سے ہوا، اسی میر قمبر سے قمبرانی قبیلے کی بنیاد پڑی۔ پھر اس کے ایک حاکم احمد خان سے احمد زئی خاندان کی حکومت کی ابتداء اور خانیت کے ادارے کی شروعات کا حال بیان کیا ہے۔ میر احمد خان اس خاندان کا پہلا حکمران تھا۔ اس کے نام پر

احمد زئی شاخ وجود میں آئی۔ اس کے بعد سے اب تک خان آف قلات کا منصب یکے بعد دیگرے اسی خاندان کے پاس چلا آتا ہے۔ اس باب میں اس نے ریاست قلات کی تشکیل اور مختلف خوانین کی حکومتوں کی تفصیل دی ہے۔

اس کتاب کا تیسرا باب سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سارا باب ایک تاریخ ساز شخصیت کے گرد گھومتا ہے جو رابرٹ سنڈیمن یا صرف سنڈیمن کے نام سے معروف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے آج بلوچستان کہتے ہیں۔ اس سارے خطے کو سنڈیمن نے اپنی سحر انگیز شخصیت رعب و دبدبے، بہادری، فیاضی، مہمان نوازی اور مقامی سرداروں پر نقد روپے اور انعامات کی صورت میں ادائیگیوں کی بدولت سلطنت برطانیہ کا حصّہ اور ہندوستان کا ایک صوبہ بنا دیا تھا۔ ہتو رام سنڈیمن کا دست راست تھا۔ اس نے اس باب میں کئی چشم دید واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

باب چہارم جو اس کتاب کا آخری باب ہے۔ تمام ابواب سے زیادہ طوالت رکھتا ہے۔ یہ قریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں بلوچستان، ریاست قلات کے خوانین اور مختلف علاقوں کی وہ قدیم تاریخ جو پہلے ابواب میں بیان ہونے سے رہ گئی تھی بیان کی گئی ہے۔

اسلوب:

اس کتاب کا اسلوب بڑی حد تک روایتی اور دفتری اردو جیسا ہے۔ ایسی نثر جس میں ہندوستانی حکومت کے اہلکار اپنے دفتری اور سرکاری امور سرانجام دیتے تھے جو اسی غرض سے ان کو سکھائی جاتی تھی۔ ہتو رام نے کہیں کہیں فارسی و عربی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ کئی جگہ فارسی اشعار اور ضرب الامثال ملتے ہیں جبکہ مقامی زبانوں کے دو چار الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ لب ولہجہ بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے جو بلوچستان کی اردو سے مخصوص ہے یعنی جملوں کا ایسا انداز جس میں مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر باندھا جاتا ہے۔ ہتو رام نے بعض جگہ واحد الفاظ کے جمع فارسی قرینے سے دیے ہیں مثلاً زمین، بستی اور چوکی کی جمع بالترتیب زمینیات، بستیات اور چوکیات لکھی گئی ہے۔ ہتو رام برٹش گورنمنٹ کا تنخواہ دار ملازم تھا۔ یہ کتاب ۱۹۰۷ء میں آج سے قریباً سو سال قبل اس وقت لکھی گئی تھی جب سلطنت برطانیہ میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور حکومت برطانیہ کا کروفر پوری طرح نمایاں تھا، لہٰذا اس کتاب میں مصنف نے جا بجا اپنے انگریز ممدوحین اور سرکارِ ہند اور برطانیہ کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اس کے قدیم اسلوب نثر کے باوجود اس کی تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ آج کے مؤرخین کے استفادے کے لیے اس میں بہت کچھ تاریخی مواد موجود ہے۔

قاضی جلال الدین کی غیر مطبوعہ رپورٹ تحصیل پشین؛ ایک نئی بازیافت

مقالہ نگار کو بلوچستان میں اردو نثر کی تحقیق کے دوران صوبائی لائبریری بلوچستان کوئٹہ کے آرکائیوز سیکشن سے ایک غیر مطبوعہ رپورٹ بہ عنوان رپورٹ بابت تحصیل پشین دستیاب ہوئی، جو ۴۰ اصفحات پر مشتمل ہے۔ یہ رپورٹ انیسویں صدی کے آخری سال یعنی ۱۸۹۹ء میں مرتب ہوئی تھی۔ اس کے مصنف کا نام خان بہادر قاضی محمد جلال الدین خان ہے، جو اس وقت انگریزی حکومت میں سی۔ آئی۔ ای سیٹلمنٹ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پشین تھے۔ ان کے بیٹے قاضی محمد عیسیٰ نے، جو بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کے روح رواں تھے؛ تحریکِ پاکستان کے دوران بہت متحرک اور بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ قاضی عیسیٰ بلوچستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے نمائندے اور مسلم لیگ بلوچستان کے پہلے سیکرٹری جنرل تھے؛ اسی وجہ سے ان کے قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ قاضی عیسیٰ نے برطانیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، ان کا گھرانہ شروع ہی سے تعلیم یافتہ چلا آیا ہے اور بلوچستان کی سیاست وسماج میں عزت اور مرتبے کا حامل ہے۔ آگے اس غیر طبوعہ رپورٹ کا تجزیہ بہ تفصیل پیش کیا جاتا ہے۔

غیر مطبوعہ رپورٹ بابت تحصیل پشین ۱۸۹۹ء

اس نو دریافت رپورٹ کے متن میں ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رپورٹ قاضی جلال الدین کے اپنے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ان کے کسی ماتحت اہلکار کا اس کی تحریر میں عمل دخل نہیں ہے۔ یہ رپورٹ انہوں نے اس وقت کے ریونیو کمشنر بلوچستان مسٹر کالون کے حسب منشا لکھی تھی۔ تمہید میں وہ خدا تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد لکھتے ہیں:

> امابعد کمترین انکسار آئین جلال الدین ناظرین با تمکین کی خدمت میں نہایت ادب سے التماس کرتا ہے کہ چندے بے بضاعتی مجھ کو خاموشی پر مامور کرتی تھی اور لوازم منصبی بولنے پر مجبور آخر کار اختیار اضطرار پر غالب آیا اور کچھ لکھنے اور بولنے پر عزم جزم ہوا۔ بزرگان عالی فطرت سے یہ توقع ہے کہ اگر کوئی سہو یا غلطی پر گزریں تو نہایت ہمدردی سے اس کا اصلاح فرماویں۔[۲۷]

درج بالا اقتباس میں علم وفضل کے علاوہ انکسار اور اپنی غلطی کی اصلاح کا حاوی احساس اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ رپورٹ جلال الدین خان کی اپنی تحریر ہے۔ اگر یہ ان کے منشیوں کے قلم سے لکھی جاتی تو وہ تمہید میں ان کی

خدمت کا ذکر کرتے اپنی تحریر میں غلطیوں کے امکان پر اس طرح انکسار کا مظاہرہ نہ کرتے۔ آگے چل کر وہ مزید رقم طراز ہیں:

> صورت حال اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب بندوبست تحصیل پشین ختم ہو گیا تو جناب مسٹر کالون صاحب بہادر ریونیو کمشنر بلوچستان کا جن کی شرف ماتحتی مجھ کو حاصل ہے۔ منشا ہوا کہ تحصیل مذکور کی بابت میں ایک ایسی مناسب واضح رپورٹ تحریر کروں جس مں اطناب محل اور اختصار مخل سے حتی الامکان اجتناب کیا جاوے۔ پس امتثالاً لامرہ العالی اس رپورٹ کو مکمل کیا۔[۲۸]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے یہ رپورٹ انہوں نے مسٹر کالون کی ایما پر لکھی اور اس کی تکمیل انہوں نے خود کی۔ یہ رپورٹ بندوبست تحصیل پشین ۱۸۹۹ء پانچ حصّوں پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ جغرافیہ ۲۔ قدیم حالات ۳۔ قومی تواریخ ۴۔ مالیہ کی تاریخ

۵۔ حالات بندوبست

۱۔ جغرافیہ

پہلے حصّے یعنی جغرافیہ کے ابتداء میں تحصیل پشین[۲۹] کی حدود کا بیان ہے جس میں ایسے علاقے شامل ہیں جو اب الگ سے تحصیل ہیں یا کسی اور ضلع یا تحصیل میں شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تحصیل پشین کی حدود بہت وسیع تھیں۔ اس کے بعد اس علاقے کی مصنوعی اور قدرتی پیداوار بیان ہوئی ہیں۔ مصنوعی پیداوار میں گندم، فالیز، تربوز، انگور، زردالو (خوبانی) انجیر، انار اور شفتالو، جبکہ قدرتی پیداوار میں نمک، ترنجین (درخت پر جمی شبنم جو دوائی میں استعمال ہوتی تھی) اور اسوس (ایک بُوٹی) شامل ہیں۔

۲۔ قدیم حالات

دوسرا حصّہ تحصیل پشین کے قدیم حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں پشین کی وجہ تسمیہ بتائی گئی ہے۔ ایک روایت ہے کہ شہنشاہ افراسیاب کے بیٹے پشنگ نے یہاں اپنے نام سے ایک شہر بسایا تھا۔ اسی پشنگ کو عربوں نے بوشنج یا فوشنج تحریر کیا ہے۔ اور پھر مرورِ زمانہ سے یہ لفظ پشین ہو گیا۔ اس کے بعد اس علاقے کی قدیم تاریخ اجمالاً بیان کی گئی ہے۔

۳۔ قومی تاریخ

تیسرے حصّے میں تحصیل پشین میں رہنے والے قبائل کا ذکر ہے، چونکہ یہ تمام قبیلے افغان ہیں، اس لیے پہلے افغانوں کی مختصر تاریخ لکھی گئی ہے۔اس کے بعد یہاں آباد بڑے قبائل یعنی ترین، سید، کاکڑ، علیزئی اوران کی ذیلی شاخوں کا حال مفصل بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ مالیہ کی تاریخ

چوتھے حصّے میں اس علاقے میں مالیہ کی تاریخ کا تعین کیا گیا ہے جو نادر شاہ کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ جب اس کے حکم سے غنی خان الکوزئی نے قندھار کے مالیات کا دستورالعمل بنایا۔ وہی اس کے تمام مقبوضات پر رائج ہوا۔اس کے مطابق جو زمینیں شہر کے نزدیک یعنی دو میل تک واقع تھیں۔ان کو محوطہ جات کا نام دیا اور فی ایکڑ کے حساب سے نقد مالیہ مقرر کیا۔ جو شہر سے ۳۵ میل کے اردگرد تھیں انہیں قریہ جات کا نام دیا۔ یہ نقدی اور غلہ دونوں صورتوں میں نصف نصف وصول کیا جاتا۔

۵۔ حالات بندوبست

رپورٹ کا یہ حصہ سب سے طویل ہے جو ستر سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں نہایت تفصیل سے انگریزوں کے ان اقدامات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو انہوں نے اس علاقے کی پیمائش، زرعی زمینوں اور باغوں کے بندوبست کے ضمن میں کیے۔انہوں نے اس علاقے کی ساری زمین کو پانچ طبقوں یعنی آبی، باغیچہ، سیلابی، خشکابہ اور غیر ممکن میں تقسیم کیا۔عام لوگوں کو کاشت کاری کی طرف مائل کیا اوراس حوالے سے مختلف سہولیات بہم پہنچائیں۔

آخر میں اس خط کا اردو ترجمہ شامل ہے۔ جو اس رپورٹ کے ساتھ منسلک کر کے حکومتِ ہند کو بھیجا گیا تھا۔ اس میں رپورٹ کے مکمل کرنے کی بابت قاضی جلال الدین کی تعریف کی گئی ہے۔[۳۰] اوراس حوالے سے پیدا ہونے والے سوالات لکھے گئے ہیں۔اس طرح یہ رپورٹ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

اسلوب:

اردو میں لکھی گئی اس غیر مطبوعہ رپورٹ کا اسلوب فارسی اور عربی الفاظ کے زیادہ استعمال کے باعث مفرس ومعرب ہے۔ مصنف کو جہاں کہیں موقع ملتا ہے وہ فارسی کے مصرعے یا عربی کلمات استعمال کر کے اپنی علمی قابلیت

جتا تا ہے۔ چونکہ وہ حکومت برطانیہ کا تنخواہ دار ملازم تھا اس لیے اس کی تحریر میں اپنے انگریزی آقاؤں کی شکر گزاری کا احساس بھی وافر پایا جاتا ہے۔ جہاں کہیں انگریزوں کے اقدامات کا ذکر آتا ہے۔ وہ کھل کر ان کے بندوبست اور انتظام کی تحسین کرتا ہے اور ان کے اقتدار کے لیے دعا گو رہتا ہے۔

گلزارِ عابد؛ اردو کا پہلا مطبوعہ شعری مجموعہ:

بلوچستان میں اردو کا پہلا مطبوعہ مجموعہ سید عابد شاہ عابد کا گلزار عابد ہے۔ اسے ذواللسانی مجموعہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس میں ان کی فارسی غزلیں بھی شامل ہیں جن کی تعداد اردو غزلوں کے برابر بلکہ شاید کچھ زیادہ ہے جبکہ ایک آدھ غزل براہوی میں بھی شامل کتاب ہے۔ انعام الحق کوثر نے اپنے مقدمے کے ساتھ گلزار عابد کو دوسری بار شائع کرتے ہوئے پہلی اشاعت کی فوٹو کاپی بعینہٖ شائع کر دی۔ یعنی انہوں نے اس کی تدوین نہیں کی۔ اس کا نقصان تو یہ ہوا کہ اب تک اس مجموعے کی تدوین نہیں ہو سکی ہے، املا کے بعض مسائل کی وجہ سے جس کی اشد ضرورت ہے، تاہم اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ قاری کو اس کمیاب مجموعے کی پہلی اشاعت ہی دستیاب ہو گئی۔ دوسری بار بھی یہ کتاب شاید کم تعداد میں چھپی تھی کہ اب بازار میں دستیاب نہیں۔

عابد شاہ عابد (۱۸۸۸ء۔۱۹۴۹ء)

عابد شاہ عابد کوئٹہ کے قریب واقع ایک گاؤں کرانی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام سید کریم بخش تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر شاید سکول کی تعلیم بھی حاصل کی جو اس وقت کوئٹہ میں انگریز حکومت کی بدولت نئی نئی شروع ہوئی تھی۔ عابد شاہ تعلیم حاصل کرنے کے کچھ عرصہ بعد وہ محکمہ پولیس میں سارجنٹ کے طور پر بھرتی ہو گئے، چونکہ وہ کئی مقامی زبانیں جانتے تھے اور اردو میں پڑھ لکھ سکتے تھے۔ اس لیے انہیں جلد ہی محکمہ پولیس سے محکمہ مال میں بطور نائب تحصیل دار لے لیا گیا۔ اس کے بعد وہ ترقی کرتے ہوئے پہلے تحصیل دار اور بعد میں ای اے سی کے عہدے پر فائز ہو گئے اور پھر ۱۹۳۸ء میں اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو گئے۔ [۳۱]

گلزارِ عابد

گلزار عابد میں شامل عابد شاہ کا کل اردو کلام قریباً ۴۵ تخلیقات پر مشتمل ہے۔ ان میں تیس (۳۰) غزلیں آٹھ نظمیں دو نعت جبکہ کچھ سلام و منقبت شامل ہیں۔ عابد کا لہجہ صاف اور شستہ ہے۔ البتہ ان کے کلام میں

گہرائی و گیرائی بالکل مفقود ہے۔ فارسی میں شعر گوئی کی بدولت وہ اردو اشعار میں بھی فارسی الفاظ وتراکیب استعمال کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بعض جگہ وزن اور بحر کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں فن شاعری پر کامل دسترس نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عامیانہ مضامین اور محدود موضوعات نے ان کی شاعری کو بے رنگ اور غیر دلچسپ بنا دیا ہے۔ ان کا ذخیرہ ء الفاظ بہت محدود ہے، جس کی وجہ سے ان کے کلام میں تکرار نظر آتی ہے۔ ان کی غزلیں زیادہ تر عشق مجازی کے موضوع پر ہیں جو محبوب سے روایتی شکوہ شکایت سے پُر ہیں۔ عابد شاہ عابد کے کلام سے چند شعری مثالیں درج کی جاتی ہیں:

خون کر ڈالا ہے ظالم عاشق ناشاد کا
ہاتھ خونی ہے گواہ اس بانی ء بیداد کا
لاکھ دیکھی بے قراری عاشق بے چین کی
رحم شیوہ ہی نہیں اُس خوگرِ بیداد کا
شوخ چشمی تابکے جاناں جلانا چھوڑ دے
ڈالنا اچھا نہیں ہے ظلم کی بنیاد کا [۳۲]

....

نہ میں بادِ بہاری ہوں رسائی ہووے گلشن تک
وہ شبنم ہوں پہنچ سکتا نہیں دیوارِ گلشن تک
فراق و سوزِ ہجراں نے لگا دی آگ نالوں میں
جلا کر خاک کر ڈالا زسرتاپائے ناخن تک
بہت منت سماجت کی بگڑ کر یار نے بولا
حیا کا پاس رکھ عابد بڑھا جاتا ہے دامن تک [۳۳]

عابد شاہ عابد کا ایک امتیاز البتہ یہ ہے کہ انہوں نے بلوچستان میں اردو نظم کی ابتدا کی۔ ان کی نظموں کی کل تعداد اگرچہ صرف آٹھ ہے مگر ان میں سے ایک نظم ایسی ہے جس کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے یہ ان کی بلوچستان پر لکھی ہوئی ایک نظم ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو شاعری کی روایت میں پہلی نظم ہے جو بلوچستان پر لکھی گئی

ہے۔اس کا عنوان 'تعریف کوئٹہ بلوچستان' ہے۔اس میں کوئٹہ کے پہاڑوں، مرغزاروں، چشموں، پھولوں، پرندوں کے ساتھ ساتھ یہاں پیدا ہونے والے قسم قسم کے پھلوں اور میوؤں مثلاً شہتوت، انار، انگور، انجیر، سیب، زردالو، آلوچہ، شفتالو اور بادام وغیرہ کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، جبکہ کوئٹہ کے ماہ طلعتوں اور سیمیں بدنوں کا ذکر بھی اس نظم میں نظر آتا ہے۔ بلوچستان سے متعلق ان سب عناصر کی موجودگی نے اس نظم کو قابلِ قرات بنا دیا ہے، خصوصاً جبکہ یہ اس موضوع پر اولین ادبی کاوش ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نظم کی تمام تر اہمیت فکر وفن کی بجائے صرف تاریخی ہے۔ عابد شاہ کی دیگر نظموں میں ''بے ثباتی دنیا''، ''تصویر کے دورُخ'' اور ''میری میٹھی نیند'' وغیرہ ہیں۔ ان کا اردو کلام اگرچہ فنی حوالوں سے کئی طرح کی خامیاں رکھتا ہے مگر بلوچستان میں اردو شاعری کے ارتقاء کے تناظر میں اس کی اہمیت بہر حال ہے۔ یہ بات اس مجموعے کی ادبی اور تاریخی اہمیت کے لیے کافی ہے۔ عابد شاہ عابد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے دانیال طریر نے بالکل درست لکھا ہے کہ ''محبت عابد شاہ کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے جس کی وسعت محبوب کے ظلم وستم اور وصل کی تمناؤں تک محدود ہے''۔ [۳۴]

رحیلِ کوہ از محمد حسین عنقا

محمد حسین عنقا (۱۹۰۷ء۔۱۹۷۷ء) کے اس شعری مجموعے کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اردو کی بیس اور فارسی نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے آغاز میں غلام محمد بلوچ اور نسیم تلوی کے قلم سے تعارف وتقریظ جبکہ شاعر کے اپنے قلم سے 'افتتاحیہ' کے عنوان سے کتاب کے بارے میں تعارفی مضامین شامل ہیں۔ اس شعری مجموعے کو اگر بلوچستان میں ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ابھرنے والی قوم پرست سیاست کا ادبی اظہار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ وہ وقت تھا جب بلوچستان کی پہلی نسل جدید علم اور سیاسی شعور سے بہرہ ور ہوئی تھی۔ اور اسے اپنی سرزمین پر ایک غیر ملکی طاقت کے قابض ہونے کا شدید احساس تھا۔ ریاست قلات کا نواب ٹولہ محض نام کے حکمران تھے۔ انہیں اپنے لوگوں اور ان کے مسائل سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ صرف اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے متمنی تھے جو صرف انگریز کی تائید سے قائم رہ سکتا تھا چنانچہ یہ لوگ اس کے لیے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار تھے۔ بلوچستان کی جدید تعلیم یافتہ نوجوان نسل انگریز اور اس کے حمایت یافتہ مقامی حکمران ٹولے سے سخت نالاں تھی۔ اس تعلیم یافتہ نسل کے سرخیل یوسف عزیز مگسی، عبدالعزیز کرد، عبدالصمد خان اچکزئی اور محمد حسین عنقا وغیرہ تھے۔ کچھ دیگر لوگ بھی سیاسی بیداری کی اس مہم میں ان کے ساتھ شامل تھے۔ ان میں سے ہر شخص قلمی اور عملی محاذ پر سرگرم عمل تھا۔ چنانچہ عنقا نے یہ

نظمیں لکھ کر اس کام میں اپنا حصّہ ڈالا۔ وہ کتاب میں شامل اپنے تعارفی مضمون میں اس بارے لکھتے ہیں:

> میرا مخاطب قارئین کا وہ طبقہ ہے جس کا تعلق بلوچستان نامی اس خطہ ارض سے ہے جہاں کے باشندے ایک ایسی بے شرفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں کہ جس کی مماثلت کا روئے زمین پر اور کوئی قطعہ نہیں۔[۳۵]

درج بالا سطور سے شاعر کا مطمع نظر بالکل واضح ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد بلوچستان کے عوام کو سیاسی شعور اور زندگی کے ترقی پسندانہ نقطہ نظر سے واقف کرانا تھا اور انہیں آزادی کے حصول کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا تھا۔ محمد حسین عنقا اور ان کے دیگر رفقاء پابندیوں کے باوجود اس میدان میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچستان میں ہر طرح کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد تھیں۔ یہاں تک کہ اخبارات کا مطالعہ بھی ممنوع قرار پایا تھا۔ اس پس منظر میں رحیل کوہ کے مندرجات پر نظر ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی سلسلہ خیال کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جن میں موضوع، مواد اور اسلوب کی سطح پر کافی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس میں اس وقت کی سیاسی تحریک کے مقاصد، اس عہد کی حکومت پر اعتراضات، سرداریت اور مختلف قسم کے رسم و رواج کی جبریت کے خلاف مزاحمت نظر آتی ہے۔ جبکہ نوجوان بلوچ نسل سے امیدیں اور توقعات وابستہ کی گئی ہیں کہ وہ پرانے نظام کے خلاف بغاوت کرے گی اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرے گی۔ اس میں بلوچستان کے مختلف ادبی اور سیاسی اکابرین پر مختصر نظمیں بھی شامل ہیں جو اس وقت کے ادبی، سیاسی اور سماجی منظرنامے پر نمایاں تھے۔

رحیل کوہ میں شامل اکثر نظمیں نظم معریٰ کی ہیئت میں ہیں۔ بعض نظمیں غزل اور قطعہ کی ہیئت میں ہیں۔ ان سب نظموں کے عنوانات قائم کر کے انہیں الگ الگ نظموں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے ان تمام نظموں میں موضوع کی سطح پر ایک اندرونی ربط پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان پر ایک طویل نظم کا گمان ہوتا ہے رحیلِ کوہ میں فارسی نظمیں بھی شامل ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اقبال کی زندگی میں ہی بلوچستان سے شائع ہونے والی ان نظموں پر علامہ اقبال کے اثرات واضح نظر آتے ہیں جو لفظ، ترکیب اور موضوع کی سطح پر ہیں مثلاً ایک نظم 'مرغ ہوا اور مرغ سرا' علامہ اقبال کی فارسی نظم 'مکالمہ مابین مرغ سرا و مرغ ہوا' سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اس طرح ایک فارسی نظم 'سنٹرل جیل' بھی اقبال کی نظم 'حکمت فرنگ' کی طرز میں ہے۔ ایک اور فارسی نظم 'بلوچستان'

میں اقبال کا مصرعہ ’از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز‘ ٹیپ کے مصرعے کے طور پر برتا گیا ہے۔عنقا کی بعض نظموں میں انگریزی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں مثلاً جرنیل، بیرسٹر، کیمرا وغیرہ۔ بلوچستان کی شعری روایت میں انگریزی الفاظ کا استعمال یہاں پہلی بار نظر آتا ہے۔ان تمام باتوں کے باوجود رحیل کوہ فنی حوالوں سے ایک کمزور تخلیق ہے۔اس میں ندرت بیان تخیل آفرینی اور فکری گہرائی قطعاً مفقود میں یوں لگتا ہے جیسے اس زمانے کے بعض سیاسی اور سماجی حقائق کو منظوم کیا گیا ہو۔اس لیے اس میں شعری استعارے، تشبیہ، تلمیح، محاورے اور روزمرہ کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ موسیقت اور روانی کمتر سطح پر موجود ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی شاعری کو قافیہ پیمائی کی ایک ادنیٰ مثال ہی کہا جا سکتا ہے البتہ بلوچستان کی ادبی اور سیاسی تاریخ کے تناظر میں یہ کتاب اپنی ایک اہمیت رکھتی ہے۔ذیل میں رحیل کوہ میں شامل ایک دعائیہ نظم کے چند شعر دیے جاتے ہیں۔ان سے بھی عنقا کے سیاسی مقاصد واضح ہوتے ہیں:

تیری ذات ہے عالم غیب و ظاہر
نہیں تجھ سے مخفی کوئی بحر اور بر
رکھی ہم نے تحریک قومی کی بنیاد
تیری دی ہوئی عین فطرت کے اوپر
نہیں شائبہ اس میں ذاتی غرض کا
ہے نیکی کی مانند تحریک طاہر
ضرورت نہیں ہے دعا کی ولیکن
میں کرتا ہوں مخلوقیت اپنی ظاہر
الٰہی ہو تحریک کی پرورش یوں
ہوئی جیسے موسیٰ کی فرعون کے گھر[٣٦]

یوسف عزیز مگسی (١٩٠٨ء۔١٩٣٥ء)

یوسف عزیز مگسی بلوچستان کی جدید ادبی اور سیاسی تاریخ کے اہم رہنماؤں میں سے ہیں۔ وہ اُردو زبان زبانوں پر خاصا عبور رکھتے تھے جبکہ انگریزی اور فارسی بھی جانتے تھے وہ اردو اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے

اگرچہ ان کا کلام مقدار کے لحاظ سے بہت کم ہے مگر اس نے اپنے دور میں نہ صرف بلوچستان بلکہ اس خطے سے باہر بھی شہرت پائی ۔ یوسف عزیز مگسی نوجوانی میں ہی کوئٹہ کے ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کے ہولناک زلزلے میں وفات پا گئے تھے۔ اردو کے تناظر میں یوسف عزیز کی اُردو شاعری بلوچستان میں قومی اور وطنی شاعری کی شاید اولین مثال ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

میں اگر چاہوں تو ذرے کو بیاباں کر دوں
قطرہ ء آب میں پیدا سر طوفاں کر دوں
جی میں آتا ہے کہ پھر طور کو آباد کروں
آتشِ دل سے پہاڑوں میں چراغاں کر دوں
میں وہ مالی ہوں اگر کھول دوں دل کے سوتے
خشک صحراؤں میں پیدا گل و ریحاں کر دوں [۳۷]

اردو شاعری کے علاوہ نثر میں بھی یوسف عزیز کی کچھ چیزیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک بلوچستان میں اردو افسانے کے ابتدائی آثار بھی یوسف مگسی سے منسوب کیے جاتے ہیں[اس کی تفصیل آگے آئے گی]۔ انھوں نے اردو میں چند سیاسی نوعیت کے مضامین بھی لکھے تھے مگر نثر میں ان کا اہم ترین اثاثہ ان کے اردو مکاتیب ہیں۔ یہ بلوچستان میں اردو نثر کے ارتقاء کی ایک اہم کڑی ہیں۔

مکاتیب یوسف عزیز مگسی مرتبہ :انعام الحق کوثر

یوسف عزیز مگسی کے چند نہایت اہم اردو خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان خطوط میں نہ صرف یوسف عزیز کی شخصیت کا مکمل عکس نظر آتا ہے، بلکہ اُن کے ذاتی حالات کے ساتھ ساتھ اس دور کے سیاسی و سماجی سطح پر رونما ہونے والے اہم واقعات کا تذکرہ بھی ان خطوط میں ملتا ہے۔ ان خطوط کے مطالعے سے ایک صدی پہلے کے بلوچستان کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ ان خطوط کی تاریخی اور سیاسی اہمیت تو مسلم ہے ہی، مگر یوسف عزیز مگسی کا مؤثر اندازِ بیان اور تحریر میں موجود علمی شان ان خطوط کی ادبی و علمی افادیت ثابت کرتی ہے۔ یہ خطوط ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۴ء کے زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے مکتوب الیہ میں سہراب خان ڈومکی، میر تاج محمد خان ڈومکی، محمد امین خان کھوسہ، محمد حسین عنقا اور مولانا عبدالکریم شامل ہیں۔ محمد امین کھوسہ یوسف کے قریبی دوست اور رفیق کار تھے۔ ان کے نام

سب سے زیادہ یعنی ۳۶ خطوط ہیں۔ جبکہ خطوط کی کل تعداد ۵۶ ہے۔ ان میں سے دو خط انگریزی زبان میں بھی ہیں۔ انعام الحق کوثر نے ان خطوط کو مرتب کر کے ۱۹۷۸ میں مجلس ترقی ادب، لاہور سے شائع کیا۔

مختلف رفقا کے نام لکھے گئے ان خطوط میں یوسف عزیز مگسی کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ محمد امین کھوسہ ان کے بے تکلف دوست اور ساتھی تھے۔ ان کے نام لکھے گئے خطوط میں یوسف کی زیادہ بے تکلفی نظر آتی ہے۔ ان کا آغاز ہی بڑے شوخ اور بے تکلفانہ انداز میں ہوتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ مکتوب نگار کو مکتوب الیہ سے ایک خاص تعلق اور ربط ہے۔ بعض خطوط میں تخاطب کے چند ابتدائی جملے ملاحظہ ہوں:

سندھی شیکسپیئر یعنی امین بھائی! تمھاری دلچسپیوں کا مرقع ملا۔ واقعی تم قابل ڈراماٹسٹ بن جاؤ گے اگر واقعات حق میں رہے تو۔

پیارے بھائی امین وعلیکم السلام!

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اور

حضرت امین- میرے روحانی انیس امین! میرے فلسفی اور محبت پرست بھائی اور امین بھائی وغیرہ۔

خوابوں کی دنیا میں رہنے والے بھائی۔ [۳۸]

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے یوسف عزیز مگسی بلوچستان کے اولین قوم پرست راہنماؤں میں سے تھے۔ انہوں نے حصول تعلیم کی خاطر ایک عرصہ علی گڑھ میں قیام کیا تھا۔ اس طرح انہیں لاہور، کراچی، دہلی، بمبئی، ملتان اور دیگر شہروں میں آنے جانے اور رہنے کا موقع ملا تھا۔ وہ بلوچستان کو ان شہروں کی طرح ترقی یافتہ اور بلوچ قوم کو مہذب اور تعلیم یافتہ قوم دیکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے نہ صرف قلمی محاذ سنبھالا بلکہ عملی طور پر بھی سرگرم رہے۔ اخبارات میں مضامین لکھے۔ انھوں نے خود بھی بلوچستان ، البلوچ ، ینگ بلوچستان اور بلوچستان جدید کے نام سے کئی اخبار کراچی سے جاری کیے۔ وہ ان اخبارات میں خود بھی مضامین لکھتے اور اپنے دوستوں کو بھی قائل کرتے۔ یوسف عزیز بلوچستان میں وہی کام محدود پیمانے پر کر رہے تھے جو سرسید احمد خاں نے اپنے وقت میں ہندوستان بھر میں کیا تھا۔ ان کے خطوط میں بلوچ قوم کی زبوں حالی پر گہرے دکھ کا اظہار

اور انہیں سیاسی و سماجی حوالے سے بیدار کرنے کی تمنا اور اپنی کوششوں کا احوال ملتا ہے۔ یوسف عزیز مگسی کی تجویز اور عملی کوششوں سے ہی ۱۹۳۲ء میں جیکب آباد میں پہلی بلوچستان آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا انعقاد ممکن ہوا تھا۔ جس میں ہندوستان بھر سے تمام ممتاز بلوچ قائدین شامل ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کی صدارت پشتون قوم پرست راہنما عبدالصمد خان اچکزئی نے کی تھی۔ یہ یوسف عزیز کی دوراندیشی تھی کہ انہوں نے بلوچستان کی سیاسی بیداری کے حوالے سے شروع کی گئی مہم میں اپنے ہم وطن پشتون راہنماؤں کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا تھا۔ اس کانفرنس کے حوالے سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ہم نے طے کیا تھا کہ آل انڈیا بلوچ کانفرنس دسمبر جیکب آباد میں منعقد کریں اور ہم نے اس کے لیے زور وشور سے کام شروع کر دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بلوچ قوم میں افلاس اور غربت کس قدر موجود ہے۔ اس لیے مکانوں کی اور دیگر فروعی چیزوں میں آپ کی امداد کی سخت ضرورت ہے۔۔۔ مجھے کامل توقع ہے کہ آپ ہر ممکن مدد دیں گے اور کانفرنس کی کامیابی میں کوشش کریں گے۔ [۳۹]

ایک سچے مسلمان رہنما کی طرح یوسف عزیز کی قوم پرستی صرف اپنے قبیلے کی سربلندی تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس میں تمام مسلمان شامل تھے۔ وہ بہ طور قوم مسلمانوں کے عروج کے تمنائی تھے۔ ان خطوط میں نہ صرف یوسف کا ترقی یافتہ سیاسی شعور ملتا ہے بلکہ یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ وہ دنیا کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ عرب دنیا ایک عرصے سے مختلف مصائب کا شکار ہے۔ مغربی ممالک پہلے بھی اس کا باعث تھے اور آج بھی اس خطے میں نئے کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بلوچستان کا حساس رہنما اور نوجوان مصلح اس حوالے سے لکھتا ہے:

> ایک عرصے سے مجھے ایک خیال ذہن نشین ہوگیا ہے کہ انگریز جزیرۂ عرب پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور ان کے پولیٹیکل معالج کی روح سے یہ ضروری ہے کہ وہ اسلامیانِ عالم کے مرکز اور سبب اتحاد کو مٹائیں۔ [۴۰]

یوسف عزیز کے خطوط میں ان کے ذاتی مسائل، مشکلات اور بیماریوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ وہ مشکلات سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ ان کے اظہار میں بھی زندہ دلی برقرار رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ موقع محل کی نسبت سے اردو اور فارسی کے اشعار جابجا استعمال کرتے ہیں۔ ایک جگہ اپنی بیماری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

دہلی میں جب معالج کے سامنے پیش ہوا تو بعد معائنہ نبض ارشاد ہوا کہ اوہو آپ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں؟ حرارت جگر اپنے انتہائی درجے تک پہنچ چکی ہے۔ سرد اور مقوی جگر شربت آپ کو بنا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کسی ٹھنڈے مقام پر قیام کریں۔ کیا آپ شراب استعمال کرتے ہیں؟ نعوذ باللہ اس بے چارے کو کیا علم کہ یہاں تو یہ قصہ ہے کہ

مشعل بنا کے تابشِ داغِ جگر کو میں
راتوں کو ڈھونڈتا ہوں تری رہگزر کو میں [۴۱]

اسلوب:

یوسف عزیز مگسی کی نثر میں فارسیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی تحریر میں فارسی الفاظ تراکیب، اشعار، اور مصرعے بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ بعض جگہ عربی کے الفاظ، جملے اور قرآنی آیات ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی کے الفاظ اور محاورے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط میں اردو اور فارسی کے کلاسیکی اشعار کے علاوہ اقبال اور غالب کے شعر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ وہ کئی جگہ ان دونوں شعراء کے مختلف اشعار اپنی تحریر میں رواں نثر کی صورت میں لکھتے ہیں۔ یوسف عزیز کے خطوط ان کے ذاتی اور سماجی حالات کا آئینہ ہیں۔ یہ اپنے موضوعات اور نثر کی جملہ خوبیوں کی بدولت بلوچستان میں اردو نثر کا خوبصورت مرقع ہیں۔ ان کی نثر میں تمام ادبی خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ اگر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ یہ خطوط بلوچستان میں اردو نثر کا ابتدائی سرمایہ ہیں تو ان کی اہمیت وافادیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

بلوچستان میں اردو فکشن کے ابتدائی آثار:

انسان کو شروع ہی سے کہانی سے دلچسپی رہی ہے۔ اپنی اجتماعی زندگی کے ابتدائی دور میں اسے فطرت کی مختلف قوتوں سے برسرِ پیکار رہنا پڑا۔ کشمکش کی ان منزلوں سے گزرتے ہوئے جب انسان مشکل حالات پر قابو پا لیتا تو اسے فتح کی لذت کے ساتھ ساتھ مسرت کا احساس بھی ہوتا۔ جب کبھی کسی حلقے میں وہ اپنی فتح کی داستان سناتا تو اس روداد میں اسے قندِ مکرر کی چاشنی ملتی اور اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون ملتا۔ یوں داستان اور کہانی وجود میں آئی جس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف شکلیں اختیار کیں۔ کہانی کے مختلف رنگ داستان، افسانہ، ناول، ڈراما اور فلم کے روپ میں آج بھی موجود ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں افسانہ اور ناول مغرب سے آیا۔ اردو میں ان دونوں اصناف کی عمر محض ڈیڑھ صدی کے لگ بھگ ہے۔ مگر ان اصناف نے اپنا آپ منوا لیا ہے۔ اردو ادب

میں اب ان دونوں اصناف کی ایک پائیدار اور مستحکم روایت نظر آتی ہے۔ یوں گمان ہوتا ہے جیسے یہ صدیوں سے اردو میں پڑھے لکھے جارہے ہوں۔

بلوچستان میں اردو نثر کے ابتدائی خدو خال انیسویں صدی کے نصف آخر میں نظر آتے ہیں مگر یہ غیر افسانوی نثر پر مشتمل ہیں جن کا تذکرہ پہلے تفصیل سے ہو چکا ہے۔ ادبی نثر کا ظہور یہاں بیسویں صدی میں ہوا۔ یہ نکتہ بحث طلب ہے کہ آیا اس کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہوا جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ یا پھر قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں نثری ادب کا باقاعدہ ارتقاء ہوا۔ جب یہاں ایسے افسانے اور ناول لکھے گئے جو اپنے موضوع، کہانی پن، کردار نگاری، زمان ومکاں اور وحدت تاثر جیسی بنیادی افسانوی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ افسانہ اور ناول کی کم از کم تعریف پر پورا اترتے ہیں۔ ذیل میں بلوچستان میں اردو افسانہ اور ناول کے ابتدائی آثار کا تجزیاتی مطالعہ الگ الگ پیش کیا جاتا ہے۔

تکمیل انسانیت: بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ؟

یہ اپنی نوعیت اور بلوچستان کی ادبی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہے کہ جس افسانے کو بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ وہ مکمل حالت میں دستیاب ہی نہیں تھا۔ پھر جتنا حصہ اس افسانے کے متن کا موجود رہا ہے اس کا بھی بغور جائزہ نہیں لیا گیا آیا یہ افسانے کی تعریف پر پورا اترتا ہے کہ نہیں۔ اس افسانے کا عنوان 'تکمیل انسانیت' ہے جو یوسف عزیز مگسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر چہ یہ افسانہ اردو ادب کے طلبہ یا عام قارئین کو پڑھنے کے لیے دستیاب نہیں ہے مگر بلوچستان کے ناقدین اور محققین اس کا ذکر ایک تواتر سے یوں کرتے ہیں جیسے یہ عام پایا جاتا ہو۔ ایسے دعووں کی وجہ دراصل انعام الحق کوثر کی کتاب *بلوچستان میں اردو* میں شامل اس افسانے کا ایک اقتباس اور اس کا تذکرہ ہے۔ وہ اس افسانے کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> ''تکمیل انسانیت ؛ [طبع زاد افسانہ] از محمد یوسف علی عزیز مگسی (چار قسطیں) مطبوعہ بلوچستانِ جدید، کراچی شمارے یکم مئی ۱۹۳۴ء ، ۸ مئی ۱۹۳۴ء ، ۱۶ مئی ۱۹۳۴ء ، ۲۴ مئی ۱۹۳۴ء۔[۴۲]

اس کے بعد انہوں نے اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے اور ایک اقتباس بھی دیا ہے۔ انعام الحق کوثر نے اسے بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ قرار نہیں دیا؛ مگر ایک طویل عرصے تک کسی تحریر یا کتاب

میں اس سے پہلے کے زمانے کے کسی افسانے کا ذکر نہیں ملتا۔ شاید یہی وجہ ہے، کئی لوگوں نے خود ہی نتیجہ اخذ کر کے اسے بلوچستان میں اردو افسانے کا نقشِ اول تسلیم کر لیا۔ فاروق احمد بلوچستان میں اردو افسانے کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہوئے اس افسانے کے متعلق لکھتے ہیں:

> بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کی ابتداء ۱۹۳۴ء کے آس پاس ہوتی ہے۔ اور باقاعدہ طبع زاد افسانہ نگار یوسف عزیز مگسی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ یہ زمانہ بلوچستان میں سیاسی، سماجی سرگرمیوں کا زمانہ ہے اور ''تکمیل انسانیت'' جسے پہلے افسانے کی حیثیت حاصل ہے۔ انہی موضوعات سے عبارت ہے۔ یوسف عزیز مگسی مولانا ظفر علی خان کی طرز تحریر اور فکر سے متاثر ہیں۔ کراچی سے شائع ہونے والا افسانہ ''تکمیل انسانیت'' مذہبی اخلاقیات سے متاثر نظر آتا ہے۔[۴۳]

اس افسانے کی اولیت کا اظہار مبارکہ حمید ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> بلوچستان میں اردو افسانے کا باقاعدہ آغاز کی تحقیق وجستجو میں جو نام ہمارے سامنے آیا ہے وہ یوسف عزیز مگسی کا افسانہ ''تکمیل انسانیت'' ہے۔ یہ افسانہ چار قسطوں یکم مئی، ۸ مئی، ۱۶ مئی اور ۲۴ مئی ۱۹۳۴ء میں لکھا گیا اور بلوچستان جدید کراچی میں شائع ہوا۔[۴۴]

مبارکہ حمید نے اس افسانے کا مختصر خلاصہ بھی لکھا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے یہ افسانہ خود پڑھا ؛ یہ ایک ایسی اہم بات ہے، جس کا تذکرہ انھوں نے نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عرصے سے یہ افسانہ نایاب رہا ہے اور بلوچستان کے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اس افسانے کی تلاش میں تھے۔ اب کہیں جا کر یہ افسانہ اپنی اشاعت اول کے قریباً اسی سال بعد منظر عام پر آیا ہے، جس کا تفصیلی ذکر آگے ہے۔ شاہ محمد مری، یوسف عزیز مگسی پر لکھی گئی اپنی کتاب میں اگرچہ اس تحریر کو پہلا افسانہ قرار نہیں دیتے، مگر وہ بھی اسے افسانہ ضرور سمجھتے ہیں۔ ان کے بقول: ''محققین کو ان کا لکھا ہوا صرف ایک افسانہ دستیاب ہوسکا ہے۔ جس کا عنوان تھا ''تکمیل انسانیت''۔''[۴۵] یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے بھی یہ افسانہ خود نہیں پڑھا اسی لیے وہ اس کا سزاوار ''محققین'' کو سمجھتے ہیں۔

محولہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان مختلف لکھنے والوں نے انعام الحق کوثر کی تحریر پر صاد کیا۔ انہوں نے نہ تو اس افسانے کی مکمل عدم موجودگی پر کوئی بات کی۔ اور نہ ہی اس کے دستیاب متن کو بغور پڑھنے کی

زحمت گوارا کی کہ آیا یہ کسی ادبی فن پارے کی تعریف پر پورا اترتا بھی ہے یا نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ تمام لوگ یوسف عزیز مگسی کے سیاسی، سماجی، قبائلی اور تاریخی کردار کی بناء پر ان کی عظمت سے مرعوب رہے ہیں۔ اس لیے ان سے منسوب ایک کچی پکی تحریر کو افسانہ بلکہ بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ قرار دیتے رہے۔ اسی صورتحال کا شکار ضیاء الرحمٰن نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے مضمون ''کیا 'تکمیل انسانیت' بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ ہے؟'' میں اسے افسانہ تو قرار دیتے ہیں مگر پہلا نہیں۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''تکمیل انسانیت'' بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ نہیں ہے۔ نہ ہی یوسف عزیز مگسی بلوچستان میں اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ دستیاب ماخذ کی بنیاد پر یہ دعویٰ درست ہے کہ بلوچستان میں اردو کا اب تک دستیاب ہونے والا پہلا افسانہ ''ایک رازِ سربستہ کا انکشاف یا غیبی امداد'' ہے۔ اس کے مصنف محمد عمر بلوچ ہیں۔[۴۶]

محولہ بالا اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہے، کہ وہ 'تکمیل انسانیت' کو افسانہ اور اس کی بنا پر عزیز مگسی کو افسانہ نگار تو ضرور سمجھتے ہیں، مگر پہلا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے، کہ وہ اپنی تحقیق کی بدولت ایک اس سے بھی زیادہ پرانا افسانہ تلاش کر چکے ہیں، جس کا نام اور حوالہ درج بالا اقتباس میں دیا جا چکا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان کا دعویٰ درست ہے؟ اس بارے میں مقالہ نگار کا خیال ہے کہ ضیاء الرحمٰن کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''تکمیل انسانیت'' اور ''ایک رازسربستہ کا انکشاف یا غیبی امداد'' یہ دونوں تحریریں افسانے کی تعریف پر پوری نہیں اترتیں۔ لہٰذا انہیں کسی طور افسانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ افسانہ کیا ہے؟ اس حوالے سے افسانے کی تعریف پر ایک نظر ڈالنا بہتر ہوگا۔ وقار عظیم اپنی کتاب فن افسانہ نگاری میں افسانے کے فن پر آئی۔ بی ایسن وین کی رائے درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے بقول:

> مختصر افسانہ ایک مختصر تخیلی تخلیق ہے۔ جس سے کسی ایک مخصوص واقعہ یا کردار کا نقش پلاٹ کے ذریعے اس طرح ابھارا جاتا ہے کہ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم سے ایک مخصوص تاثر پیدا ہو سکے۔[۴۷]

یعنی افسانے میں پیش کردہ حقائق اور واقعات کو اس قدر موثر اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہو کہ وہ قاری کے ذہن پر نقش ہو جائیں۔ پریم چند افسانے کو انسان کی نفسیاتی حالت سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''مختصر

افسانہ وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی نفسیاتی حقیقت پر رکھی جائے۔''[۴۸] یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ محض ایک مختصر قصہ یا ایک بھولی ہوئی یاد نہیں ہوتا۔ یہ ایک چھوٹی سی کچی پکی کہانی یا کسی منظر کا بیان بھی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لکھنے والا اپنے فن کی بدولت اس میں ایک لمحے کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ وہ ساری زندگی پر محیط معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ایک ایسا تاثر پایا جاتا ہے جو آسانی سے دل سے محو نہیں ہو پاتا۔ پھر ایک اہم عنصر افسانے کا دلچسپ ہونا سمجھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ابتداء ہی سے قاری کو جکڑ لیتا ہے۔ اس میں تخیئل بھی کارفرما ہوتا ہے، مگر یہ حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ افسانے کے کردار عام زندگی کے قریب ہوتے ہیں؛ قاری ان کو اپنے جیسا گوشت پوست کا انسان سمجھتا اور ان کا اچھا یا برا اثر قبول کرتا ہے۔ ان معروضات کی روشنی میں دیکھا جائے تو بلوچستان میں اردو کے ''اولین'' قرار دیے گئے افسانے کسی طور افسانے کے فنی معیار پر پورا نہیں اترتے؛ اس لیے ان دونوں تحریروں کو افسانہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ''تکمیلِ انسانیت'' کے مکمل متن کی غیر موجودگی میں اسے افسانہ قرار دینا تحقیق و تنقید کے اعلیٰ اصولوں کی نفی ہے، جو بلوچستان کے محققین سے سرزد ہوتی رہی ہے۔

''تکمیلِ انسانیت''، مکمل متن کی بازیافت

یہ اس مقالہ نگار کی خوش قسمتی ہے کہ اس مقالے کی تسوید کے دوران یہ خبر ملی کہ یوسف عزیز مگسی کے زمانے کے ایک اخبار بلوچستانِ جدید کی ۱۹۳۴ء کی وہ فائل بالآخر دستیاب ہوگئی، جس میں یوسف عزیز مگسی کا افسانہ ''تکمیلِ انسانیت'' پہلی اور آخری بار قسط وار شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ مکمل صورت میں ایک طویل عرصے سے نایاب تھا۔ اب پہلی اشاعت کے قریباً اسی (۸۰) سال کے بعد اس کا مکمل متن سامنے آیا ہے۔ اس مقالے میں پہلی بار اس کے مکمل متن کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ بلوچستانِ جدید کی فائل کے مطابق یہ افسانہ اس اخبار کی انھی چار اشاعتوں میں قسط وار شائع ہوا ہے جس کی تفصیل انعام الحق کوثر نے دی ہے۔ ''تکمیلِ انسانیت'' نو مختصر اقتباسات کی صورت شائع ہوا ہے۔ اسے افسانہ کہنا محلِ نظر ہے، یہ دراصل ان کی مختصر خودنوشت یا آپ بیتی کا ایک حصہ ہے؛ اس میں انھوں نے اپنے ذاتی کوائف اور والد کی وفات کے بعد خود پر گزرنے والے حالات و واقعات کو کہانی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔[۴۹]

اس کہانی کے مرکزی کردار کا نام عزیز ہے، اس کے علاوہ باقی نام یعنی ان کے بھائیوں، والد اور قلات کے وزیر اعظم ایسے کرداروں کے نام فرضی ہیں۔ اس میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے والد کی وفات

کے بعد ان کے بڑے سوتیلے بھائی نے کیسے ساری جائیداد خود ہتھیا لی اور ان کو اس کا برائے نام حصہ دیا۔ اس کے باوجود انھیں مزید ہراساں کرانے کی خاطر قلات کے حکمران سے ساز باز کر کے انھیں ایک مضمون لکھنے کے جرم میں گرفتار کرا دیا۔ وہ دراصل عوام میں ان کی مقبولیت سے خائف ہوتا ہے اور اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ یہ دراصل وہ حالات ہیں جو یوسف عزیز پر حقیقی زندگی میں گزرے تھے۔ کہانی کے آخر میں جیل میں دو فرشتے ان کے پاس آتے ہیں اور انھیں خوشخبری سناتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو گئے ہیں، اب ان کی مشکلات ختم ہوں گی اور نواب اشفاق احمد [افسانے میں ان کے سوتیلے بھائی کا نام] کیفر کردار کو پہنچے گا، اس پر یوسف ان کے لیے ہدایت کی استدعا کرتے ہیں۔ افسانے کے آخر میں آسمان پر فرشتوں کا جلوس اور ان کی نغمہ سرائی دکھائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کچی پکی کہانی کو افسانہ قرار دینا کسی طور مناسب نہیں کہ فرضی ناموں کے علاوہ یہ یوسف عزیز کی زندگی کی حقیقی روداد ہے۔ انھوں نے عوام کو اپنے ذاتی حالات سے آگاہ کرنے اور ان کے دلوں میں اپنے لیے ہمدردانی جزبات ابھارنے کے لیے اسے کہانی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی، اس لیے اسے ''طبع زاد افسانہ'' قرار دیا۔ حالانکہ یہ تحریر افسانے کے کم از کم معیار پر بھی پورا نہیں اترتی۔ اسے زیادہ سے زیادہ نیم سوانحی مضمون کہا جا سکتا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ یوسف عزیز مگسی نے اپنے ذاتی حالات اور سیاسی مقاصد کو کہانی کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ ایسی فنکارانہ چابکدستی کا مظاہرہ نہ کر سکے کہ ان کی حقیقی سرگزشت ایک افسانے کا روپ دھار لیتی۔ اس کہانی کے دستیاب مختصر اقتباس میں بھی دو فرشتوں کے کردار نظر آتے ہیں۔ جبکہ انجام میں چالیس فرشتوں کا اجماع اور آسمان پر جلی حروف میں 'تکمیل انسانیت' لکھا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ اس طرح کا غیر حقیقی ماحول اس اقتباس کو افسانے کی بجائے کسی تمثیل یا داستان کا اقتباس ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا اسے افسانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ادب کی دنیا میں کسی قسم کی رورعایت نہیں چلتی۔ آپ ادیب ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ بغیر کسی ادبی جوہر کے کوئی تحریر پایہء امتیاز حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ بات ضیاء الرحمٰن کی اس تحقیقی دریافت پر بھی صادق آتی ہے جو انہوں نے بلوچستان میں اردو کے پہلے افسانے کے حوالے سے کی۔ وہ ایک نیا افسانہ 'ایک راز سر بستہ کا انکشاف یا غیبی امداد' کے عنوان سے سامنے لائے ہیں۔ اپنے تعارفی مضمون میں انہوں نے اسے 'تکمیل انسانیت' کی بجائے بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے اور اس کا پورا متن بھی فراہم کیا ہے چونکہ اس کا پورا متن ہمارے سامنے ہے اس لیے اس 'افسانے' کا تجزیاتی مطالعہ پیش ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ آیا یہ تحریر افسانے کے فن پر پورا اُترتی ہے یا نہیں جیسا کہ عموماً دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اس افسانے کا خلاصہ یوں ہے کہ اس کا مرکزی کردار جو صیغہ واحد متکلم میں قصہ بیان کرتا ہے۔ صبح کی نماز کے بعد

سیر کے لیے جنگل میں جاتا ہے۔ وہاں اسے ایک غیبی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اس آواز کی تلاش میں نکلتا ہے تو اسے درختوں کے پاس ایک فرشتہ نما انسان ملتا ہے۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک عورت ہے۔ یہ نورانی حسینہ اسے بتاتی ہے کہ وہ 'فتح وظفر کی ملکہ' ہے۔ اور دنیا میں مسلمانوں کے زوال کی وجہ غور وفکر نہ کرنا اور دینی علوم سے عدم واقفیت ہے۔ مسلمانوں کے ہاں دنیاوی تعلیم کے تو بہت ادارے قائم ہیں۔ مگر مذہبی تعلیم کے ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ بتانے کے بعد وہ نورانی مخلوق تو غائب ہو جاتی ہے۔ مگر آخر میں 'افسانے' کا مرکزی کردار کراچی کے ایک مدرسے کے لیے چندہ طلب کرنے لگتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ وہی مدرسہ ہے جہاں محقق کے بقول اس 'افسانے' کا مصنف اس زمانے میں دینی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس تحریر کے عنوان سے افسانے کا تصور ذہن میں نہیں آتا۔ بلکہ ایک نیم پختہ تحریر یا کہانی کا احساس ہوتا ہے۔ افسانے کا ابتدائی حصہ صبح کی سیر پر لکھا گیا مضمون لگتا ہے۔ آگے مرکزی کردار غیبی آواز سنتا ہے۔ اور ایک فرشتہ صورت مخلوق سے نہ صرف ملتا ہے بلکہ وہ اس سے مکالمہ کرتا ہے۔ جو دراصل 'فتح وظفر کی ملکہ' ہوتی ہے۔ وہ اسے دنیا میں مسلمانوں کی ترقی کے گُر بتاتی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے افسانے کا مرکزی کردار ایک مدرسے کے لیے چندے کا مطالبہ کرنے لگتا ہے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحریر میں ایسی کوئی خوبی سرے سے مفقود ہے جو کسی افسانے کا جوہر ہو سکتی ہے۔ یا جس کی بناء پر کسی تحریر کو ادب پارہ قرار دیا جا سکتا ہو۔ اب یہ کہنا کہ اس زمانے میں بلوچستان میں ایسے ہی افسانے لکھے جا رہے تھے یا لکھے جا سکتے تھے۔ تو یہ کوئی مناسب عذر نہیں ہے۔ یہ دونوں تحریریں جس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس وقت اردو میں کئی اہم افسانہ نگار سامنے آ چکے تھے۔ مثلاً سجاد حیدر یلدرم، حجاب امتیاز علی، نیاز فتح پوری اور پریم چند وغیرہ۔ فرمان فتح پوری نے تو بیسویں صدی کی تیسری دہائی کو اردو افسانے کا دوسرا دور قرار دیا ہے۔ [۵۰] اس زمانے میں ایک کچی پکی تحریر کو بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ قرار دینا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ بتایا گیا ہے ان لکھنے والوں نے اپنی تحریروں کو افسانہ قرار دیا ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف صنفِ افسانہ سے واقف تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی حد تک افسانہ لکھنے کی کوشش بھی کی۔ مگر وہ اس نئی صنف کی فنی باریکیوں سے پورے طور پر آشنا نہ تھے۔ اس لیے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔

بلوچستان میں اردو ناول:

افسانے کی طرح بلوچستان میں اردو ناول کے آغاز وارتقاء کے بارے بھی مختلف اور متضاد دعوے کیے جاتے رہے ہیں۔ کسی نے صرف ایک ناول کا نام لکھ دیا؛ کہ یہ بلوچستان میں ارود کا پہلا اردو ناول ہے؛ تو کوئی کسی

اخبار کے صفحات پر پہلے ناول کے نقوش تلاش کر پایا۔ مرزا رسوا جو برٹش دور میں محکمہ ریلوے میں ملازمت کے دوران کچھ عرصہ بلوچستان میں تعینات رہے۔ ان کے بارے کہا جاتا ہے، کہ انہوں نے اپنا معروف ناول امـــراؤ جـانِ ادا بلوچستان ہی میں لکھا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ یوں لگتا ہے اس حوالے سے سنی سنائی باتوں پر ہی یقین کیا گیا۔ بلوچستان کے محققین نے اس پہلو پر سنجیدگی سے مزید تحقیق اور غور وخوض کی زحمت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے، کہ اس حوالے سے عام وخاص میں غلط معلومات پھیلتی رہیں اور یہاں لکھے جانے والے پہلے ناول کا تعین اب تک نہ ہوسکا۔ کوئی محقق پورے تیقن اور تحقیقی شواہد کی بناء پر یہ بنیادی مسئلہ نہ بتا پایا کہ بلوچستان میں اردو کا پہلا مکمل ناول کون سا ہے اور یہ کس کی تصنیف ہے۔ آئندہ سطور میں اس حوالے سے پائی جانے والی اب تک موجود آراء کا تجزیہ کرتے ہوئے، بلوچستان میں اردو کے پہلے ناول کے بارے کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

کیا امراؤ جانِ ادا بلوچستان میں لکھا گیا؟

امراؤ جان ادا اگر واقعی بلوچستان میں لکھا گیا ہے تو اسے بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن ایسا کرنے سے قبل اس سارے قضیے کو بہ نظر تحقیق دیکھنا لازمی ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا (۱۸۵۸ـ۱۹۳۱) امـــراؤ جـانِ ادا سمیت کئی ناولوں کے مصنف تھے۔ وہ محکمہ ریلوے میں ملازمت کی وجہ سے کچھ عرصہ بلوچستان میں مقیم رہے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انعام الحق کوثر لکھتے ہیں:

> محمد ہادی رسوا اپنی بیوی کی وفات کے بعد لکھنو سے بددل ہوگئے۔ اسے خیر باد کہا اور رڑکی جا کر انجینئرنگ کالج میں داخل ہوگئے۔ رڑکی سے اوورسیئری کا امتحان پاس کرکے محکمہ ریل میں ملازمت اختیار کی اور بلوچستان پہنچ گئے۔ کہتے ہیں کوئٹہ لائن کا سروے مرزا صاحب نے کیا تھا۔[۵۱]

انعام الحق کوثر نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مرزا رسوا نے امـــراؤ جـانِ ادا یا کوئی اور ناول بلوچستان میں قیام کے دوران لکھا۔ تاہم یہ بات مشہور ہوگئی کہ بلوچستان ہی اس کلاسیکی ناول کا مقام تخلیق ہے۔ بلوچستان کے پڑھے لکھے لوگ متواتر اپنی گفتگو اور تحریروں میں اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ کوئٹہ سبی ریلوے لائن ۱۸۸۶ء میں بچھائی گئی تھی۔ ریلوے لائن بچھائے جانے کے دوران مرزا رسوا ضرور یہاں موجود تھے۔ اس بارے میں رضا علی عابدی لکھتے ہیں:

> جب یہ ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی۔ مرزا صاحب کی ملازمت کوئٹہ میں تھی وہ رڑکی انجینئرنگ کالج سے سند لے کر آئے تھے۔ اور اس ریلوے لائن کے سروے میں شریک تھے۔[۵۲]

رضا علی عابدی نے بھی رسوا کے کوئٹہ آنے کا ذکر تو کیا، مگر وہ ان کے ناول امرائو جان ادا کے قیام کوئٹہ کے دوران تحریر کیے جانے کے حوالے سے خاموش ہیں۔ کوئٹہ کے ادیب، شاعر، صحافی اور پی ایچ ڈی کی سند رکھنے والے محقق عرفان احمد بیگ اپنے ایک مضمون میں کوئٹہ سبی ریلوے لائن کی تعمیر کے ضمن میں یہاں امراؤ جان ادا کی تخلیق کے بارے میں دعویٰ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کہتے ہیں کہ جن دنوں یہاں ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی۔ اردو ادب کے معروف ناول نگار مرزا ہادی رسوا ان دنوں یہاں سب انجینئر کی حیثیت سے متعین تھے۔ اور انہوں نے اپنے شاہکار ناول امراؤ جانِ ادا کی تخلیق بھی بولان کے ان ہی پہاڑوں کے درمیان کی تھی۔[۵۳]

عرفان احمد بیگ نے بغیر کسی ثبوت اور حوالے کے صرف 'کہتے ہیں' کی بنا پر امراؤ جان ادا کا مقام تخلیق بولان کے پہاڑوں کو قرار دے دیا۔ یہ بات کس نے کب اور کہاں کی یا لکھی یہ بنیادی بات انھوں نے نہیں بتائی۔ حقیقت یہ ہے کہ عرفان بیگ کا دعویٰ سراسر من گھڑت اور بے بنیاد ہے، اس میں کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا رسوا بلوچستان میں ریلوے لائن بچھانے کے زمانے میں چھ آٹھ ماہ یہاں قیام پذیر رہے ہیں۔ رسوا کی زندگی اور فن پر تحقیقی کام کرنے والے محققین نے ان کے بلوچستان آنے کی بات کی ہے۔ ظہیر فتح پوری کے مطابق مرزا رسوا ۱۸۷۸ء یا ۱۸۷۹ء میں بلوچستان آئے تھے؛ مگر وہ یہ بھی بتاتے ہیں، کہ مرزا نے اپنا پہلا ناول افشائے راز ۱۸۹۶ء اور امراؤ جان ادا ۱۸۹۹ء میں لکھا تھا۔[۵۴] یعنی بلوچستان سے واپس جانے کے قریباً دس سال بعد ان کا یہ اہم ناول سامنے آیا تھا۔ لہٰذا اس بات میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا یا کوئی دوسرا ناول بلوچستان میں قیام کے دوران لکھا تھا۔

پہلا ناول:

بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول کون سا ہے اور یہ کس کی تخلیق ہے؟ یہ ایک بحث طلب سوال ہے۔ انعام الحق

کوثر نے ایک اور ناول کے بارے میں بعض نامکمل معلومات مہیا کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۰ء کے مابین لورالائی ہی میں ایک ناول بنام محبت کا دیوتا عرف برابر کی چوٹ جناب جگن ناتھ سیٹھی ایک ہندو تاجر نے شائع کرایا جسے لورالائی کے اکثر اہلِ ذوق حضرات نے پڑھا۔ افسوس کہ اب یہ ناول نایاب ہے۔ ۵۵

انعام الحق کوثر کے محولہ بالا بیان کے باعث اس ناول کو عموماً بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ناول بھی دستیاب نہیں ہے نہ ہی اردو ناول کے کسی تحقیقی یا تنقیدی جائزے میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ انعام الحق کوثر نے بھی یہ نہیں لکھا کہ خود انہوں نے یہ ناول پڑھا، یا کم از کم اسے دیکھا ہے۔ پھر انھوں نے اس ناول کو پڑھنے والے بقول ان کے 'اہلِ ذوق حضرات' کے بارے میں بھی کچھ معلومات فراہم نہیں کیں کہ یہ کون لوگ تھے؟ انھوں نے اس ناول کو کب پڑھا تھا؟ اور کوثر کو اس بارے کب اور کہاں بتایا تھا؟ اس کا پلاٹ، کہانی یا موضوع کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ جب تک ایسے بنیادی سوالوں کے جواب نہ دیے جائیں۔ کسی ادب پارے کی موجودگی پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اقتباس کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس ناول کے مصنف یعنی جگن ناتھ سیٹھی کو ایک تاجر لکھا ہے۔ یہ واضح نہیں کہ آیا وہ اس ناول کا مصنف بھی ہے یا اس نے صرف اسے شائع کیا تھا اور یہ کسی دوسرے مصنف کی تحریر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ لورالائی میں اس زمانے میں چھاپہ خانہ نہیں تھا۔ یہ لامحالہ لاہور، کراچی یا ہندوستان کے کسی دوسرے شہر سے شائع ہوا ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو اس ناول کا ذکر کہیں اور کیوں نہیں ملتا۔ تیسری اور اہم بات اس مجوزہ ناول کا عنوان ہے یعنی محبت کا دیوتا عرف برابر کی چوٹ اگر بہ دقتِ نظر دیکھا جائے تو یہ کسی طور ایک ادبی ناول کا عنوان نہیں لگتا۔ البتہ یہ کسی سطحی رومانوی قصے کا نام ضرور لگتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی تحریر ہو سکتی ہے جسے شاید ہی ناول کے درجے پر فائز کیا جا سکتا ہو۔ تاہم اس بارے میں کوئی حتمی بات کرنا اس ناول کی دستیابی کے بعد ہی ممکن ہو جائے گا۔ جب تک یہ ناول دستیاب نہیں ہوتا اور تنقیدی قرأت کے بعد اس کی صنف کا تعین نہیں ہو جاتا اسے بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ انعام الحق کوثر نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل اس مقالہ نگار کو بتایا تھا، کہ انھوں نے یہ ناول پڑھا یا دیکھا تو نہیں؛ البتہ اس ناول کے بارے میں لورالائی کے کچھ لوگوں سے سنا تھا، جس کی بناء پر اس کا تذکرہ اپنی کتاب میں کیا۔ ۵۶

کچھ عرصہ قبل ضیاء الرحمٰن نے اپنے ایک مقالے میں ایک ناول کی بازیافت کا دعویٰ کیا۔ جس کا مصنف

بقول ان کے مولا نا ہوت بلوچستانی تھا۔ان کے بقول اس ناول کا عنوان بلوچستان کا مجبور بدمعاش ہے۔ضیاء الرحمٰن کے مطابق یہ ۹ فروری ۱۹۳۶ کو ہفت روزہ بلوچستان کراچی میں شائع ہوا تھا۔[۵۷] انھوں نے اس ناول کا صرف ایک حصہ فراہم کیا ہے، جو زیادہ سے زیادہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔ضیا الرحمٰن اس ہفت روزہ کی دسمبر ۱۹۳۶ تک کی مزید اشاعتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں، کہ ان میں اس ناول کی باقی اقساط نہیں ملتیں؛ گویا انہیں اس تحریر کے باقی ماندہ حصے تلاش کرنے میں ناکامی ہوئی۔اس کے باوجود فاضل محقق نے اپنے تجزیے میں اس نامکمل تحریر کو ناول کا حصہ ہی قرار دیا ہے؛ حالانکہ اس کے متن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ، یہ کسی افسانے یا ڈرامے کا حصہ بھی ہوسکتا ہے۔یاد رہے کہ اسے حصہ کہا گیا ہے مکمل افسانہ یا ڈرامہ نہیں۔اس تحریر کو کسی ناول کا حصہ یا ناول اس وقت تک نہیں کہا جا سکتا جب تک ناول کی شکل میں پوری کہانی دستیاب نہ ہو۔چاہے لکھنے یا شائع کرنے والے نے اسے ناول ہی کیوں نہ قرار دیا ہو۔ایک اقتباس یا زیادہ سے زیادہ دو صفحات پر مشتمل تحریر کو بلوچستان کا پہلا ناول یا پہلے ناول کے ابتدائی اوراق قرار دینا قرینِ انصاف نہیں۔یہ بات معیاری تحقیق کے اصولوں کے خلاف ہے۔اس لیے محققین کو اس باب میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل احتیاط برتنا ہوگی۔اور اس تحریر کے باقی ماندہ حصوں کی بازیافت کو یقینی بنانا ہوگا۔اس سے پہلے کسی نامکمل تحریر کو ناول تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول کون سا ہے اور اس کا مصنف کون ہے۔اس مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق بلوچستان میں لکھا جانے والا پہلا ناول داستانِ مجاہد ہے جو نسیم حجازی کی تخلیق ہے۔اس کے علاوہ بھی نسیم حجازی نے اپنے کئی ابتدائی ناول بلوچستان میں ہی لکھے، جن کا احوال آگے تفصیل سے دیا جاتا ہے۔

بلوچستان میں نسیم حجازی کا قیام اور ناول نگاری:

نسیم حجازی (۱۹۱۹ء۔۱۹۹۶ء) بلوچستان میں تحریک پاکستان کے ایک اہم کردار میر جعفر خان جمالی کے اخبار تنظیم سے بطور مدیر وابستہ ہو کر ۱۹۴۲ء میں کوئٹہ آئے اور ۱۹۴۹ء تک وہ یہاں قیام پذیر رہے۔[۵۸] اپنے قیام کے دوران وہ نہ صرف مذکورہ اخبار کی ادارت کرتے رہے بلکہ تحریک پاکستان میں بلوچستان کی شمولیت کے حوالے سے کافی سرگرم رہے۔وہ اس دوران بلوچستان کے مختلف سرداروں سے بھی رابطے میں رہے تاکہ انھیں بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کے لیے آمادہ کریں۔انھوں نے بلوچستان کے مختلف سرداروں کے مابین ہونے والے مذاکرات میں رابطہ پل کا کردار ادا کیا۔ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جہانگیر شاہ جوگیزئی لکھتے

ہیں۔ ''خدا کی قسم نسیم حجازی اگر ان دنوں بلوچستان میں نہ ہوتا تو بلوچستان کا الحاق پاکستان کے ساتھ مشکوک نظر آتا تھا۔'' [۵۹]

اس طرح پاکستان میں بلوچستان کی شمولیت میں ان کا بھی حصّہ ہے۔ نسیم حجازی کی زندگی کا یہ ایسا پہلو ہے جس سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ سیاست اور صحافت کے ساتھ ساتھ نسیم حجازی قلمی حوالے سے بھی مصروف کار رہے۔ انھوں نے اپنے عرصہ قیام کے دوران اپنے کئی ابتدائی ناول بلوچستان ہی میں لکھے تھے۔ انعام الحق کوثر نے ان کے صرف ایک ناول شاہین کے کوئٹہ میں لکھے جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ [۶۰] جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا پہلا ناول داستان مجاہد کوئٹہ ہی میں لکھا گیا اور یہ بلوچستان میں لکھا گیا اردو کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول کا انتساب بھی میر جعفر خان جمالی کے نام ہے۔ نسیم حجازی کے لکھے گئے پیش لفظ کے نیچے مقام اور تاریخ یوں درج ہے۔ کوئٹہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۳ء۔ ذیل میں داستان مجاہد کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

داستان مجاہد

جیسا کہ نسیم حجازی کی شہرت ایک تاریخی ناول نگار کی ہے، ان کا پہلا ناول داستانِ مجاہد اس رجحان کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ نسیم حجازی پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> مسلمانوں کے ماضی کی داستان دنیا کی تمام قوموں کی تاریخ سے زیادہ روشن ہے۔ اگر ہمارے نوجوان غفلت اور جہالت کے پردے اٹھا کر اس روشن زمانے کی معمولی سی جھلک بھی دیکھ سکیں تو مستقبل کے لیے انھیں ایک ایسی شاہراہ عمل نظر آئے گی جو کہکشاں سے زیادہ درخشاں ہے۔ [۶۱]

محولہ بالا اقتباس سے مصنف کا مطمع نظر صاف عیاں ہے کہ وہ اپنے ناول کے ذریعے زمانہ حال کے نوجوانوں کو مسلم نشاۃ الثانیہ کے لیے فکری اور عملی طور پر بیدار کرنا چاہتا ہے۔ اس ناول کا زمانہ ۷۰ھ سے ۱۲۳ھ کے اموی خلفا کا ہے جب مسلمان صحرائے عرب سے نکل کر دنیا کے دیگر حصّے فتح کر رہے تھے۔ ناول میں خلیفہ ولید کے زمانہ کی مسلم فتوحات اس کے جانشین مسلمان کی پے در پے شکستیں اور پھر خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے خلیفہ بننے کی روداد ملتی ہے۔ ناول کا ہیرو نعیم بصرہ کا رہنے والا ہے، جو فن سپاہ گری میں طاق ہے؛ اسے اپنے فن کی بدولت اس عہد کے تین اہم جنگجو سپہ سالاروں محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم جاہلی اور طارق بن زیاد کی قربت ملتی ہے۔ اس کا بیشتر وقت قتیبہ بن مسلم کے ساتھ ترکمانستان اور سمرقند کے علاقے فتح کرنے میں گزرتا ہے۔ وہ اس کی فوج کا ایک اہم سالار

ہوتا ہے۔نعیم کا والد بھی ایک مجاہد تھا جو اسلام کی راہ میں شہید ہوتا ہے۔وہ اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ اسی راستے کا مسافر ہوتا ہے۔نعیم کئی جنگوں میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور وہ ایک اچھا مقرر بھی ہوتا ہے، جو نوجوانوں کو جہاد کے لیے آسانی سے آمادہ کر لیتا ہے۔

ابن صادق اس ناول کا ولن ہے جو مسلم نوجوانوں کو جہاد پر جانے سے روکتا ہے۔ وہ نعیم اور دیگر سپہ سالاروں کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔خلیفہ سلیمان اسی کے کہنے پر محمد بن قاسم اور دیگر اہم سالاروں کو اہم فوجی خدمات کے باوجود خوفناک انجام سے دوچار کرتا ہے۔خلیفہ سلیمان کے دنیا سے گزرنے پر نعیم اور دیگر سالاروں کی تکالیف ختم ہوتی ہیں اور ابن صادق اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔نعیم کی زندگی میں مختلف اوقات میں تین لڑکیاں آتی ہیں مگر وہ بالآخر نرگس سے شادی کرتا ہے۔نعیم اپنے بھائی اور عبداللہ کے بیٹوں کو بھی جہاد پر روانہ کرتا ہے اور ایک سفر سے واپسی پر مختلف مصائب کا شکار ہوتے ہوئے گھر پہنچ کر انتقال کر جاتا ہے۔ناول کے کردار خود بھی جہاد کرنے کے ساتھ گھر گھر جا کر دوسروں کو بھی جہاد کے لیے اکساتے نظر آتے ہیں۔ یہ ناول تاریخِ اسلام کے ایک اہم باب کو قصے کی شکل میں عمدگی سے پیش کرتا ہے، جو لوگ اس طرح کے ناولوں کو پسند کرتے ہیں؛ نسیم حجازی کا یہ پہلا ناول ہی ایسے لوگوں کی دلچسپی کا وافر سامان رکھتا ہے۔اس میں ان کی تحریر کا جوہر کھل کر سامنے آتا ہے، جو اپنے دلچسپ انداز بیان کی بدولت عام پڑھنے والوں کو اپنا اسیر کر لیتا ہے اور یوں تاریخی ناول کی صورت نسیم حجازی کا یہ پہلا نقش ہی ایک خاص سطح کے قارئین کو متاثر کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

محمد بن قاسم

یہ نسیم حجازی کا دوسرا ناول ہے جو کوئٹہ میں لکھا گیا۔اس کے پیش لفظ میں نسیم حجازی نے بتایا ہے کہ داستان مجاہد کی کامیابی کے بعد آنے والے قارئین کے خطوط نے فاتح سندھ محمد بن قاسم کی شخصیت پر یہ ناول لکھنے پر اکسایا۔مصنف نے پیش لفظ کے آخر میں میر جعفر خان جمالی [بلوچستان کا معروف سیاست دان جس کے نام ناول داستان مجاہد کا انتساب ہے] کا اس ناول کے لکھتے ہوئے مختلف سہولیات مہیا کرنے کا اعتراف کیا ہے، جس کی بنا پر وہ اسے مکمل کر سکے۔ناول محمد بن قاسم کے دو حصے ہیں پہلا حصہ ''ناہید'' کے عنوان سے ہے۔یہ اس لڑکی کی داستان پر مشتمل ہے، جس نے حجاج بن یوسف کے نام وہ تاریخی خط لکھا تھا؛ جس کی بدولت حجاج نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو سندھ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔اس حصے میں ناہید کے جزیرہ سراندیب [حاشیے میں

اسے سری لنکا یا برما قرار دیا گیا ہے] سے دیبل تک پہنچنے کے واقعات قصے کی باریکیوں سمیت دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

ناول کا دوسرا حصّہ ''کمسن اور نوجوان سالار'' کے عنوان سے ہے اور یہ سترہ سالہ محمد بن قاسم کے ابتدائی حالات سے سندھ فتح کرنے عوام میں مقبولیت حاصل کرنے اور پھر خلیفہ ولید کے انتقال کے بعد سلیمان کے خلیفہ بننے پر فاتح سندھ کے عبرت ناک انجام کے واقعات پر مشتمل ہے۔

ناول میں مسلمان نوجوانوں کے فنون حرب میں دلچسپی مہارت اور جذبہ جہاد کے ساتھ ساتھ ان کی اولعزمی کا بیان ملتا ہے۔ ناول میں پیش کیے گئے مختلف نوجوان لڑکیوں کے کردار بھی جنگی مہارت رکھتے ہیں مگر وہ اپنے حسن سے نوجوانوں کے دل بھی فتح کرتی ہیں۔ مسلمان نوجوان بھی زاہد خشک نہیں ہوتے وہ بھی انسانی سطح پر اپنے محبت بھرے جذبات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ سندھ کے کئی مقامی کردار بھی مسلمان کرداروں کے اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے ہیں۔ ایک عورت کے بیانیے کے حوالے سے ذیل کا اقتباس نہایت اہم ہے۔ جب مایا گنگو سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

> میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ بھائی نے مجھے اپنے مقصد پر قربان کرنا چاہا اور میں آپ کے قبضے میں آ گئی۔ اب آپ مجھے بیٹی کہہ کر اپنے مقصد کے لیے پھر اس کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں ۔۔۔ کاش! میری تقدیر میرے ہاتھ میں ہوتی۔ کاش مجھے اس دنیا میں اپنا راستہ تلاش کرنے کا حق ہوتا لیکن میری پسند ناپسند کے کوئی معنی نہیں۔ میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔[۶۲]

مایا کی گفتگو اس کا ذاتی المیہ ہی نہیں بلکہ یہ اس عہد کی عورت کی مجموعی حیثیت کو پیش کرتی ہے۔ ایسی تحریر کی تانیثی قرات سے اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ ایسے جملوں سے نسیم حجازی کے ناولوں کو اور ان کی تحریروں کے سنجیدہ مطالعے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ناول *محمد بن قاسم* میں کئی جگہ بلوچستان کے علاقے مکران کا ذکر آتا ہے، جہاں عرب حکمران ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقہ اس وقت فتح ہو چکا تھا۔ محمد بن قاسم کے بارے میں بتایا گیا ہے، کہ وہ بھی سندھ پر حملے کے لیے شیراز کے راستے پہلے مکران آتا ہے اور پھر لسبیلہ کے علاقے کو فتح کرتے ہوئے سندھ کے دوسرے شہروں کا رُخ کرتا ہے۔[۶۳] ناول میں یہ ایک نئی بات لگتی ہے ورنہ عام نقطہ نظر تو یہ ہے کہ محمد بن قاسم دیبل پر

سمندر کے راستے حملہ آور ہوا تھا۔قبل ازیں کامل القادری کے حوالے سے محمد بن قاسم کے شیراز کے رستے مکران اور پھر دیبل پہنچنے کا حال اس مقالے کے پہلے باب میں لکھا جا چکا ہے۔نسیم حجازی اپنا ناول محمد بن قاسم ۱۹۴۵ء میں لکھ چکے تھے۔محمد بن قاسم کے خشکی کے راستے دیبل یا سندھ پہنچنے کی بات کی اولیت کا سہرا ان کے سر جاتا ہے۔کامل القادری نے اس کے بعد یہ بات اپنی کتاب میں لکھی ہے[اس کا تذکرہ پہلے باب میں ہو چکا ہے]۔انھوں نے اگرچہ اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا،مگر یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ وہ نسیم حجازی کے اس ناول سے بے خبر نہیں رہے ہوں گے۔

ناول محمد بن قاسم اپنے موضوع کے علاوہ قصے کے بیان،کرداروں کی تشکیل،جاندار مکالمے اور دلچسپ انداز بیان کی وجہ سے قابل قرأت ہے اور شاید اسی وجہ سے قارئین میں خاصا مقبول ہے۔

شاہین

یہ تیسرا ناول ہے جو نسیم حجازی نے کوئٹہ میں قیام کے دوران لکھا۔نسیم حجازی نے اس کے پیش لفظ میں اپنے نام کے ساتھ جو تاریخ لکھی ہے وہ ۱۵ نومبر ۱۹۴۸ء ہے مگر اس میں ایک خاطر خواہ حصّہ وہ اگست ۱۹۴۷ء تک لکھ چکے تھے۔وہ اس بارے میں لکھتے ہیں۔''اس کا بیشتر حصّہ ۱۵۔اگست ۱۹۴۷ء تک لکھا جا چکا تھا لیکن ۱۵ اگست کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کے باعث میں اس کتاب کو اپنے پروگرام کے مطابق ختم نہ کر سکا۔''[۶۴]

دیکھا جائے تو یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کی آزادی کے بعد پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔نسیم حجازی اس وقت بلوچستان کے دیگر مسلم لیگی زعما کے ساتھ بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کے لیے سرگرم تھے۔ان بحرانی حالات کی وجہ سے وہ یہ ناول ۱۹۴۸ء میں جا کر مکمل کر سکے۔نسیم حجازی کا ناول شاہین اندلس میں مسلمانوں کے زوال کی کہانی ہے۔اندلس میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کے بعد کئی اہم علاقے مثلاً قرطبہ،اشبیلیہ،طلیطلہ اور دوسرے کئی علاقے مسلمانوں سے چھن چکے تھے۔غرناطہ مغلوب مسلمانوں کا آخری حصار تھا۔ شاہین بالخصوص غرناطہ میں ہونے والی لڑائیوں کو موضوع بناتا ہے۔اس میں یوں تو اس وقت کے کئی تاریخی کردار نظر آتے ہیں مگر اس کا ہیرو بدر بن مغیرہ ہے۔وہ غرناطہ کے عیسائی حاکم فرڈی نینڈ سے جنگیں کرتا نظر آتا ہے۔ناول میں اسے سرحدی عقاب کا لقب دیا گیا ہے۔شاید اسی لیے اس کا عنوان شاہین رکھا گیا ہے۔ان عنوانات اور ناول کے آغاز میں اقبال کے اشعار سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نسیم حجازی علامہ اقبال سے کافی متاثر تھے۔یہ ایسا موضوع ہے

جس کا تا حال تحقیقی یا تنقیدی مطالعہ نہیں کیا گیا۔

آخری چٹان

یہ ناول چنگیز خان کی مسلم دنیا پر حملوں کی داستان ہے اس کے تین حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں صلاح الدین ایوبی کے عہد میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کا احوال ملتا ہے۔ یوسف نامی سپاہی صلاح الدین ایوبی کے ساتھ یروشلم پر حملے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جس پر وہ اسے اپنی تلوار انعام میں دیتا ہے اور اس کی وفات پر اس کے بیٹے طاہر کی کفالت کا اعلان کرتا ہے۔ اسی حصّے میں طاہر بن یوسف کے ابتدائی حالات اور اس کے خلافت عباسیہ کے مرکز بغداد جا کر سیاسی و سماجی سطح پر اہمیت حاصل کرنے کے واقعات اور اس عہد کے بغداد کا حال بیان ہوا ہے۔ دوسرے حصّے میں طاہر خلیفہ بغداد کا ایلچی بن کر چنگیز خان کے پاس جاتا ہے اور اسے خوارزم پر حملوں سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے ورنہ بصورت دیگر وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے علاؤالدین خوارزم شاہ کی حمایت میں اعلان جہاد کر دیں گے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہوتا اور چنگیز خان خوارزم پر حملہ کر کے ان کے شہر قوقند پر قبضہ کر لیتا ہے۔ تیسرا حصّہ اس ناول کے اصل ہیرو یعنی علاؤالدین کے فرزند جلال دین خوارزم شاہ کی ان مزاحمتوں کے بیان پر مشتمل ہے جو اس نے چنگیز خان کے آگے مردانہ وار کیں اور ایک عرصہ تک نہ صرف اس کی پیشرفت روکے رکھی بلکہ کئی لڑائیوں میں اسے شکست بھی دی۔ طاہر بن یوسف بھی جلال الدین کے ساتھ ان لڑائیوں میں حصّہ لیتا ہے اور ناموری پاتا ہے۔ جلال دین خوارزم شاہ کوشش کرتا ہے کہ اُسے ہندوستان کے مسلمان بادشاہ التمش اور خلیفہ بغداد کی اعانت مل جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے تاتاری فتنے کو ختم کر دے گا مگر التمش اور خلیفہ بغداد اندرونی خلفشار اور نااہل وزیروں کے مشورے کے باعث اس کی اعانت نہیں کر پاتے جس سے مایوس ہو کر وہ ایک رات نامعلوم مقام کی طرف اکیلا چل پڑتا ہے اور پھر اس کا سراغ نہیں ملتا۔

آخر کار تاتاری فوج چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کی زیر قیادت بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتی ہے اور شہر کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ نسیم حجازی نے جلال الدین خوارزم شاہ کو اس ناول میں آخری چٹان قرار دیا ہے۔ ۶۵

ممتاز احمد خان نے اپنی کتاب آزادی کے بعد اردو ناول میں اس بات کا ذکر تو نہیں کیا کہ نسیم حجازی نے اپنے ابتدائی ناول کوئٹہ میں قیام کے دوران لکھے ہیں۔ تاہم وہ نسیم حجازی کی ناول نگاری کا مختصر تذکرہ اسلامی اور تاریخی رجحان کے تحت کرتے ہوئے اور اس کی اہمیت جتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

دنیا کے ہر ادب میں ایسے لوگ مل جائیں گے جن کا مشن قلم کے ذریعے باطل و شورش انگیز نظریات کی تطہیر اور ان کے سوئے ہوئے جذبے کی تعمیر نو ہوتا ہے۔۔۔ بالکل اسی طرح نسیم حجازی کے تاریخی ناول اس اسلامی ادب کی روایت کا حصہ ہے جس کا افتتاح ۱۸۶۹ء میں ڈپٹی نذیر احمد کے ہاتھوں مراۃ العروس کی تخلیق کے موقع پر ہوا۔۶۶

نسیم حجازی کا تفصیلی تذکرہ یا ان کے ناولوں کی تنقید ممتاز احمد خان کی کتاب میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ انہوں نے البتہ نسیم حجازی کی زندگی اور ادبی خدمات پر کولمبیا پسفیک یونیورسٹی کیلی فورنیا میں پی ایچ۔ڈی ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے نسیم حجازی کے ناولوں کی ادبی و تاریخی اہمیت مزید اجاگر ہوتی ہے۔

مجموعی جائزہ

بلوچستان میں اردو زبان وادب کی ایک مضبوط روایت موجود ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط تر ہوتی جارہی ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے بلوچستان کے مختلف ماہرین نے بھی اسی طرح بلوچستان میں اردو کی پیدائش کا دعوی کیا ہے جیسا کہ اردو زبان کے ارتقائی تناظر میں پاک و ہند کے دیگر علاقوں یعنی پنجاب، سندھ، دکن اور دہلی کے حوالے سے دعاوی موجود ہیں۔ البتہ بلوچستان کے ماہرین زبان وادب اس طرح کا مدلل اور تفصیلی دعویٰ پیش نہیں کر سکے جیسا کہ دیگر علاقوں کی نسبت پایا جاتا ہے۔ پنجاب، سندھ اور دکن و دہلی کے حوالے سے ان علاقوں میں اُردو زبان کی قدیم جڑیں تلاش و دریافت کرنے والے ممتاز مشاہیر ہیں مثلاً حافظ محمود خان شیرانی ''پنجاب میں اُردو'' اور سید سلیمان ندوی ''سندھ میں اردو'' کی پیدائش کے حوالے سے معروف ہیں۔ ان دونوں محققین کا شمار ایسے ماہرین میں ہوتا ہے جو نہ صرف اردو میں ادبی اور لسانی تحقیق کے بنیاد گزار ہیں بلکہ ان کی تحقیق اس قدر بلند پایہ ہے کہ ان کی تصنیفات اور تحریریں تحقیق کے میدان میں اب ایک مثال اور حوالے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ دوسری طرف بلوچستان میں اردو کی پیدائش کے نظریے کے حق میں لکھنے والے اگر چہ بلوچستان کی سطح پر تو اہم ادبا اور محققین شمار ہوتے ہیں مگر قومی سطح پر یا اُردو زبان وادب کے مجموعی دھارے میں ان کی خدمات اس قدر نمایاں نہیں ہیں۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ چاہے محمود خان شیرانی ہوں، سلیمان ندوی اور یا نصیرالدین ہاشمی ہوں، ان تمام اکابرین نے اردو کی پیدائش کے حوالے سے اپنے اپنے علاقوں سے متعلق نہایت ٹھوس اور مدلل دلائل کتابی صورت میں پیش کیے ہیں۔ ان کے مقدمات تاریخی مطالعات کے ساتھ ساتھ زبان کے لسانی ڈھانچے، قواعدِ زبان اور مقامی وغیر مقامی لفظیات کی بنیاد پر بہ تفصیل پیش کیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریات کے حق ورد میں کیے گئے تفصیلی مباحث تاریخ زبان وادب کا قابل قدر حصّہ ہیں۔

بلوچستان میں اردو کی پیدائش کے نظریے یا دعوے کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ دعویٰ کرنے والے زبان کے ٹھوس اور گہرے مطالعات پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں اور ان میں لسانی تحقیق کا بھی فقدان نظر آتا ہے۔ بلوچستان میں اردو کی پیدائش کا دعوی سب سے پہلے کامل القادری نے اپنے ایک مضمون میں کیا۔ اپنے دعویٰ کی بنیاد انھوں نے صرف تاریخی واقعات پر رکھی جس کا لب لباب یہ ہے کہ چونکہ عرب سندھ سے پہلے بلوچستان وارد ہوئے تھے لہٰذا عربی اور مقامی زبانوں کے تال میل سے اُردو پیدا ہوئی۔ اس ذیل میں وہ سندھی

اور فارسی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ صرف مقام کی تبدیلی کے علاوہ یہ بعینہٖ وہی دعویٰ ہے جو سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب نقوش سلیمانی میں سندھ کے حوالے سے کیا۔ کامل القادری کے بعد بلوچستان کے کسی محقق نے اس نظریے کو سنجیدگی سے موضوع تحقیق نہیں بنایا بلکہ کسی دوسرے موضوع پر لکھتے ہوئے انہوں نے بر سبیل تذکرہ اس دعوے کی تائید و توثیق کی۔ ایسے لوگوں میں انور رومان، انعام الحق کوثر، عبدالرحمٰن براہوئی اور عبدالرزاق صابر وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ انعام الحق کوثر نے تو بلوچستان میں اردو زبان کی پیدائش کے نظریے کی توثیق اپنی مرتبہ تالیف بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات کے مقدمے میں کی ہے۔ اس کتاب میں بلوچستان میں لکھے گئے دفتری اور نجی خطوط مرتب کیے گئے ہیں۔ تقریباً یہی حال دیگر لکھاریوں کا ہے۔ جنھوں نے بلوچستان میں اردو کی پیدائش کے نظریے کی حمایت کی۔ چونکہ بلوچستان میں اردو کی پیدائش کا نظریہ منضبط اور مدلل صورت میں سامنے نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے علمی حلقوں میں اس کے حق یا رد میں کوئی بات نہیں کی گئی۔ اکثر لوگ تو اس طرح کے کسی نظریے سے تفصیلی طور پر واقف بھی نہیں۔ جبکہ اس حوالے سے بعض غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً انعام الحق کوثر کی کتاب بلوچستان میں اردو کو محمود خان شیرانی کی پنجاب میں اردو کی طرح ''بلوچستان میں اردو کی پیدائش کا نظریہ'' قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ کتاب بلوچستان میں اردو ادب کے جائزے پر مشتمل ہے اس کا زبان کے لسانی ارتقاء سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بلوچستان میں اردو زبان کی پیدائش کے نظریے سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ اردو بہ طور زبان یہاں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ گروہی سطح پر نہ سہی انفرادی طور پر ہی سہی مگر یہاں اردو زبان جاننے والے لوگ موجود رہے ہیں۔ بلوچستان کے ماہرین ادب بلوچستان سے اردو زبان کے رابطے کے چار درجے بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک بلوچستان سے اردو کا پہلا رابطہ میر چاکر رند اور گہرام لاشاری کے عہد میں سولہویں صدی میں ہوا جب یہ دونوں قبائل اپنی جنگ ملتان وغیرہ تک لے گئے اور وہاں یہ لوگ اردو سے روشناس ہوئے۔ دوسرا رابطہ اس وقت ہوا جب ریاست قلات کا حاکم میر نصیر خان احمد شاہ ابدالی کے کہنے پر ایک بلوچ لشکر تشکیل دے کر پانی پت میں مرہٹوں کے خلاف لڑا۔ بلوچستان سے اردو کا تیسرا رابطہ سید احمد شہید کی معیت میں آنے والی جماعت کی شکل میں ہوا یہ لوگ جہاد میں معاونت کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ چونکہ یہ لوگ اردو بولنے والے تھے اس لیے اہل بلوچستان کا رابطہ ان کے طفیل اردو زبان سے ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان سے اردو کے یہ تینوں مدارج کمزور تر سطح پر نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ رابطے بہت مختصر وقت کے لیے ہوئے اور دوسرے تینوں دفعہ یہ رابطے حالت جنگ میں ہوئے۔ کسی

جنگ کے موقع پر ایک زبان کی ترویج وتعلیم ایک دشوار امر ہے۔ اس لیے یہ کہنا نامناسب نہیں ہے کہ ان تینوں رابطوں میں بلوچستان میں اردو زبان کے ارتقا کی بات محض قیاس آرائی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

بلوچستان میں اردو زبان کا چوتھا رابطہ انگریز عہد میں ہوا اور یہی حقیقی رابطہ ہے۔ جب یہاں اردو یہاں سرکاری زبان قرار دی گئی۔ اردو میں نہ صرف تدریس وتعلیم شروع ہوئی بلکہ نئے قائم ہونے والے سرکاری دفاتر میں اردو سے دفتری زبان کا کام لیا جانے لگا۔ انگریز دور میں صحیح معنوں میں یہاں اردو زبان اور ادب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ جو اب ایک مضبوط روایت میں ڈھل چکا ہے۔

اگر چہ بلوچستان میں اردو زبان وادب کا باقاعدہ آغاز انگریز دور میں ہوا مگر جیسا کہ پہلے کہا گیا انفرادی طور پر یہاں ایسے لوگ موجود تھے جو نہ صرف اردو زبان جانتے تھے بلکہ اس میں تحریر وتخلیق کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔ ایسی ایک مثال محمد حسن براہوی کی ہے جو ریاست قلات میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھا۔ وہ فارسی اور براہوی میں شعر کہنے کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ انعام الحق کوثر نے اس کی قریباً اٹھہتر غزلوں پر مشتمل دیوان مرتب کر کے مع اپنے مقدمے کے شائع کیا ہے۔

محمد حسن براہوی بلوچستان میں اردو زبان کا پہلا باضابطہ اور صاحب دیوان شاعر ہے جس نے انگریز کی آمد سے قبل انیسویں صدی کے وسط میں اردو زبان کو شاعری کا ذریعہ بنایا۔ حسن براہوی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اگر چہ اُسے بلوچستان میں اردو ادب کے حوالے سے زمانی برتری اور تفوق حاصل ہے مگر اس کی شاعری فنی طور پر پست، بے رنگ اور اکہری ہے۔ اس کی شاعری محبوب کے حسن و جمال کے بیان اور عشق مجازی کو موضوع بناتی ہے۔ زبان اور موضوع کے حوالے سے حسن براہوی کی شاعری پر ولی دکنی کے اثرات واضح نظر آتے ہیں مگر محدود پیمانے پر حسن براہوی بھی ولی دکنی کی تقلید میں اپنے محبوب کے سراپا کو خوبصورتی میں تمام فطری مظاہر یعنی پھول، خوشبو، چاند، سورج اور ستاروں پر فوقیت دیتا ہے۔ وہ اشیائے عالم کے مقابلے میں اپنے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے جس کے سامنے باقی ہر شے ماند پڑ جاتی ہے اور اپنی رعنائی کھو دیتی ہے۔ حسن براہوی کی شاعری میں کلاسیکی شعریات کی تمام لفظیات انہی معنوں میں ملتی ہیں جن میں وہ قدیم زمانے میں مروج رہی ہیں مثلاً آب، روح افزا، شراب، مکھ، صنم، لب، پری رخسار، قامت، قمر، مشتری، شمس، خورشید، سمن، یاسمن، لالہ، پھول رعنا [گل رعنا] گلشن اور قیامت وغیرہ۔ حسن براہوی ان تمام لفظیات یا عناصر کو اپنے محبوب کے

جمال اور خدوخال اجاگر کرنے میں اس طرح استعمال میں لاتا ہے کہ حسن محبوب نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ جبکہ ان اشیا کی تاب کم پڑتی نظر آتی ہے اور یہ اس کے مقابلے میں ہیچ نظر آتے ہیں۔

حسن براہوی کے بعد ایک طویل عرصہ خاموشی میں گزر جاتا ہے اور بلوچستان کے ادبی افق پر کوئی اردو شاعر نمودار نہیں ہوتا۔ اس دوران البتہ یہاں اردو نثر میں ابتدائی کام سامنے آتا ہے۔ یہ ہتورام کی کتابیں گل بہار اور بلوچی نامہ ہیں جو بالترتیب ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئیں۔ ہتورام ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے تھے اس زمانے میں یہ علاقہ بلوچستان میں شامل تھا۔ وہ ایجنٹ ٹو گورنر جنرل بلوچستان رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ بہ طور نیٹو اسسٹنٹ منسلک ہو کر برٹش بلوچستان اور ریاست قلات آیا اور اس کی عمر کا بیشتر حصہ یہاں ملازمت میں گزرا۔ اس نے اپنی پہلی کتاب گل بہار میں ڈیرہ غازی خان اور اس کے اطراف کی بستیوں، وہاں کے قبائل اور بلوچستان کے بعض قبائل کا تذکرہ کیا ہے۔ ہتورام کی تصنیف بلوچی نامہ انگریز اور بعض افراد کو بلوچی سکھانے کی غرض سے شائع کی گئی تھی۔ اس میں بلوچی زبان کے قواعد، لفظیات، ضرب الامثال اور بلوچی اشعار کے ساتھ بلوچ ثقافت اور رواج کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہتورام کی یہ کتابیں انگریزی اقتدار کو مضبوط کرنے اور طول دینے میں معاونت کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ ان کتب میں اس کا اسلوب داستانوی ہے۔ وہ لفظ کے استعمال اور جملوں کی ساخت میں قدیم طرز تحریر کی تقلید کرتا ہے۔ ان میں عربی اور فارسی الفاظ وتراکیب بھی ملتی ہیں اور بعض مقامی لفظ مثلاً پشتو لفظ چاغ وغیرہ۔ اس کی تحریر کی صورت اردو میں مقامی عنصر کی اولین موجودگی ہے۔ اس سے ہتورام کا لسانی شعور اجاگر ہوتا ہے۔ اس نے اردو میں مقامی لفظیات کی شمولیت کی ابتداء کی جو بعد میں بلوچستان میں لکھی جانے والی اردو نظم ونثر میں ایک نمایاں رجحان کے طور پر ملتی ہے۔ انیسویں صدی میں بلوچستان میں لکھی گئی اردو کی صرف دو مطبوعہ کتب اور ایک غیر مطبوعہ رپورٹ ملتی ہیں، جبکہ ایک شعری مسودہ محمد حسن براہوی کا [اردو غزلوں پر مشتمل] دستیاب ہوا ہے۔ دیگر دو کتابیں ہتورام کی ہیں۔ غیر مطبوعہ رپورٹ قاضی جلال الدین خان کی ہے جس کا ذکر اس مقالے میں پہلی بار ہوا اور اس کی بازیافت کا سہرا اس مقالہ نگار کے سر ہے۔

بیسویں صدی میں بلوچستان میں اردو زبان میں تحریری روایت کا باقاعدہ ایک دور تشکیل پاتا نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں یہاں انگریز برسرِ اقتدار تھے۔ انھوں نے بالخصوص برٹش بلوچستان میں جدید تعلیم کے لیے سکول کھولے تھے۔ ان سکولوں میں تعینات ہونے والے اساتذہ اردو جانتے بھی تھے اور وہ اردو ہی میں تدریس بھی

کرتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ مختلف دفاتر میں سرکاری اموراور خط وکتابت بھی اردو میں ہونے لگی تھی۔اُن کے علاوہ انگریز نے بلوچستان میں کوئٹہ اور لورالائی اور ژوب جیسے شہروں کو بسانے کے لیے پنجاب اور متحدہ ہندوستان سے کاریگر پیشہ کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو یہاں آباد کیا تھا اور انھیں ملازمتیں فراہم کیں اور کاروبار کے مواقع پیدا کیے۔ایسے آنے والے لوگوں میں سے ایک علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد تھے، وہ ژوب میں تعینات رہے۔علامہ اقبال بھی ان سے ملنے کے لیے ایک بار ۱۹۰۳ء میں ژوب [تب فورٹ سنڈیمن] تشریف لائے تھے۔بلوچستان آنے والی دوسری بڑی شخصیت محمد ہادی رسوا کی ہے جن کا ناول امراؤ جان ادا اردو میں پہلا حقیقی ناول تصور ہوتا ہے۔محمد ہادی رسوا یہاں کوئٹہ چمن ریلوے ٹریک بچھانے کے دوران ریلوے میں ملازم رہے ہیں۔یہ شخصیات چونکہ بہت مختصر عرصہ کے لیے یہاں مقیم نہیں رہی ہیں؛ اس لیے بلوچستان میں اردو ادب کے ارتقاء میں یہ لوگ کوئی کردار ادا نہیں کر سکے۔

بلوچستان میں باہر سے آنے والے آبادکاروں میں البتہ ایسے بہت سے لوگ تھے جو یہاں شعری اور ادبی سرگرمیاں جاری رکھے رہے ان میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی شامل تھے۔۱۹۱۱ء میں ژوب اور لورالائی میں اردو کے اولین طرحی مشاعرے منعقد ہوئے۔ان میں مصرع طرح پر مختلف شعراء اپنی جولانیٔ طبع دکھاتے، اور عوام ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔اگرچہ ان کی بیشتر شاعری قافیہ پیمائی معلوم ہوتی ہے، مگر اہم بات یہ ہے کہ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف شعری ذوق سے بہرہ مند تھے بلکہ اس کے اظہار کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔اردو کے اہم ادبی مراکز سے بہت دور اور تقریباً ویران اور بنجر علاقے میں ایک نئی شہری سکونت اختیار کرتے ہوئے اردو زبان میں شعر گوئی کی مشق کرنا اور مشاعرے منعقد کرنا ایک اہم تہذیبی عمل کی پاسداری ہے۔ان لوگوں کے ساتھ چند مقامی لوگ مثلاً عابد شاہ عابد وغیرہ بھی شامل تھے۔ان لوگوں کی ادبی سرگرمیوں کے طفیل بلوچستان میں اردو کی ادبی روایت مستقبل میں ایک مضبوط شکل اختیار کرنے والی تھی۔ان میں سے بیشتر لوگ شاید یہ جانتے تھے کہ ان کی اس طرح کی مثبت ادبی سرگرمیاں ایک نئے علاقے میں اردو ادب کی داغ بیل ڈال رہی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے صرف مشاعروں پر اکتفا نہ کیا، بلکہ انھوں نے بلوچستان میں اردو کا پہلا ادبی رسالہ قندیل خیال کے نام سے جاری کیا۔اس میں مختلف لوگوں کا کلام شامل ہوا کرتا تھا۔۱۹۱۵ء میں اردو میں رسالہ نکالنے والے یہ لوگ ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ ایک خاص سطح کا ادبی اور تنقیدی شعور بھی رکھتے تھے۔کیونکہ ادبی اور تنقیدی شعور کے بغیر ادبی رسالہ نکالنا ممکن نہیں ہے۔یعنی یہ لوگ شعوری طور پر بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں اپنا تاریخی

کردارادا کررہے تھے۔اسی زمانے یعنی ۱۹۱۵ء میں عابد شاہ عابد کا اردو شعری مجموعہ گلزار عابد شائع ہوا۔عابد شاہ کی شاعری بھی قدیم روایت کی اسیر نظر آتی ہے۔اس کے موضوعات اور لہجہ روایتی غزل کا ہے۔اس میں آج کے قاری کے لیے ادبی مسرت فراہم کرنے کا سامان مفقود ہے۔گلزار عابد بلوچستان کا پہلا مطبوعہ اردو شعری مجموعہ ہے۔اس میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی ملتی ہیں جو تعداد میں کافی کم ہیں یعنی کل چھ سات مگر اہم تر بات یہ ہے کہ ان میں ایک نظم ''تعریف کوئٹہ بلوچستان'' ہے۔اردو میں پہلی نظم ہے جس کا موضوع بلوچستان اور اس کے مختلف عناصر ہیں۔عابد شاہ کا یہ اعزاز کم نہیں کہ بلوچستان پر لکھی گئی پہلی نظم کے خالق ہیں۔اگرچہ نظم فنی حوالوں سے کمزور ہے تاہم یہ بلوچستان اور اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

قندیل خیال اور گلزار عابد کی اشاعت سے قبل بیسویں صدی کے اوائل یعنی ۱۹۰۷ء میں ہتو رام کی نثر میں ایک اور کتاب تاریخ بلوچستان شائع ہو چکی تھی۔یہ بلوچستان کی پہلی باقاعدہ تاریخ ہے جو اردو میں لکھی گئی۔اس میں بلوچستان کے قبائل کی قدیم تاریخ اس علاقے کے رسم و رواج کے علاوہ مصنف نے کئی دیدہ شنیدہ واقعات بھی لکھے ہیں۔اس سے اس کی اہمیت کافی بڑھ جاتی ہے کہ یہ قاری کو اس زمانے کے بعض ایسے واقعات سے روشناس کراتی ہے جن کا بیان اس مصنف نے کیا ہے۔جو ان سیاسی و سماجی حالات کا چشم دید گواہ تھا۔ہتو رام کا اسلوب البتہ پہلی دو کتابوں کی طرح داستانوی انداز لیے ہے جو کہ تاریخ کی ایک کتاب کے لیے قطعی مناسب نہیں اور یہی اس کتاب کی واحد خامی ہے۔اس لیے باذوق قاری تاریخ کی اس کتاب کے مطالعے سے داستان کی قرات جیسا لطف لے سکتا ہے۔تاریخ نگاری کے علاوہ ہتو رام نے کتاب کے اسلوب میں اس حد تک روایت کی پاس داری کی ہے کہ اس میں ادبی ذائقے سے دائمی لطف پیدا ہو گیا ہے۔گویا اس نے اپنے زمانے میں بلوچستان کے قاری کو نہ صرف ادبی زبان سے روشناس کرایا بلکہ اس کے مطالعے سے بہتر زبان اور لکھنے کا سلیقہ بھی بتایا۔یہ بات دلچسپ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں جب بلوچستان میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ابھی ابتدائی مراحل میں تھا،اور اردو زبان و ادب کی روایت نمو پذیر تھی۔بلوچستان میں جدید تعلیم سے ہنرور نوجوان نسل کا ایک طبقہ انگریز کی زیر سرپرستی چلنے والے سیاسی بندوبست اور اقبال کے لفظوں میں ''حاضر و موجود'' سے بیزار ہو کے ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ان میں سے بعض نوجوان کوئٹہ کے علاوہ لاہور،کراچی اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کر چکے تھے اور دیگر ان کے ساتھ رہ کر ان کے طرز خیالات سے آگاہ ہو کر اور ذاتی مطالعے کی بنا پر پختہ سیاسی و سماجی شعور کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔بلوچستان کی اس اولین توجہ اس نسل میں یوسف عزیز مگسی،عبدالعزیز کرد،عبدالصمد خان اچکزئی،محمد حسین عنقا،محمد

امین کھوسہ اور دوسرے بہت سے نوجوان شامل تھے۔ان میں سے بیشتر حضرات کی تعلیم وتربیت فارسی، عربی اور اردو میں ہوئی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ انگریزی زبان سے بڑی حد تک واقف تھے۔ان تمام لوگوں کو اردو زبان پر خصوصی دسترس حاصل تھی۔اس لیے جب انھوں نے انگریز حکومت کے بعض ناروا اقدامات اور مقامی نمائندوں کے ظالمانہ کردار پر نکتہ چینی شروع کی تو اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے کے اہم اخبارات اردو میں تھے اور اردو کے ذریعے سے یہ لوگ تمام ہندوستانی پڑھے لکھے طبقے تک اپنی مشکلات اور اپنے احساسات پہنچا سکتے تھے۔اس لیے انھوں نے یہ راستہ اختیار کیا۔یوسف عزیز مگسی نے زمیندار اور مساوات میں مضامین لکھے اور اپنے اخبارات بھی جاری کیے جو مختلف ناموں سے کراچی سے شائع ہوئے۔

یوسف عزیز مگسی اور عبدالعزیز کرد نے ریاست قلات کے خودسر وزیراعظم شمس شاہ کے ظالمانہ اقدامات کے خلاف شمس گردی کے نام سے ایک پمفلٹ لاہور سے شائع کرایا تھا۔[۶۷] اس پمفلٹ میں شمس شاہ کی شخصی طرز حکمرانی، ہٹ دھرمی اور ریاست کے عوام پر توڑے جانے والے اس کے ظلم وستم کو بیان کیا گیا۔ شمس گردی میں مختلف عنوانات کے تحت شمس شاہ کے اقدامات کے خلاف آواز بلند کی گئی تھی۔ان میں قبائلی آزادی کی پائمالی، زمینداروں پر ڈھایا جانے والا ظلم، حقوق ملازمت کا نہ ہونا، تعلیم کا فقدان، خزانہ کی بربادی وغیرہ شامل تھے۔ان کی تحریروں کی بدولت ہندوستان کے عوام اور انگریز حاکم بھی شمس شاہ کے غیر منصفانہ اقدامات سے آگاہ ہوئے اور یوں بہتری کی راہ ہموار ہونے لگی۔اس طرح بلوچستان میں مقامی لوگوں کی نوآبادیاتی حکومت کے خلاف پہلی سیاسی جدوجہد میں اردو زبان نے اہم کردار ادا کیا۔اردو زبان کی سیاسی وسماجی اہمیت سمجھتے ہوئے یوسف عزیز مگسی نے کراچی سے بلوچستان، بلوچستان جدید اور ینگ بلوچ کے نام سے اخبارات جاری کیے۔ان اخبارات میں بلوچستان کے مختلف مسائل کو اُجاگر کیا جاتا تھا۔جب ایک اخبار پر پابندی عائد ہو جاتی تو یوسف عزیز مگسی کسی دوسرے نام سے اخبار جاری کر لیتے۔کچھ عرصے بعد وہ بھی بند ہو جاتا اور پھر کسی اور نام سے اخبار نکالا جاتا۔اس وقت کے ریاستی بندوبست نے انگریز حکمرانوں کے ایما پر بلوچستان کے عوام پر اخبار پڑھنے کی بھی پابندی عائد کر دی تھی۔ایک عرصہ تک لوگ چھپ چھپا کر اخبار پڑھتے اور اس کی ترسیل کرتے۔اخبار جاری کرنے کے ساتھ ساتھ یوسف عزیز مگسی خود بھی مختلف موضوعات پر لکھتے تھے۔وہ اردو میں شاعری بھی کرتے تھے ان کی شاعری اور نثر پر اقبال اور حالی کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔لہٰذا ان دونوں اکابرین کی تقلید میں انھوں نے شاعری سے پیغام رسانی کا کام لیا۔ان کا کلام مقدار میں اگرچہ بہت کم ہے پھر بھی انھوں نے اپنی شاعری میں بلوچستان کے مقہور اور

غافل عوام کو جگانے کی بھرپور کوشش کی۔ یوسف عزیز مگسی کوئٹہ کے ۱۹۳۵ء کے ہولناک زلزلہ میں نوجوانی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ اردو میں ان کے چند مکاتیب موجود ہیں جن میں ان کے ذاتی حالات، بلوچ عوام کے لیے اٹھائے گئے اقدامات اور خواہشات کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں ان کی شگفتگی طبع بھی نظر آتی ہے اور یاس انگیزی بھی جھلکتی ہے۔ ان کی تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ علامہ اقبال سے کس حد تک متاثر تھے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اقبال کے سچے عاشق اور پیروکار تھے۔ اقبال کے علاوہ غالب کے اشعار بھی ان کے خطوط میں ملتے ہیں۔ چند فارسی اشعار بھی ہیں اور ہر دوسرے خط میں قرآنی آیات اور ان کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ جو ان کی شخصیت اور کردار کی عکاسی کرتے ہیں کہ وہ ایک دین دار پختہ عقیدے کے مالک اور سچے مسلمان تھے البتہ ان میں بلوچ قوم کی پسماندگی پر بے چینی اور ان کے روشن مستقبل کے لیے خواہشیں اور خواب ضرور ملتے ہیں۔ لیکن یہ کسی طور شبہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک مارکسٹ یا کیمونسٹ تھے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے اور لکھتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خطوط میں ایک دو جگہ مارکس کی کتاب داس کیپٹل کی تعریف کی گئی ہے جس سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ مارکسٹ تھے مثلاً شاہ محمد مری انہیں اسی وجہ سے مارکسٹ سمجھتے ہیں۔ مارکس کی تعریف تو اقبال نے بھی کی ہے بلکہ کارل مارکس کے بارے میں جیسا شعر اقبال نے کہا شاید ہی کوئی اور کہہ سکے کہ:

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب [۶۸]

لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ اقبال مارکسسٹ تھے۔ اقبال کے اس بے مثال شعر کے باوجود ایک زمانے میں ترقی پسند ادباء اقبال پر بے جا تنقید کرتے رہے ہیں۔ یوسف عزیز مگسی کے اردو خطوط میں موجود علمی شان اور ادبی پیرایہ اظہار سے ان کی دائمی وقعت ثابت ہوتی ہے۔ بلوچستان کی ادبی تاریخ میں یہ خطوط وہی حیثیت رکھتے ہیں جو اردو میں غالب، اقبال اور دوسرے اکابرین کے خطوط کی ہے۔ یوسف عزیز مگسی سے بلوچستان کا پہلا اردو افسانہ ''تکمیل انسانیت'' منسوب ہے لیکن کیا یہ افسانہ کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔ اس سوال کا جواب اثبات میں دینا بہت مشکل ہے۔

یوسف عزیز مگسی کے ایک ہم عصر اور رفیق محمد حسین عنقا نے اسی دور میں اردو زبان میں شاعری کی اور ایک مجموعۂ نظم ترتیب دے کر رحیل کوہ کے عنوان سے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔ اس میں ان کی چند فارسی نظمیں بھی شامل

ہیں۔رحیل کوہ کی اکثر نظمیں اس دور کے بلوچستان کے سیاسی وسماجی مسائل کے منظوم بیان پر مشتمل ہیں۔یہ نظمیں فکری اور فنی حوالے سے کمزور ہیں۔ان کی تمام تر اہمیت اس دور کے تاریخی تناظر میں ہے۔اس وقت کے تعلیم یافتہ اور باذوق نوجوانوں کو کیا مسائل درپیش تھے اور ان مسائل پر ان کا ردعمل کیا تھا۔عنقا کی نظمیں اس دور کے تعلیم یافتہ اور باشعور بلوچ نوجوانوں کے ردعمل کا ادبی اظہار ہیں۔یعنی یہ قیام پاکستان سے قبل کی بلوچ قوم پرست سیاست کا ادبی نمونہ ہیں۔مختلف عنوانات کے تحت لکھی گئی ان نظموں میں ایک اندرونی ربط موجود ہے۔اس لیے انھیں ایک سلسلۂ خیال کی نظمیں یا پھر ایک طویل نظم کہا جا سکتا ہے۔عنقا کی نظموں میں بھی اقبال کے اثرات لفظ، تراکیب اور موضوع کی سطح پر نظر آتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ بلوچستان کی پہلی تعلیم یافتہ نسل شعوری طور پر اقبال سے بے حد متاثر تھی۔

اسی دور میں بلوچی کے اہم شاعر گل خان نصیر نے بھی ابتداً اردو میں نظمیں لکھیں جو ابھی حال ہی میں پہلی بار شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔گل خان نصیر کی نظمیں عنقا کی نظموں کی نسبت زیادہ بہتر اور گہرائی کی حامل ہیں۔نصیر نے بھی اس زمانے میں سیاسی وسماجی موضوعات پر نظمیں لکھی تھیں۔مثلاً ان کی ایک نظم ''جرگہ'' قبائل کے عدالتی نظام جرگہ کی جانبداری اور اس کے ظلم وستم بیان کرتی ہے۔[۶۹]

قیام پاکستان سے قبل بلوچستان کے ادیب اور شعراء شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت اور نجی خط وکتابت بھی اردو میں کرتے نظر آتے ہیں اور یہی تین شعبے زیادہ تر ان کی دلچسپی کا میدان بنے۔انھوں نے اردو زبان میں اپنے جذبات واحساسات اور حالات و واقعات کا اظہار انہی تین شعبوں یعنی شاعری، صحافت اور نجی خطوط میں کیا۔اس حوالے سے اس دور کے بیشتر لکھاریوں کا جو سرمایہ دستیاب ہے ان پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔جہاں تک تخلیقی نثر یعنی افسانے اور اردو کا تعلق ہے۔ان ہر دو اصناف میں اس عہد کے ادبا کی دلچسپی بہت کم نظر آتی ہے۔شاید اپنی سیاسی و سماجی سرگرمیوں کی بدولت وہ اس طرف کم توجہ کر پائے۔وہ لوگ سنجیدہ ادب سے زیادہ سیاست میں اس لیے بھی سرگرم رہے کہ ان میں سے اکثر لوگوں کا تعلق سیاسی اور حکمران خانوادوں سے تھا۔یہ لوگ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد جب اپنے وطن کے حالات سے آشنا ہوئے تو انھیں انگریز اور مقامی حکمرانوں کی چیرہ دستیوں اور اپنے بلوچستانی عوام کی کسمپرسی اور خستہ حالی کا احساس ہوا۔چنانچہ یہ لوگ عام لوگوں کی فلاح و بہبود اور ان میں سیاسی شعور اُجاگر کرنے کی مہم میں جت گئے۔ان کے لیے ادبی اور تحریری سرگرمیاں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔انھوں نے

اپنی تحریروں سے سماج کے مفلوک الحال طبقے کی اصلاح اور ان کی ذہنی وفکری بیداری کا کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اردو افسانے اور ناول کے آثار بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ البتہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ لوگ سرے سے نثر کی ان اصناف سے آگاہ نہ تھے۔ ایسی بات نہیں ہے اور اس کا ثبوت یوسف عزیز مگسی اور بعض دوسرے لوگوں کے وہ طبع زاد افسانے ہیں جو انھوں نے اپنے اخبارات میں شائع کیے۔ یوسف عزیز مگسی نے افسانے کے طور پر ایک تحریر ''تکمیل انسانیت'' کے عنوان سے لکھی تھی جو ان کے ہفت روزہ اخبار بلوچستان جدید میں مئی ۱۹۳۴ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوئی۔ یوسف عزیز اگرچہ ''تکمیل انسانیت'' کو طبع زاد افسانہ قرار دیتے ہیں اور بلوچستان کے اکثر محققین ان کی بات پر صاد کرتے ہوئے اسے افسانہ سمجھتے آئے ہیں، مگر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا ان کی اس تحریر کو واقعی افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ ایسی تحریر جو جدید افسانے کی تعریف پر پوری نہیں اترتی اور اسے صرف کہانی لکھنے کی مشق ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یوسف عزیز مگسی نے ''تکمیل انسانیت'' میں اپنی سوانحی سرگزشت کو کہانی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جن مشکل حالات سے اپنے خاندانی معاملات میں گھرے تھے اور ریاست قلات میں جو سیاسی صورت حال تھی، اسے انھوں نے بیان کیا ہے۔ البتہ انھوں نے اپنے بھائیوں اور دیگر لوگوں کے کرداروں کے نام فرضی رکھے ہیں۔

اس سوانحی خاکے یا افسانہ نما تحریر میں انھوں نے اپنی گرفتاری کی بابت بھی بتایا ہے۔ اس تحریر کا اختتام اس وقت ہوتا ہے جب اس کے ہیرو عزیز احمد کے پاس جیل میں دو فرشتے آتے ہیں اور اسے تمام مشکلات سے نجات پانے کی خوشخبری سناتے ہیں جس پر وہ خوشی سے دعا مانگتے ہوئے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس تحریر کے اختتام پر فرشتوں کے جلوس کو گیت گاتے اور آسمان پر جلی حرف میں ''تکمیل انسانیت'' لکھا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ ''تکمیل انسانیت'' کے متن میں کہیں بھی افسانویت نہیں پائی جاتی ہے جبکہ آخر میں فرشتوں کی آمد اور خود بخود آسمان پر ایک تحریر دکھانا بھی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسے افسانہ ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ افسانے کے ہیرو عزیز احمد اور اس کے مصنف یوسف عزیز مگسی کے ناموں میں مماثلت سے ظاہر ہے کہ اس تحریر سے مصنف کا منشا اپنے حالات سے عوام الناس کو روشناس کرنا اور ایک طرح سے اپنے لیے حمایت درکار تھی۔ اس زمانے کے کہانی کاروں کے رواج کے مطابق انھوں نے اسے ''طبع زاد افسانہ'' قرار دیا جو دراصل افسانہ نہیں ہے۔ اس سے البتہ یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یوسف عزیز مگسی نے افسانے جیسی صنف کو اپنے محدود ذاتی وسیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہا اور انھوں نے اسے استعمال کیا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید انھوں نے اس دور میں افسانہ لکھنا چاہا، مگر ان سے افسانہ لکھا نہیں جاسکا اور وہ ایک نیم

سوانحی مضمون رقم کر سکے۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جس کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے حالات لکھے ہیں ؛اس لیے ان کی شخصیت میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے اس تحریر میں ان کی شخصیت اور حالات و واقعات جاننے کا سامان موجود ہے۔ افسانے کے نام پر اس دور میں ایک اور تحریر جو سامنے آتی ہے، وہ ضیاء الرحمٰن کی تحقیق کے مطابق ''ایک سربستہ راز کا انکشاف یا غیبی امداد ہے'' جو ناصر بلوچستانی کی تحریر ہے۔ ضیاء الرحمٰن ''تکمیل انسانیت'' کی بجائے اسے بلوچستان کا پہلا افسانہ قرار دیتے ہیں۔ جس طرح انھوں نے اسے افسانہ قرار دیا ہے اس سے بجائے خود پر سوال اٹھتا ہے۔ یعنی انھوں نے متن کو زیر بحث لا کر اپنے تنقیدی شعور کے بل پر اس تحریر کے افسانوی یا تخلیقی جواز پر بات نہیں کی جیسا کہ ایک عام محققانہ اور تنقیدی رویہ اور دستور ہے۔ اس کی بجائے چونکہ وہ ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اس لیے انھوں نے اپنی طالبات کے سامنے یہ تحریر رکھی اور ان سے سوال پوچھا کہ آیا اسے افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ طالبات نے جو اپنے استاد سے متاثر ہوتی ہیں نے فوراً اسے افسانہ قرار دیا، اس پر ضیاء الرحمٰن بھی اسے بلوچستان کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ یہ بذات خود ایک غیر تحقیقی اور غیر تنقیدی رویہ ہے۔ یہ تحریر جس کا عنوان تک مضحکہ خیز ہے اسے افسانہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں مافوق الفطرت کردار واحد متکلم راوی کے سامنے آ کر نیکی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس تحریر کا مقصد مصنف کی اپنے مدرسہ کے لیے چندہ کی اپیل ہے جو تحریر کے آخر میں کی گئی ہے۔ اس تحریر کا متن ہر قسم کی افسانویت اور کہانی پن سے عاری ہے۔ اسے کسی اعتبار سے افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ پس قیام پاکستان سے پہلے بلوچستان کے ادیب افسانے کے نام پر جو تحریریں لکھتے رہے۔ وہ فنی طور پر افسانہ نہیں ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنی حد تک افسانہ لکھنے کی کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے سیاسی و سماجی رہنما اور بعد میں ادیب وغیرہ تھے۔ ادب ان کی ترجیح بھی نہیں تھا۔ ان لوگوں نے ادب یا افسانے کا مطالعہ کیا تھا نہ یہ تخلیقی اور تنقیدی شعور سے اس طور بہرہ ور تھے کہ ایک کامیاب افسانہ لکھنے میں کامیاب ہو پاتے۔

قیام پاکستان سے قبل کے زمانے میں یہاں چند ناول لکھے جانے کا تذکرہ مختلف کتب میں ملتا ہے۔ ان ناولوں کا رجحان کیا تھا اور کیا یہ ناول کے فن پر پورا اترتے ہیں۔ اس پر بات بعد میں ہوگی۔ پہلے یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ عام طور پر بلوچستان میں لکھے گئے اردو ناول کے بارے کیا رائے پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ امراؤ جان ادا کے مصنف مرزا محمد ہادی رسوا بلوچستان میں کچھ عرصہ ملازمت کی غرض سے مقیم رہے ہیں۔ بلوچستان میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنا معروف ناول امراؤ جان ادا یہاں قیام کے دنوں میں لکھا تھا۔ ایسی

بات نہ صرف عام طور پر مشہور ہے بلکہ پی۔ایچ۔ڈی کے حامل محققین بھی اس غلط خیال کی ترویج کرتے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسوا نے یہ ناول بلوچستان سے واپس جانے کے بعد لکھا تھا۔ وہ اس ناول کی اشاعت سے کافی عرصہ قبل واپس جا چکے تھے۔ یہ بات اہم ہے کہ بلوچستان میں قیام نے ان پر کچھ اثرات ضرور مرتب کیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناول شریف زادہ میں بلوچستان کے علاقہ چمن کا ذکر کیا ہے۔

انعام الحق کوثر نے بلوچستان میں اردو کے پہلے ناول کی موجودگی ۱۹۱۵ء اور ۱۹۲۰ء کے عرصہ کے درمیان بتائی ہے۔ ان کے بقول بلوچستان کے شہر لورالائی میں جگن ناتھ سیٹھی نامی شخص نے ایک ناول محبت کا دیوتا عرف برابر کی چوٹ شائع کیا تھا۔ انھوں نے شائع کا لفظ لکھا ہے۔ تخلیق کا یا لکھنے کا نہیں۔ یہ ناول دستیاب نہیں ہے۔ اس ناول کا عنوان ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اگر بالفرض یہ ناول شائع ہوا بھی تھا تو یہ ایک عامیانہ قصہ ہوگا جسے ناول قرار دیا گیا ہے۔ جب تک یہ ناول دستیاب نہیں ہو جاتا اسے ناول سمجھنا اور تحقیقی کتب میں اس کا ذکر بہ طور ناول کرنا مناسب نہیں ہے۔

بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول کون سا ہے۔ یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ رہا ہے۔ اس حوالے سے زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر یقین کیا جاتا رہا ہے۔ اب تک حتمی طور پر کسی ایک ناول کو یہاں کا پہلا ناول قرار نہیں دیا جا سکا ہے۔ اس مقالے میں پہلی مرتبہ ناول کے حوالے سے پائے جانے والی آراء کا تنقیدی محاکمہ کرتے ہوئے انھیں بلوچستان کا پہلا ناول یا ناول قرار دینے کی کوششوں کو ٹھوس دلائل کی بنیاد پر رد کیا گیا ہے۔ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آخر بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول کون سا ہے؟ اور اس کا مصنف کون ہے؟

اس مقالہ نگار کی تحقیق میں یہ بات پہلی بار سامنے آئی ہے کہ بلوچستان میں لکھا جانے والا اردو کا پہلا ناول داستان مجاہد ہے اور اس کا مصنف مشہور تاریخی ناول نگار نسیم حجازی ہے۔ نسیم حجازی ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۸ء بلوچستان میں مقیم رہے ہیں۔ وہ جعفر خان جمالی کے اخبار تنظیم کے مدیر تھے۔ تنظیم بلوچستان میں مسلم لیگ کا نمائندہ اخبار تھا۔ یہ تحریک پاکستان میں بلوچستان کی شمولیت کے حق میں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جعفر خان جمالی اور نواب محمد خان جوگیزئی کی کوششوں کے سبب ہی بلوچستان پاکستان میں شامل ہو پایا تھا۔ نسیم حجازی نے اس زمانے میں تنظیم کی ادارت کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بھی سرگرم کردار ادا کیا۔ ان کے فعال کردار کی تعریف بلوچستان کے سیاسی راہنما کرتے رہے ہیں۔ نسیم حجازی بلوچستان میں تحریک پاکستان کے ہراول دستے میں شامل

تھے۔ وہ بلوچستان کے مختلف سرداروں اور آل انڈیا مسلم لیگ کے راہنماؤں میں رابطہ پل کی حیثیت رکھتے تھے، اور بلوچستان مسلم لیگ کی سیاسی سرگرمیوں کے روح و رواں تھے۔ سیاسی طور پر فعال کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہاں ادبی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ ان کا پہلا ناول داستان مجاہد ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے اس پہلے ناول کا انتساب جعفر خان جمالی کے نام کیا ہے۔ اس سے ہر دو حضرات کے قریبی مراسم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جعفر خان جمالی نے نسیم حجازی کو اخبار کی ادارت کے ساتھ ساتھ رہائش بھی فراہم کی تھی اور اس طرح کی سہولیات بہم پہنچائی تھیں کہ وہ اپنا تخلیقی اور تحریری کام بھی ساتھ ساتھ کر سکیں۔ داستان مجاہد میں نسیم حجازی نے جن خشک صحراؤں اور پہاڑوں کی منظر کشی کی ہے گمان غالب ہے کہ یہ مناظر انھوں نے بلوچستان کے صحراؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قلم بند کیے کیونکہ اس وقت تک نسیم حجازی حجاز نہیں گئے تھے۔

داستان مجاہد کے علاوہ نسیم حجازی نے جو دیگر ناول بلوچستان میں لکھے ان میں محمد بن قاسم، شاہین اور آخری چٹان شامل ہیں۔ ان تمام ناولوں میں منظر نگاری اور قبائلی سماج کے پس منظری مطالعے میں بلوچستان نظر آتا ہے۔ تاہم بلوچستان کی تہذیب و ثقافت یا اس کے جغرافیائی خدوخال نسیم حجازی کے ناول میں اپنی جھلک نہیں دکھاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسیم حجازی نے جو تاریخی ناول لکھے ان میں مختلف مسلمان راہنماؤں کو بہ طور ہیرو پیش کرتے ہوئے عرب ثقافت و سماج کو پیش کیا گیا ہے۔ ان میں بلوچستانی عناصر کی موجودگی ناول کو غیر حقیقی بنا سکتی تھی۔ اس لیے شاید شعوری طور پر بلوچستان کے سماج و ثقافت کے منفرد اجزا ان ناولوں میں پیش نہیں کیے گئے تاکہ ناول اپنے ہیرو، اس کے زمانے اور جغرافیائی محلِ وقوع سے قریب تر رہے اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخی ناول لکھتے ہوئے نسیم حجازی اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں اور یہ کوئی کم معمولی بات نہیں۔

اس مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قیام پاکستان سے قبل یہاں اردو ادب کی روایت اپنی ابتداء اور ارتقاء کے مختلف مراحل طے کرتی نظر آتی ہے۔ اس دوران بلوچستان کے ادباء کی زیادہ تر توجہ شاعری اور صحافت پر مرکوز رہی ہے۔ اردو نثر میں اگرچہ افسانہ لکھنے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ابتدائی نوعیت کی ہیں اور ان پر تحریری مشقوں کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بہت اچھا افسانہ نگار سامنے نہیں آ سکا، نہ ہی کوئی ایک ایسا افسانہ اس دوران لکھا گیا؛ جسے بہترین افسانہ کہا جا سکے اور اسے فخر سے قومی سطح پر پیش کیا جا سکتا ہو۔ تاہم بلوچستان میں لکھنے والے یہاں اردو ادب کی روایت کو فروغ دینے میں کامیاب رہے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی کوششیں تھیں جنھوں نے

مستقبل میں آنے والوں کو اردو میں لکھنے کی ترغیب دی اور یوں زیادہ بہتر لکھنے والے سامنے آئے۔ آج بلوچستان میں اردو شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اچھا لکھنے والے موجود ہیں۔ اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے، کہ بلوچستان میں اردو زبان کی روایت کا دورانیہ سوسوا سو سال ہے؛ اس عرصے میں تخلیق پانے والا ادبی سرمایہ ایسی وقعت کا حامل نہیں ہے، جس پر اطمینان کا اظہار کیا جاسکتا ہو۔ بلوچستان میں آج تک ایک ایسا اُردو ادیب پیدا نہیں ہوا جس کا نام اردو کے اہم اور بڑے ادیبوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہو۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ بحوالہ اردو اور براہوی کا تقابلی مطالعہ ازعبدالرحمٰن براہوی، براہوی اکیڈمی، کوئٹہ، ۲۰۰۶ص ۹۰

۲۔ کوثر، انعام الحق، ڈاکٹر، مرتب: کلیاتِ محمد حسن براہوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء ص ۳

۳۔ انعام الحق کوثر نے بلوچستان سے اردو کے ان اولین لسانی رابطوں کے حوالے سے اپنی کسی کتاب میں باقاعدہ بحث نہیں کی ہے۔ انھوں نے اس حوالے سے اپنے غیر مربوط خیالات کا مختصر اظہار پہلے اپنی کتاب بلوچستان میں اردو کے باب بہ عنوان ''روابط'' میں کیا جبکہ دوسری بار اپنی مرتبہ کتاب بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات کے طویل پیش لفظ ''حرف اول'' میں انہی خیالات کو مزید واضح کر کے پیش کیا۔ یہاں ان کے خیالات کا خلاصہ مقالہ نگار نے اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: بلوچستان میں اردو ص ۱۳۹، بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات ص ۲،۳،۴

۴۔ ولی دکنی، کلیاتِ ولی دکنی

۵۔ کلیات محمد حسن براہوی، ص ۱

۶۔ ایضاً ص ۱۹، ۴۲،۲۷

۷۔ ایضاً ص ۷

۸۔ بلوچ، نبی بخش خان، مرتب: دیوانِ شوق افزا اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۲۴، ۲۵

۹۔ ایضاً ص ۷۶ اور ص ۲۸۴

۱۰۔ جمیل جالبی، ''بلوچستان کی ادبی روایت'' مشمولہ: اخبار اردو، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۲۹، ۳۰

۱۱۔ شاہدہ بیگم، سندھ میں اردو، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۰

۱۲۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے انگریزوں کی لسانی پالیسی ازسید مصطفےٰ علی بریلوی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی ۱۹۷۰ء، ص ۷۶

۱۳۔ کوثر،انعام الحق،بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات ،مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،۱۹۸٦،ص ۱۱

۱۴۔ انورومان،بلوچستان میں اردو ذریعہ تعلیم ،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۸۷ء،ص ۳۸

۱۵۔ کوثر،انعام الحق، بلوچستان میں اردو،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۹۴بار دوم،ص ۱۳

۱٦۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے علامہ اقبال اور بلوچستان از انعام الحق کوثر،اقبال اکادمی،لاہور،۱۹۹۸ء بار دوم

۱۷۔ عطااللہ،شیخ،مرتب: اقبال نامہ ،اقبال اکیڈمی،لاہور،ص ۵

۱۸۔ دیکھئے مقدمہ باغ و بہار از میرامن مرتب: مولوی عبدالحق،انجمن ترقی اردو،کراچی،۱۹٦۵

۱۹۔ کوثر،انعام الحق، بلوچستان میں اردو،ص ۵۰۵

۲۰۔ دیکھئے بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات از انعام الحق کوثر ص ۹
واضح رہے بلوچستان میں اردو ادب کے ارتقاء سے متعلق انعام الحق کوثر کی تصنیف بلوچستان میں اردو میں گل بہار کا ذکر نہیں ملتا۔

۲۱۔ ہتورام، کتاب بلوچی نامہ، مطبع مفید عام،لاہور،۱۸۹٦ء بار دوم ص ۲

۲۲۔ ہتورام، گل بہار،بلوچی اکیڈمی،کوئٹہ،۱۹۸۲بار دوم،اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن عزیز بگٹی نے بغیر تدوین و مقدمہ کے شائع کیا ہے۔

۲۳۔ ایضاً،ص ۷

۲۴۔ ایضاً،ص ۳۲

۲۵۔ ہتورام، کتاب بلوچی نامہ، مطبع مفید عام،لاہور،۱۸۹٦ء بار دوم،ص ۲

۲٦۔ ایضاً، تاریخ بلوچستان ،سیلز اینڈ سروسز،کوئٹہ،۲۰۰۹ بار سوم ص ۱۴

۲۷۔ غیر مطبوعہ رپورٹ بندوبست تحصیل پشین،۱۸۹۹ء،ص ۳

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ پشین اب ضلع کی حیثیت رکھتا ہے۔اوراس میں چار تحصیلیں پشین، برشور،حرم زئی،کاریزات اورایک سب تحصیل سرانان شامل ہیں۔

۳۰۔ اس خط پر ۱۸۹۹ء کی تاریخ درج ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ رپورٹ اس سے پیشتر لکھی جا چکی تھی۔

۳۱۔ مقدمہ گلزار عابداز انعام الحق کوثرص ی

۳۲۔ عابدشاہ عابد: گلزار عابد،سیرت اکادمی بلوچستان،کوئٹہ،۲۰۰۰بار دوم،ص۴

۳۳۔ ایضاً،ص۲۱

۳۴۔ دانیال طریر، بلوچستانی شعریات کی تلاش،پائلٹ ایجوکیشنل پروڈکٹس، لاہور،۲۰۰۹،ص۲۷

۳۵۔ محمدحسین عنقا،رحیل کوہ،ادارہ حرف وقلم،کوئٹہ،۲۰۰۶،باردوم ص۶۴

۳۶۔ ایضاً ۷۱

۳۷۔ کوثر،انعام الحق،یوسف عزیز مگسی،سیرت اکادمی بلوچستان،کوئٹہ،۲۰۰۴ء ص۱۵،۱۶

۳۸۔ کوثر،انعام الحق،مرتب:مکاتیب یوسف عزیز مگسی مجلس ترقی ادب،لاہور،۱۹۷۸، ص۳۶،۳۸،۴۴،۴۵،۷۹،۹۹

۳۹۔ ایضاً،ص۲۸

۴۰۔ ایضاً،ص۶۰

۴۱۔ ایضاً،ص۴۳،۴۴

۴۲۔ کوثر،انعام الحق، بلوچستان میں اردو،ص۵۱۵

۴۳۔ فاروق احمد،ڈاکٹر،بلوچستان میں اردو زبان و ادب،قلات پریس،کوئٹہ،۱۹۹۸،ص۱۸۳

۴۴۔ مبارکہ حمید،مسز،بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،نوید پبلی کیشنز،کوئٹہ،۲۰۰۱،ص۳۳

۴۵۔ مری،شاہ محمد،میر یوسف عزیز مگسی ،سنگت اکیڈمی آف سائینسز ،کوئٹہ،۲۰۰۹،ص ۶۱

۴۶۔ ضیاءالرحمٰن ،ڈاکٹر،''کیا تکمیل انسانیت بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ ہے؟''مشمولہ:قلم قبیلہ ، شمارہ ا،۲۰۰۶ ،مدیر بیرم خان،قلم قبیلہ ادبی ٹرسٹ ،کوئٹہ،ص ۵۷

۴۷۔ وقار عظیم،فن افسانہ نگاری ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ ،۱۹۹۷،ص ۱۶

۴۸۔ پریم چند، مضامین پریم چند،مرتب:قمر رئیس، یونیورسٹی پبلشرز ،علی گڑھ ،۱۹۶۰،ص ۸۸

۴۹۔ یوسف عزیز مگسی ،''تکمیل انسانیت''مشمولہ:بلوچستان جدید، یکم مئی ۱۹۳۴ء،مدیر نسیم تلوی ،ص ۴

۵۰۔ تفصیل کے لیے دیکھئے اردو نثر کا فنی ارتقاء از فرمان فتحپوری

۵۱۔ کوثر ،انعام الحق ،بلوچستان میں اردو ،ص ۱۴۲

۵۲۔ عابدی ،رضا علی،ریل کہانی ،سنگ میل ،لاہور ،۱۹۹۷،ص ۱۴

۵۳۔ عرفان احمد بیگ،''بلوچستان ریلوے نیٹ ورک کی تعمیر و بحالی'' مشمولہ: سنڈے میگزین ،روز نامہ جنگ ،راولپنڈی ،۱۳ دسمبر ۲۰۱۵،ص

۵۴۔ ظہیر فتح پوری،ڈاکٹر، رسوا کی ناول نگاری ،حروف ،راولپنڈی ،۱۹۷۰،ص ۳۷،۱۹۳،۲۱۲

۵۵۔ کوثر ،انعام الحق ،بلوچستان میں اردو ،ص ۵۱۱

۵۶۔ انعام الحق کوثر سے مقالہ نگار کی ٹیلیفونک گفتگو بہ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۴ء

۵۷۔ ضیاءالرحمٰن ،ڈاکٹر،''بلوچستان میں اردو کے ابتدائی ناول کے چند اوراق''مشمولہ:قلم قبیلہ شمارہ ا،۲۰۰۶ ،مدیر بیرم خان،قلم قبیلہ ادبی ٹرسٹ ،کوئٹہ،ص ۳۷

۵۸۔ کوثر ،انعام الحق، جدو جہد آزادی میں بلوچستان کا کردار ،ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور،۱۹۹۱ء،ص ۳۶۸

۵۹۔ ایضاً،ص ۳۷۰

۶۰۔ کوثر ،انعام الحق ،بلوچستان میں اردو،ص ۵۳۲

۶۱۔ نسیم حجازی،داستان مجاہد قومی کتب خانہ،لاہور،۱۹۸۳ء،ص ۶

۶۲۔ ایضاً، محمد بن قاسم ایضاً ،سن ندارد،ص۱۳۰

۶۳۔ ایضاً

۶۴۔ نسیم حجازی، شاہین ، پبلشنگ کلب، گوجرانوالہ،سن ندارد،ص۳

۶۵۔ ایضاً، آخری چٹان قومی کتب خانہ، لاہور، سن ندارد

۶۶۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو، کراچی، طبع دوم، ۲۰۰۸ء،ص۲۴۲

۶۷۔ یہ کتابچہ قریباً اسی سال بعد اب دوبارہ یونیورسٹی آف بلوچستان کوئٹہ سے شائع ہوا ہے۔

۶۸۔ اقبال، علامہ محمد، ڈاکٹر، کلیات اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۳ء،ص۶۵

۶۹۔ نصیر، گل خان، کاروان کے ساتھ، مہردر، کوئٹہ، ۲۰۱۱ء،ص۳۰

باب سوم:

بلوچستان میں اردو افسانہ

(قیامِ پاکستان کے بعد)

بلوچستان میں اردو افسانے کے ابتدائی آثار:

قیامِ پاکستان سے قبل بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ قرار دی جانے والی تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ باب دوم میں بہ تفصیل پیش کیا گیا ہے۔اس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ افسانے کے فنی لوازم پر پورا نہ اترنے کی بناء پر ان نامکمل اور تمثیلی کہانیوں کو افسانہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے ان تحریروں کو بطور فکشن رد کیا گیا ہے۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ کب لکھا گیا اور اس کا مصنف کون ہے۔بلوچستان میں اردو افسانے کے ابتدائی آثار کے ضمن میں کوئٹہ کے ایک ہفت روزہ اخبار پاسبان میں ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء کے دوران میں شائع ہونے والے بعض ایسے افسانے دستیاب ہوئے ہیں، جن پر کسی مصنف کا نام نہیں ہے۔اخبار پاسبان مولانا عبداللہ (م ۱۹۷۱ء) نے جاری کیا تھا، جن کا تعلق گورداسپور سے تھا، مگر ان کی تمام زندگی بلوچستان میں گزری۔

پاسبان پاسبان میں چھپنے والی ایسی چوبیس (۲۴) کہانیاں دستیاب ہوئی ہیں، جن کے عنوانات یوں ہیں۔

۱۔انصاف	۲۔مختصر افسانے	۳۔دیوتا	۴۔گوشت کا ٹکڑا	۵۔بھکارن
۶۔بڑھا قلی	۷۔قاتلہ	۸۔اختتام سفر	۹۔انصاف	۱۰۔بھونچال
۱۱۔آم	۱۲۔مہاجن	۱۳۔بھوکی	۱۴۔کھوٹا روپیہ	۱۵۔مصیبت زدہ
۱۶۔جوگی	۱۷۔دکھی جوانیاں	۱۸۔خدا کی دین	۱۹۔تابوت	۲۰۔رادھیکا
۲۱۔نیک دل مطرب	۲۲۔دیوالی	۲۳۔افلاس	۲۴۔کرایہ دار	

ان میں سے بعض تو بہت اچھی، جبکہ بعض کچی پکی کہانیاں ہیں، کچھ کہانیاں ترجمہ معلوم ہوتی ہیں؛ ان میں نہ صرف یہ کہ ان کا ماحول اور کردار مغربی ہیں، بلکہ ان کا مزاج اور مسائل بھی مغربی معاشرے سے متعلق ہیں۔ایسی کہانیوں میں ''تابوت'' اور ''نیک دل مطرب'' شامل ہیں۔''افلاس'' کے بارے میں تو درج ہے کہ یہ میکسم گورکی کا شاہکار ہے۔اسی طرح ایک کہانی ''خدا کی دین'' کے آخر میں ''شکریہ بہ ہمایوں'' کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ ہمایوں رسالے سے لی گئی ہے۔اس کہانی میں زلزلے کے باعث آنے والی تباہی کے ذکر سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ

کوئٹہ میں ۱۹۳۵ء میں آنے والے شدید زلزلے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ان اکثر کہانیوں کے موضوعات غربت، بھوک اور افلاس اور ان کے باعث پیدا ہونے والے انسانی اور سماجی المیے ہیں۔کئی کہانیوں اور کرداروں کے نام ہندی ہیں اور ان میں ہندوستان کے مختلف شہروں کا تذکرہ ہے۔ان میں سے ''انصاف'' اور ''مہاجن'' دو ایسی کہانیاں ہیں جنھیں مکمل کہانی کہا جا سکتا ہے۔''انصاف'' نظامِ عدل پر خوبصورت طنز ہے، جس میں ایک سخت گیر جج ڈپٹی ہیبت رائے کا قصہ بیان ہوا ہے جو بہ ظاہر اصول پرست ہوتا ہے، مگر آخر میں کھلتا ہے کہ وہ بھی ایک کرپٹ شخص ہوتا ہے، جب اسے سزا ہونے کی بجائے باعزت بری کر دیا جاتا ہے۔کہانی کے آخر میں اس واقعہ کو یوں لکھا گیا ہے:

ہمیں اس بات کا یقین ضرور ہو گیا تھا کہ آپ قید ہو جائیں گے۔اس کے باوجود آپ کا باعزت بری ہو جانا کسی طرح معجزے سے کم نہیں۔آکر بتایئے تو کیا گنجائش تھی آپ کس طرح بچے؟ ڈپٹی صاحب نے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔ٹربیونل کے ججوں کا رشوت دے کر۔ا

اسی طرح ''مہاجن'' اس ظالم مہاجن کا قصہ ہے جو اپنے پرانے واقف کار کو بلا سود روپیہ دینے سے احتراز کرتا ہے اور جب اس کی بدولت اس کا مکان نیلام ہو جاتا ہے، تو اسے کچھ عرصہ کے بعد جب ملتا ہے، تو ملتے ہی کہتا ہے:

بھیا! کیا بتاؤں، جس وقت تمھارا مکان نیلام ہوا، میرے دل پر سانپ لوٹ گیا۔تمھارے باپ یاد آ گئے۔ااج وہ ہوتے تو کاہے کو یہ دن آتا لیکن یہ مہاکنی بڑا ہی برا پیشہ ہے۔اس میں باپ بیٹے کا گلہ کاٹ ڈالتا ہے۔خدا کسی دشمن کو بھی مہاجن نہ کرے۔میں نے کہا سچ کہتے ہو لالہ جی اور چپ چاپ اپنے راستے چلا گیا۔۲

یہ مختصر افسانے یا کہانیاں جن پر ان کے مصنفین کا نام تک نہیں [صرف ایک کہانی ''بھوکی'' کے ساتھ وجاہت سندیلوی کا نام لکھا ہے]، نہ ہی یہ واضح ہے کہ یہ لکھنے والوں کی اپنی تخلیق ہیں، کہیں سے ماخوذ ہیں یا ترجمہ ہیں ؛اس کے باوجود مبارکہ حمید ایک جگہ انھیں ''کہانی کے اعتبار سے بے ربطی کا شکار'' بھی کہتی ہیں اور پھر انہی سطور میں ان کہانیوں کو ''بلوچستان میں اردو افسانے کا ابتدائی نقش'' قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

بلوچستان میں اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی نقوش ہفت روزہ پاسبان کے ذریعہ سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔اور انہی افسانوں کے ذریعہ برصغیر کی تقسیم سے قبل بلوچستان میں

لکھے جانے والے افسانوں کے رجحانات کا سراغ ملتا ہے۔[۳]

یہ درست ہے کہ پاسبان کے بعض افسانوں میں ترقی پسند رجحان ملتا ہے۔تاہم یہ واضح نہیں کہ ان کے لکھنے والے بلوچستان کے ہیں اور انھوں نے یہ افسانے کوئٹہ میں ہی لکھے ہیں۔اس لیے مبارکہ حمید نے عجلت میں جس طرح ان افسانوں کو بلوچستان کی ادبی روایت اور ان کے رجحانات کو بلوچستان کے اردو افسانے کے رجحانات قرار دیا ہے، وہ مناسب تحقیقی اور تنقیدی رویہ نہیں۔خصوصاً یہ بات بھی مدنظر رہے کہ یہ کہانیاں بلوچستان سے سامنے آنے والی اولین تحریروں میں سے ہیں اور ان کے مصنفین ہنوز نامعلوم ہیں۔

بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ ''ویری ناگ'' :

مبارکہ حمید نے ہی بلوچستان کے ایک ہفت روزہ رسالے زمانہ ۱۹۴۸ء میں انور رومان کے ایک افسانے ''ویری ناگ'' کا ذکر کیا ہے۔[۴] انور رومان کا یہ مذکورہ افسانہ ان کی یاداشتوں کی کتاب رومانیے میں اسی عنوان سے موجود ہے۔فہرست میں اس کا زمانہ تحریر ۱۹۴۸ء لکھا گیا ہے۔چونکہ یہ افسانے کے فن پر آج بھی پورا اترتا ہے،اس لیے مقالہ نگار کی رائے میں ''ویری ناگ'' بلوچستان میں اردو کا پہلا باقاعدہ افسانہ ہے اور انور رومان بلوچستان میں اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں،جنہوں نے ''ویری ناگ'' کے علاوہ بھی نہ صرف کئی افسانے لکھے بلکہ نثری نظمیں اور ایک ناولٹ بھی لکھا،جس کا ذکر ناول کے باب میں آئے گا۔واضح رہے انور رومان کی شہرت ایک مورخ اور مترجم کی ہے۔ان کی افسانہ نگاری اور نثری نظموں کا تجزیاتی مطالعہ قبل ازیں نہیں کیا گیا۔لہٰذا ان کی تحریروں کا تفصیلی تعارف اور تجزیہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

انور رومان (۱۹۲۴ء۔۲۰۱۰ء)

۱۹۴۶ء میں کوئٹہ کے ایک کالج میں تاریخ کے لیکچرر مقرر ہوئے اور پھر انھوں نے اپنی ساری زندگی بلوچستان کے مختلف کالجز میں تدریس کے فرائض ادا کرتے گزار دی۔انور رومان نے بلوچستان پر لکھی گئی کئی انگریزی کتب کو اردو میں ترجمہ کیا۔اور خود بھی بلوچستان کی تاریخ اور ادب پر لکھتے رہے۔اس کے علاوہ وہ بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھتے رہے۔ان کی اہم کتابوں میں براہوی لوک کہانیاں ،انوارئیے ،رومانیے ،خانہ بدوش اور قمقمے ہیں۔انور رومان نے کئی افسانے اور نثری نظمیں بھی لکھی ہیں جو ان کتابوں میں شامل ہیں۔''ویری ناگ'' انور رومان کا لکھا ہوا بلوچستان میں اردو کا پہلا باقاعدہ افسانہ ہے،جو قیام پاکستان کے فوراً بعد

یعنی ۱۹۴۸ء میں سامنے آیا۔ یہ آزادی کشمیر کے پس منظر میں ہے۔ اس کا مرکزی کردار ایک عام کشمیری نوجوان ہے ، جو اپنے وطن پر حملہ آور بیرونی فوج [مراد بھارتی فوج ہے] کے خلاف جنگ لڑتا نظر آتا ہے۔ ٹینکوں اور جہازوں کے مقابلے پر اس کے پاس صرف ایک بندوق ہوتی ہے۔ ایک موقع پر جب وہ ایک بڑے پتھر کی آڑ میں بیٹھا ہوتا ہے اور دشمن کے ٹینک اس پہاڑی پر چڑھنا چاہتے ہیں تو وہ اسی پتھر کو لڑھکا دیتا ہے اور ٹینک کو تباہ کر دیتا ہے۔ جنگ کے دوران افسانے کا یہ مرکزی کردار اپنے وطن کو یوں یاد کرتا ہے:

> وہ پتھر کی ایک ہموار سل پر لیٹے لیٹے سوچنے لگا۔ وہ آزادی کی اس جنگ میں غازی بنے گا۔ پھر اپنے اسی خوبصورت گاؤں میں جائے گا وہ ولر کے کنارے پہاڑوں میں گھرا ہوا چشموں سے کھیلتا ہوا خوبصورت سنگنور، زمیں پر اترا ہوا بہشت !!! اسے یاد آیا کہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں لہرا لہرا کر ولر کے سینوں پر چلتی تھیں اور وادی میں پھولوں، پھلوں اور خوشبوؤں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ دور افقوں پر سرسبز پہاڑ سرمئی دھاریاں بنا جاتے دنیا ایک طاؤس کی طرح رنگین ہو جاتی۔ [۵]

محولا بالا اقتباس انور رومان کے رومانوی اسلوب کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ افسانے کا ہیرو جو خود کلامی کرتا ہے؛ اس میں افسانہ نگار بڑی خوبی سے اپنا مطمع نظر اور مقصد واضح کرتا ہے، ایک مثال ملاحظہ ہو۔

> میں کشمیری ہوں میری زندگی ایک دلفریب شبہیہ ہے لیکن جب تم اس شبہیہ کو چکنا چور کرنا چاہتے ہو تو وہی کشمیری تمھاری فوجوں کی موت ہے۔ تمھارے وقار کی لاش، تمھارے سامراج کا جنازہ۔۔۔ [۶]

درج بالا انہی سطور پر افسانے کا اختتام ہوتا ہے۔ اس افسانے میں ویری ناگ کے علاوہ گلگت، سکردو، کشتواڑ، تراڑ خیل، پونچھ، مینڈھر، اور پانڈہ میں بھی آزادی کی لہر اٹھنے کا ذکر ملتا ہے۔ انور رومان نے صرف یہی ایک افسانہ نہیں لکھا بلکہ اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی دیگر افسانے لکھے ہیں جو ان کی کتاب قمقمے (۱۹۷۷ء) میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں ان کی نثری نظموں کے ساتھ ساتھ جو افسانے ملتے ہیں ان میں دو سپاہی، ایک زخمی عورت، آوازوں کا جلوس، ایک خواب، بے بہا، شناور، زندہ در گور اور صرف ایک روٹی قابل ذکر ہیں۔ خلیل صدیقی قمقمے کی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> قمقمے کے فن پارے روایتی اور مروجہ اصنافِ ادب کے لوازمات اور تکنیک کا التزام کر کے نہیں لکھے گئے اور ان کی صنفی حیثیت کا حتمی اور قطعی تعین مناسب بھی نہیں تاہم ان کے بھرپور تاثر اور فن کار کے فنی خلوص کی کرشمہ سازیاں دامنِ دل کو کھینچتی ہیں۔ [۷]

خلیل صدیقی ان تحریروں کی صنف کا تعین شاید اس لیے نہ کر سکے، کہ افسانوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں کثیر تعداد میں انور رومان کی نثری نظمیں بھی شامل ہیں۔ اُس دور یعنی پچھلی صدی کی ساٹھ اور ستر کی دہائی میں بلوچستان تو کیا اردو ادب کے بڑے مراکز میں بھی نثری نظم کو قبول کیا گیا تھا نہ بہ طور صنف اس کی کوئی خاص اور الگ پہچان تھی۔ آج کی صورتحال کے برعکس بعض ادبی حلقے تو اس صنف کے وجود کے ہی خلاف تھے۔ انور رومان کی اس دور میں لکھی گئی 'شکریہ' کے عنوان سے ایک مختصر نثری نظم ملاحظہ ہو:

شکریہ میرے ان دوستوں کا
جنھوں نے
مجھے ہنستا ہوا پھول سمجھا
اور
وہ
مجھ میں
دہکتے ہوئے انگارے
اور
ابھرتے ہوئے سورج
نہ دیکھ سکے! [۸]

اس نظم میں الفاظ کے دروبست کے علاوہ یک لفظی سطروں کی پیش کش بھی قابلِ توجہ ہے اور اس میں جو گہری معنویت ہے، وہ اسے ایک ادب پارہ ثابت کرتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ آج جو نثری نظم لکھی جا رہی ہے، انور رومان کی نظم ''شکریہ'' اس کے معیار پر پورا اترتی ہے۔ انور رومان کی کتابوں قمقمے اور انوارئیے [یہ عنوان ان کے اپنے نام سے مشتق ہے] میں کثیر تعداد میں ایسی نظمیں موجود ہیں جو الگ سے سنجیدہ تنقیدی مطالعے کا تقاضا کرتی ہیں۔ اس میں مقامیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور آفاقی قدریں بھی۔

نظموں کے علاوہ انور رومان کے افسانے بھی اپنے اسلوب اور پیشکش میں روش عام سے قدرے ہٹ کر ہیں۔ یہ علامتی افسانے نہیں ہیں؛ مگر ان مین ہئیت کے تجربات ملتے ہیں۔، جو خاصے دلچسپ ہیں۔ انور رومان کے

افسانوں سے اردو کے ادبی حلقے اس لیے ناواقف رہے کہ ایک تو خود مصنف نے انھیں افسانہ قرار دینے سے شعوری طور پر گریز کیا اور دوسرے یہ جس مقام یعنی بلوچستان میں لکھے گئے اور شائع ہوئے؛ وہاں ان کی سنجیدہ تنقیدی قرات نہیں ہوسکی۔ اس لیے بہ طور افسانہ ان کی صنف کا تعین نہ کیا جاسکا۔ اسی وجہ سے بلوچستان کا پہلا اور اہم افسانہ نگار ایک طویل عرصے تک نظر انداز ہوتا رہا اور اسے بہ طور افسانہ نگار وہ پہچان اور مقام نہ مل سکا، جس کا وہ حق دار ہے۔
انور رومان کے افسانوں کے موضوعات جنگ زدہ انسان کے رویے، استحصال، غربت، انسانی بے حسی اور عورت کی سماجی حالتِ زار وغیرہ ہیں۔ ان میں سے بعض افسانے تو مکمل طور پر مکالماتی انداز میں لکھے گئے ہیں، جبکہ بعض افسانے اقتباس کی شکل میں ہیں۔ اس سے ان کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے، مثلاً ایک افسانہ ''آوازوں کا جلوس'' میں لگ بھگ پندرہ مختصر اقتباسات الگ الگ آوازوں کی شکل میں ہیں مگر ان کا بنیادی تھیم ایک ہے۔ اس افسانے کے ذیلی عنوانات یوں ہیں۔

۱۔ قدیم ہڑپہ سے ایک آواز ۲۔ آریہ ورت کی آواز ۳۔ ٹیکشا سیلا کی آواز ۴۔ یونان کی آواز

۵۔ ہنوں کی آواز وغیرہ وغیرہ۔

ایسی تحریروں میں تاریخی عناصر کے پہلو بہ پہلو معاصر صورتحال اور افسانویت خاصی نمایاں نظر آتی ہے مثلاً 'ٹیکشا سیلا کی آواز' کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

> شانتی شانتی، اے آدمیوں کے گروہو، اے انسانوں کے جمگھٹو، شانتی! یہ سنسار ایک پاٹھ شالا ہے۔ ایک آشرم، ایک مقدس وہار! یہاں ہر درخت میں ایک روح ہے اور وہ روح بدھ بننے کے لیے گیان دھیان میں مشغول ہے۔[۹]

اس میں نہ صرف درختوں کو زندہ وجود قرار دیا گیا ہے بلکہ ان کی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے اور انسانوں سے ان کا وجود تسلیم کرنے کو کہا گیا ہے۔ انور رومان کے اس نوع کے افسانے انھیں بلوچستان کا پہلا باقاعدہ افسانہ نگار ثابت کرتے ہیں۔ ان سے پہلے یا ان کے ہمعصر لکھاریوں کی ایسی تحریریں نہیں ملتیں جو افسانے کے فنی تقاضوں کو اس طور پورا کرتی ہوں۔ انور رومان کے بعد بلوچستان میں اردو افسانے کی روایت کا دوسرا اہم نام سید خلیل احمد کا ہے۔
سید خلیل احمد سے قبل کوئٹہ میں ۱۹۵۵ء میں ایک کتاب وادی بولان میں شائع ہوئی، اس میں شاعری اور مضامین کے ساتھ ساتھ چار افسانے ''نینی''، ''فنکار''، ''ادب برائے ۔۔۔'' اور ''نوکری'' شامل ہیں۔[۱۰] یہ افسانے

نالترتیب عبدالمنان شیخ، سید اختر ہاشمی، فضل الٰہی حلیم اور ملک محمد صادق ناظر کے ہیں۔ یہ سادہ کہانیاں ہیں، ان میں سے ایک کہانی بھی ایسی نہیں جو قاری پر اثر انداز ہونے کی دائمی استعداد رکھتی ہو۔ اسی طرح اس زمانے کے بعض اخباروں مثلاً معلم اور تعمیر بلوچستان میں کچھ افسانوں کا حال ملتا ہے۔ اب یہ اخبارات دستیاب ہیں نہ ان میں چھپنے والی کہانیاں اور نہ ہی ان کے مصنفین کے بارے معلومات میسر ہیں۔ جب تک یہ کہانیاں سامنے نہیں آتیں یا ان کے لکھنے والوں کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا، اس بارے کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ اس مقالے میں کسی اخبار میں شائع ہونے والی کسی کچی پکی کہانی کی بجائے مستند رسائل اور افسانوی مجموعوں کو سامنے رکھتے ہوئے بلوچستان میں اردو کے نثری ادب کا جائزہ لینا مطلوب ہے، تا کہ بلوچستان میں اردو ادب کے ارتقاء کی ایک حقیقی صورت حال سامنے آ سکے۔ اس لیے مطبوعہ کتب کے تناظر میں اردو افسانے کا تجزیاتی مطالعہ اس باب میں پیش کیا جا رہا ہے۔

سید خلیل احمد (۱۹۲۹ء۔۲۰۰۵ء)

ان کا تعلق خیبر پختونخواہ کے شہر مانسہرہ کے ایک سید گھرانے سے تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کوہاٹ جبکہ ایم۔اے انگریزی کراچی یونیورسٹی سے کیا تھا۔ سید خلیل احمد نے ۱۹۵۸ء میں کوئٹہ سے تدریسی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور قریباً تیس سال تک کوئٹہ کے مختلف کالجز سے بہ طور استاد اور پرنسپل وابستہ رہے۔ اس قدر طویل عرصہ کے قیام نے انھیں بلوچستان کا شہری بنا دیا تھا، ان کے افسانے اس دور کے مختلف رسائل رہے ہیں۔ ان کے جو افسانے شائع ہوئے ان کے نام ''بھابی''، ''دو بھوت'' اور ایک افسانہ ''مالک'' ہے جو سـ‍ـــر آب میں شائع ہوا تھا۔ ''مالک'' ان کا سب سے اچھا افسانہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ''مالک'' کا شمار اردو کے چند بہترین افسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ موضوع اور مواد کے ساتھ ساتھ اس کا اسلوب اور ٹریٹمنٹ نہایت خوبی سے کی گئی ہے۔ اس کا موضوع غربت اور معاشی وجنسی استحصال ہے۔ سید خلیل احمد کا واحد افسانوی مجموعہ خمار زہر آلود کے نام سے کوئٹہ سے شائع ہوا تھا۔ یہ بلوچستان سے شائع ہونے والا اردو کا پہلا مطبوعہ افسانوی مجموعہ ہے، اس کا تعارف وتجزیہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔

خمار زہر آلود

اس میں کل تین (۳) افسانے ہیں، مگر ان کی طوالت کا اندزہ اس کتاب کے صفحات کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے، جو ۴۵۶ ہے۔ کتاب میں شامل پہلا افسانہ ''جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے'' ۸۰ صفحات پر مبنی ہے، دوسرا افسانہ ''خزاں بدوش بہار وخمارِ زہر آلود'' کے صفحات کی تعداد ۱۳۰ ہے، جبکہ تیسرا افسانہ ''درد وہ سنگ گراں ہے'' ۲۱۵

صفحات پر مشتمل ہے۔ان افسانوں کی طوالت کے پیش نظر اگر انہیں ناولٹ یا مختصر ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

پہلے افسانے ''جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے'' کا آغاز ایک پر شور گلی کے منظر سے ہوتا ہے اس میں ٹیپ ریکارڈ کے گانوں، بچوں اور مرد و خواتین کی آوازیں پر شور زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ افسانے کے ماحول، مختلف علاقوں اور سڑکوں کے ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کراچی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً بندر روڈ، الفنسٹن سٹریٹ، بولٹن مارکیٹ، ٹاور اور کیماڑی وغیرہ کا تذکرہ افسانے میں بار بار آیا ہے۔افسانے میں آزادی کے بعد کے پاکستان کے سیاسی وسماجی حالات اور معاشرتی زندگی کا عکس ملتا ہے جس سے ایک انتشار، ابتری اور منتشر الخیالی کا اظہار ہوتا ہے۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی فرد کس ذہنی کشمکش کا شکار تھا اور لوگ کس طرح دوغلی زندگی جینے لگے تھے اور جس اہم اور اعلیٰ مقصد کے لیے ملک بنایا گیا تھا۔ ابتدا ہی سے مختلف طبقوں نے اپنے عملی رویوں سے اس اعلیٰ فکر کو غلط ثابت کرنا شروع کر دیا تھا۔

دوسرا افسانہ ''خزاں بدوش بہار وخمارِ زہر آلود'' ایک رومانوی افسانہ ہے جو فرد کے جذبہء محبت کو موضوع بناتا ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک شخص بظاہر جیسا نظر آتا ہے حقیقت میں ویسا نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی میں ایک ایسی دل کشی پائی جاتی ہے جس میں موت اور حسن کی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ افسانہ زندگی کے بیان سے موت اور موت سے دوبارہ زندگی بلکہ ایک نئی زندگی کے آغاز پر ختم ہوتا ہے۔اس طرح گویا زندگی کا تسلسل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

تیسرا طویل افسانہ ''دردوہ سنگ گراں ہے'' اس کا مرکزی کردار حسنین نامی نوجوان ہے جو اپنے دوست کی بہن کو چاہتا ہے اور اس سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے مگر ان کی جوان بیوہ ماں جسے سہیل خالہ کہتا ہے اس کے راستے کی دیوار بن جاتی ہے۔ وہ دراصل خود سہیل کو چاہنے لگتی ہے کہ وہ ایک نا آسودہ عورت ہوتی ہے۔ یہ افسانہ اصل میں اسی ''خالہ'' کا المیہ ہے۔لیکن یہ بات افسانے کے اختتام میں جا کر کھلتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کرار حسین نے اپنے پیش لفظ میں خالہ کو اس افسانے کا مرکزی کردار کہا ہے۔[11] یہ ایک سادہ بیانیہ افسانہ ہے۔اس میں 'بیک فلش' یا شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال ملتا ہے جو فنی پختگی کے ساتھ برتا گیا ہے۔بعض جگہ غیر ضروری تفصیلات افسانے کے فن پر بوجھ بنتی نظر آتی ہیں۔ افسانے میں محبت اور رومان کے بیان میں کہیں کہیں جنسی لذتیت بھی نظر آتی ہے۔ جنس جس طرح معاشرے میں انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔اور فرد معمولی کی زندگی سے ہٹ کر الیے کا شکار ہو جاتا

ہے۔خصوصاً عورت جنسی نا آسودگی کے سبب جس طرح ایک آباد گھرانے کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔اس موضوع کو مؤثر کن انداز میں اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔جنس کا تذکرہ سید خلیل احمد کے افسانوں میں عام ملتا ہے۔ مثلاً اس کتاب کے پہلے افسانے میں ایک کردار جنس کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> ایک وہ زمانہ تھا کہ محبت یہاں سے کی جاتی تھی وہ اپنے سر کو ہاتھ لگاتا ہے یعنی دماغ سے پھر کچھ صدیوں تک دل سے کی جاتی رہی اور اب محبت کا مسکن کہیں ٹانگوں کے آس پاس ہے گدھوں اور کتوں کی طرح۔[۱۲]

بلوچستان کی پہلی باقاعدہ خاتون افسانہ نگا؛رفعت زیبا

بلوچستان میں مرد افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی افسانے میں اپنی تخلیقی شعور کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔رفعت زیبا ان میں سے نمایاں نام ہے۔رفعت زیبا افسانے کے ساتھ ساتھ ناول بھی لکھ چکی ہیں جن کا ذکر اگلے باب میں جو ناول سے متعلق ہے آئے گا۔ان کا افسانوی مجموعہ چاند کا زہر جو۱۹۷۳ء میں کوئٹہ سے شائع ہوا، بلوچستان سے شائع ہونے والا کسی بھی خاتون کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ذیل میں رفعت زیبا کے افسانوں کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

چاند کا زہر

اس میں کُل سات (۷) افسانے شامل ہیں۔جن کے عنوانات یوں ہیں:

۱۔ چاند کا زہر	۲۔ شاہکار	۳۔ سیماب
۴۔ ریشماں	۵۔ خوابوں کے آبگینے	۶۔ شعلے کی شبنم
۷۔ تنہا تنہا		

رفعت زیبا کے بیشتر افسانے محبت کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ان میں سے بیشتر افسانے مقبول عام ادب [پاپولر لٹریچر] کے زمرے میں آتے ہیں۔ان میں عشق میں ناکامی اور کامیابی دونوں طرح کے نتیجے دکھائے گئے ہیں۔''ریشماں'' اس مجموعے کا اہم افسانہ ہے جس میں ادبیت پائی جاتی ہے۔یہ غالباً برصغیر کی معروف لوک فنکارہ ''ریشماں'' پر لکھا گیا ہے۔افسانے میں وہ ایک خانہ بدوش قبیلے کا فرد ہوتی ہے، جو ایک دن اپنی سہیلی کے

ساتھ لال شہباز قلندر کے عرس میں جاتی ہے اور وہاں بیخود ہو کر عارفانہ کلام گانے لگتی ہے۔ وہیں کراچی ریڈیو کا ایک پروڈیوسر اس کی آواز سے متاثر ہو کر اسے اپنے دفتر بلاتا ہے، جہاں وہ اپنے ابتدائی گانے ریکارڈ کراتی ہے اور اسے عوام کی بے حد پذیرائی ملتی ہے مگر وہ شہرت اور دولت پانے کے باوجود اپنے قبیلے میں ہونے والے رشتے پر قائم رہتی ہے اور اسی شخص سے شادی کرتی ہے جس سے اس کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ یہ افسانہ ریشماں کی داستانِ حیات معلوم ہوتا ہے۔ رفعت زیبا نے اس کہانی کو دلچسپ انداز اور مؤثر اسلوب میں پیش کیا ہے۔ افسانے میں ایسے مکالمے بھی ہیں جن سے کرداروں میں موجود طبقاتی شعور کا احساس اجاگر ہوتا ہے اور یہ بھی کہ صارفی معاشرت انسانوں کو ان کی محرومیوں کا احساس کیسے دلاتی ہے:

نیلما۔ میں اکثر سوچتی ہوں۔ کیا ہم ہمیشہ یونہی ہر چیز کو ترستے رہیں گے۔ کیا کبھی ہمیں عمدہ کھانا ریشمی لباس میسر نہ آئے گا۔ کیا کبھی ہماری خواہشیں، ہماری آرزوئیں پوری نہ ہوں گی۔ میں شہر جاتی ہوں تو کیسے ایک ایک چیز پر میری للچائی ہوئی نظریں پڑتی ہیں۔۱۳

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رفعت زیبا غریب انسانوں کے جذبات و احساسات کو کہانی کے روپ میں پیش کرنے پر خاصی قدرت رکھتی ہیں۔ احساس محرومی ان کی تحریر میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے، اسی افسانے ''ریشماں'' میں آگے چل کر لکھتی ہیں:

آخر یہ کیسا انصاف ہے قدرت کا۔ کوئی کوٹھی میں رہتا ہے، کاروں میں پھرتا ہے، اطلس و کمخواب میں سوتا ہے۔ اور ہمیں کچی مٹی کا مکان بھی میسر نہیں۔ روکھی روتی کھا کھا ہمارے پیٹ جواب دینے لگتے ہیں۔ طرح طرح کی بیماریاں ہمیں گھیر لیتی ہیں اور ہمارے پاس علاج کرانے کو پیسہ نہیں ہوتا۔ آخر کار ہم یوں مر جاتے ہیں جیسے زمیں پر رینگنے والے کیڑے۔۱۴

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ایک اہم افسانہ ہے۔ اس پر حیرت ہوتی ہے کہ ایک پاپولر ادب لکھنے والی خاتون نے ان مسائل کو خوبی سے چھیڑا ہے افسانے میں شاہباز قلندر کے مزار کی نسبت سے لوک گیت کے بول ''لال میری پت رکھیو بلا۔ جھولے لالن۔ سندھڑی کا۔ سہوان دا۔ شاہباز قلندر'' ۱۵ نہ صرف اس میں واقعیت کا رنگ بھرتے ہیں، بلکہ اس کے اسلوب کو نکھارتے بھی ہیں۔ اسی طرح ایک اور افسانہ 'خوابوں کے آبگینے' کے مرکزی کرداروں کا اُردو کے ناول نگار عبداللہ حسین کی تحریریں اور احمد فراز کی شاعری پڑھنا افسانہ نگار کی ہمعصر پاکستانی

ادب سے آ گاہی اور ادبی شعور کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ مجموعے میں شامل بعض ہلکی پھلکی کہانیوں کے باجود اس مجموعے کی ادبی افادیت ثابت ہوتی ہے۔ واضح رہے یہ بلوچستان سے شائع ہونے والا دوسرا جبکہ کسی خاتون کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ ایک ایسا علاقہ جہاں اُردو ادب کی روایت زیادہ پرانی نہیں وہاں کی خاتون لکھاری کا اس نوع کے افسانے لکھنا ایک اہم بات ہے۔

میرے زخم بکتے ہیں

یہ رفعت زیبا کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں ذیل کے گیارہ (۱۱) افسانے شامل ہیں:

۱۔ میرے زخم بکتے ہیں	۲۔ دوسرا مرد	۳۔ ادھورا چہرا
۴۔ دل دریا سمندروں ڈونگھے	۵۔ چاند کا زہر	۶۔ گریز
۷۔ صحرا اور بوند	۸۔ جب مجھے قتل کیا گیا	۹۔ تنہا تنہا
۱۰۔ چاک گریبان	۱۱۔ جو بچے میں سنگ سیمنٹ لو	

ان میں سے ''چاند کا زہر'' اور ''تنہا تنہا''، ان کے پہلے افسانوی مجموعے چاند کا زہر میں شامل ہیں۔ دیگر تحریروں میں سبھی تحریریں افسانے نہیں، بلکہ ان میں سے کچھ ان کی آپ بیتی کے مختلف ابواب کہے جاسکتے ہیں۔ اس کا احساس خود مصنفہ کو بھی ہے اسی لیے وہ لکھتی ہیں ''میں نہیں جانتی کہ اسے افسانوں کا مجموعہ کہوں یا کہیں کہیں بایو گرافی''[۱۶] آپ بیتی کے زمرے میں آنے والی تحریروں میں ''میرے زخم بکتے ہیں''، ''جب مجھے قتل کیا گیا''، ''چاک گریباں'' اور ''جو بچے میں سنگ سمیٹ لو'' شامل ہیں۔ اس مجموعے کے اکثر افسانوں کو نیم رومانوی کہا جاسکتا ہے، جو مرد کے جبر، ازدواجی زندگی کی تلخیوں اور عورت کی جذباتی ناآسودگی کو موضوع بناتے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں وصل اور اختلاط کے مناظر کا بیان بعض اوقات جنسی لذتیت پیدا کرتا ہے۔ اردو افسانہ آج جس مقام پر ہے اس کے پیش نظر یہ افسانے فنی طور پر نہایت کمزور ہیں اور قاری پر کوئی تاثر قائم نہیں کرتے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے ان کا مطالعہ اکتاہٹ کا موجب بنتا ہے۔ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ چاند کا زہر کی مصنفہ کا تیس سال بعد شائع ہونے والا افسانوی مجموعہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے کی نسبت موضوع، فن اور اسلوب کے حوالے سے بہت کمزور ہے، حالانکہ اس میں فنی پختگی اور موضوعاتی تنوع زیادہ وسیع ہونا چاہیے تھا۔ رفعت زیبا کے مجموعے چاند کا زہر پر تبصرہ کرتے ہوئے مبارکہ حمید درست لکھتی ہیں کہ ''ان کے افسانوں میں

اندازِ بیان سادہ ہے۔ پڑھنے میں ان کے افسانے رواں ہیں، لیکن زندگی کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کے اعتبار سے ان افسانوں میں کوئی گہرا نقطہ نظر واضح نہیں ہے۔'' ۱۷ حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ بات رفعت زیبا کے تمام افسانوں پر صادق آتی ہے۔

شاہین روحی بخاری

شاہین روحی بخاری افسانہ وناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صحافی بھی ہے۔ کاغذ کا بدن شاہین روحی بخاری کا واحد افسانوی مجموعہ ہے۔

کاغذ کا بدن

اس میں کل درج ذیل چودہ (۱۴) افسانے شامل ہیں۔

۱۔خدا کی آنکھیں ۲۔سویٹ ہارٹ ۳۔چن پیر ۴۔کاغذ کا بدن ۵۔ڈارلنگ ۶۔بیری کا درخت

۷۔مارشل آرٹ ۸۔کماؤ ۹۔فٹے منہ ۱۰۔گرم پانی ۱۱۔لفنگا ۱۲۔تپتا چاند ۱۳۔شہزادی ۱۴۔سرد خون

شاہین روحی کی کہانیوں میں رومان اور محبت بھی ملتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ غربت وافلاس، انسانی رویوں کی پیچیدگی اور کہیں نفسیاتی مسائل کی گرہ کشائی بھی کرتی ہے۔ جنگ زدہ ملکوں اور معاشروں میں بچوں پر بیتنے والے مظالم بھی اس کی تحریر میں جھلکتے ہیں۔ اس طرح گویا اس کے موضوعات میں ایک تنوع نظر آتا ہے۔ ''کماؤ'' اور ''فٹے منہ'' اسلوب، بنت اور موضوع کی بنا پر اس مجموعے کے اہم افسانے ہیں۔ افسانہ ''کماؤ'' غربت کے موضوع پر ہے اور ''فٹے منہ'' ماں بیٹے کے ناجائز تعلق پر ہے۔ اس کا مرکزی کردار نیناں نامی طوائف ہے۔ وہ جسم فروشی کے باعث اپنے بیٹے کو ایک سہیلی کے پاس پرورش کی غرض سے رکھتی ہے تاکہ وہ پڑھ لکھ کر نیک اور بڑا آدمی بنے مگر شومئ قسمت کہ جوان ہونے پر اس کا بیٹا سندر اسی کے ڈیرے پہ آنا جانا شروع کرتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ بالآخر جب وہ شادی کرنا چاہتے ہیں، اس وقت بالکل آخر میں اچانک نیناں کو سندر کی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اس کا اپنا حقیقی بیٹا ہے۔ وہ یہ حقیقت جان کر ایک شدید صدمہ کا شکار ہوتی ہے اور پھر خودکشی کر لیتی ہے۔ نیناں کے المیے سے اس کے ٹکڑوں پر پلنے والی مائی چھاتاں بھی آگاہ نہیں ہوتی جو اس کی خودکشی پر روتے ہوئے کہتی ہے۔'' در فٹے منہ نیناں تجھ پر۔ دو کوڑی کے عاشق سندر پر مر مٹی۔ ہن ساڈے روٹی پانی دا کی

ہووے گا۔"[۱۸]

شاہین روحی بخاری کا یہ افسانہ فنِ افسانہ کے تمام لوازمات پورے کرتا ہے جبکہ اس کا موضوع نہایت چونکا دینے والا ہے۔ افسانے کی قرأت سے ذہن فوری طور پر یونانی المیہ داستان ایڈی پس کی طرف جاتا ہے۔ دونوں کے حالات وواقعات میں اگرچہ کافی فرق ہے۔ مگر ایک وجہ اشتراک یہ ہے کہ وہاں بھی ماں بیٹے کی شادی ہوتی ہے اور یہاں بھی حقیقی ماں بیٹے محبت کے رشتے میں منسلک دکھائے جاتے ہیں۔ یہ موضوع انسانی زندگی کے بدترین المیوں میں سے ہے۔ افسانہ نگار نے بھی اسے نہایت خوبی سے برتا ہے۔ اس لیے کہانی میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ بلوچستان جیسے قبائلی سماج میں رہنے والا فنکار بالخصوص ایک عورت اس طرح کے موضوع پر افسانہ لکھتی ہے۔ مبارکہ حمید اس اہم بات کو نظر انداز کرتے اور شاہین بخاری کے فن کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

شاہین بخاری بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں، ان کی نگا میں وہ گہرائی اور تخیلاتی فضا پیدا نہیں ہوسکی جو ایک کامیاب افسانہ نگار کے لیے ضروری ہے۔ ان کی تحریر میں افسانوی حسن اور حقیقت کا وہ گہرا ادراک نہیں ہے جو افسانے کو افسانہ بنا سکے۔ سطحی موضوعات اور سطحی رنگ وروغن والی زندگی کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، لیکن تحریر میں وہ قوت کم ہی پیدا ہوسکی، جو انھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے کوئی اہم مقام دلا سکتی۔۱۹

محولہ بالا اقتباس میں پیش کی گئی مبارکہ حمید کی رائے جانبدارانہ لگتی ہے، کیونکہ شاہین بخاری کے افسانے، افسانے کے کم از کم معیار پر پورا اترتے ہیں۔ انھوں نے فنی نقطۂ نظر سے جس گہرائی اور تخیل کی بات کی ہے، وہ تو بلوچستان کے شاید ہی کسی فنکار کے ہاں نظر آسکے۔ ایسی فنی پختگی تو ان دوسرے لکھاریوں کے ہاں بھی نہیں ملتی جن کے ہاں مبارکہ حمید کو نظر آتی ہے۔ بلوچستان کے ادب پر نظر رکھنے والے ایک اہم نقاد فاروق احمد، شاہین روحی بخاری کو "نسائی روایت کا امین افسانہ نگار" قرار دیتے ہیں۔۲۰

اسلوب

شاہین روحی بخاری اُردو زبان پر دسترس رکھتی ہے۔ اس کے افسانوں کی زبان سادہ اور رواں ہے۔ کہیں کہیں اردو محاروے، روزمرہ اور ضرب الامثال کا استعمال نظر آتا ہے۔ وہ تشبیہات کا استعمال بھی جانتی ہے۔ اس کے اکثر جملے مختصر ہوتے ہیں جو تحریر کی قرات کو آسان بناتے ہیں۔ بعض جگہ انگریزی کے الفاظ اور جملے بھی ملتے ہیں۔

کئی افسانوں میں بلوچستان کا 'لوکیل' ملتا ہے۔شاہین روحی نے کچھ ایسے الفاظ بھی استعمال کیے جو یہاں کی اُردو میں مستعمل ہیں مثلاً باڑی[ایک کھیل کا نام] وغیرہ۔ایک آدھ جگہ اُردو کا بلوچستانی لہجہ نظر آتا ہے جس میں مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر بنا کر استعمال کیا جاتا ہے۔اسی طرح اس کی تحریر میں پنجابی کے الفاظ بھی ملتے ہیں اور پورے جملے بھی۔بعض کرداروں کے نام علاقائی ہیں مگر وہ بلوچستان کے نہیں بلکہ پنجاب کے ہیں۔اس کے افسانوں میں شہر اور دیہات ہر دو طرح کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے ہر جگہ پر عورت کو مختلف مسائل درپیش ہیں وہ چونکہ خود عورت ہے۔ اس لیے شہری اور دیہی عورت کے مختلف مسائل کو اس نے اپنے افسانوں میں خوبی سے پیش کیا ہے۔اس کے افسانے فن کے کم از کم معیار پر پورا اترتے ہیں۔اگر یہ مدنظر رکھا جائے کہ وہ ایسے علاقے میں بیٹھ کر افسانے لکھتی رہی ،جہاں اردو افسانے کی روایت سرے سے موجود نہ تھی۔تو ان افسانوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔اس کتاب کے پیش لفظ میں انتظار حسین شاہین بخاری کو ''بلوچستان میں اردو افسانے کا نخلستان'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اصل میں جو لکھنے والے ادبی مراکز سے دور بیٹھ کر لکھتے ہیں، ان کا لکھنا محض ادبی سرگرمی نہیں ہوتی۔اس کے ساتھ وہ ایک تہذیبی فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ادبی سرگرمی کی تفریض کا فریضہ۔شاہین روحی بخاری جس علاقے میں بیٹھ کر افسانے لکھ رہی ہیں۔اس علاقے میں شعر وشاعری کی سرگرمی تو نئی نہیں ہے لیکن افسانے کی سرگرمی نئی نئی ہے تو وہاں جو لکھنے والے افسانہ لکھ رہے ہیں وہ اصل میں افسانے کی ایک روایت قائم کر رہے ہیں۔اس اعتبار سے شاہین روحی بخاری کی افسانہ نگاری بلوچستان کے سیاق وسباق میں ایک اہم واقعہ ہے۔اس علاقہ کی فضا میں ایک عورت کا افسانہ لکھنے کا عمل لاہور میں بیٹھ کر کسی خاتون کے افسانہ یا ناول لکھنے سے کہیں زیادہ بامعنی عمل ہے۔[۲۱]

معین الحق کے افسانے:

معین الحق نے بھی چند افسانے لکھے ہیں، جو اس کی کتاب تاریکیاں میں شامل ہیں۔اس کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔

تاریکیاں

معین الحق کے اس واحد افسانوی مجموعے میں کل درج ذیل چودہ (۱۴) افسانے شامل ہیں۔

ا۔سہارا ۲۔طالب ۳۔ااخری کہانی ۴۔خان بادشاہ ۵۔مصلوب رشتے ۶۔تاریکیاں ۷۔حسرت

۸۔پھانسی گھر ۹۔سلاخوں کے پیچھے ۱۰۔ پورے دس ۱۱۔شو بزنس ۱۲۔آنکھیں ۱۳۔روح کی آس

۱۴۔ تعمیرِ آشیاں کے لیے

معین الحق اپنی افسانوں کی بنیاد سماجی حقیقت نگاری پر رکھتا ہے، اس لیے اس کی کہانیوں میں معاشرتی ظلم و جبر، طبقاتی تفریق اور عورت کے جسمانی اور سماجی استحصال کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ اس کے افسانوں کی بنت میں ترقی پسند رجحان بھی حاوی نظر آتا ہے جو اسے پاکستان کے اردو افسانے کی مجموعی ترقی پسند روایت سے جوڑتا ہے۔ پہلے افسانے ''سہارا'' کا موضوع نالائق اولاد کا پڑھ لکھ کر نوکری اور شادی کے بعد اپنے ماں باپ کا خیال نہ رکھنا ہے۔ ماں باپ کس چاہت اور محبت سے اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ دکھ سکھ میں اولاد کو آسائشیں مہیا کرتے ہیں۔ مگر اپنی آخری عمر میں یہی والدین اولاد پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایسا المیہ ہے جو آج بھی اکثر دیکھنے سننے میں آتا ہے۔ کہانی کا پیرائیہ اظہار دلچسپ اور متاثر کن ہے۔ معین الحق کے موضوعات میں جاگیردارانہ معاشرت کی خرابیاں، ملائیت، گربت اور انسان کی بےتوقیری وغیرہ ہیں۔ اس کے بعض افسانوں میں سقم بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً افسانے ''خان بادشاہ'' میں بیٹیوں کے جہیز کے لیے جس طرح ایک پٹھان کردار کو خودکشی کرتا دکھایا جاتا ہے وہ خلافِ حقیقت نظر آتا ہے افسانہ نگار اس بات سے بےخبر نظر آتا ہے کہ پٹھانوں میں جہیز کا رواج نہیں ہے۔ وہاں تو ولور ہوتا ہے جو دولہا کی طرف سے دلہن والوں کو نقد رقم کی صورت دیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف پٹھانوں کے رواج سے لاعلمی پر مبنی نظر آتا ہے بلکہ ایک پٹھان کی صحیح نفسیاتی توجیح بھی نہیں کرتا، اسے ایک کمزور افسانہ ہی کہا جائے گا۔ معین الحق کے بعض دیگر افسانے بھی خاصے کمزور ہیں مثلاً ''تاریکیاں''، ''حسرت''، ''سلاخوں کے پیچھے'' اور ''پورے دس'' وغیرہ۔ مگر ان کے کچھ افسانے اچھے ہیں۔ اسی طرح کا ایک افسانہ ''مصلوب رشتے'' ہے جو قبائلی سماج میں عورت کے جنسی استحصال کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ دیہی قبائلی سماج میں عورت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ریشم خان کا عمر رسیدہ بہنوئی انارگل ایک رات اس کی چھوٹی بہن یعنی اپنی چھوٹی سالی شہناز کو لکڑیاں چننے اپنے ہمراہ لے جاتا ہے اور اس کی آبروریزی کرتا ہے۔ افسانہ نگار اس کا حال رقم کرتے ہوئے لکھتا ہے:

شہناز کے دانت بج رہے تھے اور وہ سردی سے کانپ رہی تھی، انارگل نے یہ حالت دیکھی تو کہا؛

''آ۔۔۔جان، تجھے گرم کردوں۔''

اس نے اپنی بانہوں میں شہناز کو لے لیا۔شہناز کسمسائی لیکن اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔فضا میں ایک سسکی ابھری۔رشتوں اور انسانیت کے سوکھے پتے جل کر بھسم ہو گئے۔ ایک لٹ گیا اور دوسرے نے تسکین پائی۔۲۲

افسانے میں عورت کی تذلیل اور جسمانی استحصال کا یہ سلسلہ رکتا نہیں، جب ریشم خان جوان ہو کر اس کا بدلہ انار گل کی دوسری نوجوان بیوی زرینہ کی آبرو لوٹ کر لیتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ پہلے شہناز کی صورت میں بھی ایک عورت کی عزت لٹتی ہے اور بدلے میں بھی ایک دوسری عورت کی آبروریزی ہوتی ہے۔ ہر دو صورتوں میں مرد استحصال کنندہ کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ افسانہ سماج میں عورت کے استحصال اور مرد کی بالادستی کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ اور دیہی معاشرت کے پس منظر میں نہایت سفا کی سے سماجی حقیقت نگاری کی جھلک دکھاتا ہے۔معین الحق کے افسانوں پر اپنی تنقید میں مبارکہ حمید لکھتی ہیں:

ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا رجحان ہے جس میں بیشتر موضوعات معاشی حقائق پر مشتمل ہیں۔معاشی ناہمواریاں، مفلسی کا جبر اور مفلسی سے پیدا ہونے والے مسائل ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ان کے افسانوں میں جنسی موضوعات بھی ہیں، لیکن ان کا منبع و مرکز بھی مفلسی یا معاشی ناہمواریوں سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔۲۳

آج پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں جس طرح معصوم بچیوں کی عزت لوٹ کر انھیں قتل کیا جا رہا ہے، جن میں پاکستان کی زینب اور ہندوستان کی آصفہ کے کیسز اندوہ ناک مثالیں ہیں؛ اس تناظر میں قریباً پچاس برس قبل لکھے گئے معین الحق کے افسانے ''مصلوب رشتے'' کی معنویت مزید اجاگر ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا افسانہ بلوچستان کے قبائلی پس منظر میں لکھا گیا تھا۔اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ انسان چاہے قبائلی پس منظر رکھتا ہو یا چاہے وہ جدید شہروں میں رہنے والا بہ ظاہر ایک مہذب آدمی ہو، وحشت سے مکمل طور پر چھٹکارہ نہیں پا سکا۔سماجی سائنسدانوں کے لیے ایسی تحریروں اور واقعات میں غور و فکر بہت سامان ہے۔معین الحق کے دیگر افسانوں میں بھی بلوچستان کے مختلف شہروں اور علاقوں کے نام اور رسم و رواج کے حوالے سے مقامیت کا عنصر ملتا ہے، مثلاً کئی افسانوں میں مستونگ، قلات اور کوئٹہ کے گرد و پیش کا تذکرہ ملتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ تاریکیاں کے تعارف

میں محمد صدیق ان کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔''ان میں علاقائی رنگ کونہایت واضح طور پر پیش کیا گیا ہے۔''۲۴

اسلوب

معین الحق کا اسلوب سادہ اورروان ہے۔ان کی تحریر میں کہیں کوئی پیچیدگی نظرنہیں آتی ہے۔کہانی جیسے بنتی چلی جاتی ہے۔وہ اسے براہ راست اور سادہ انداز میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔اگر چہ انہیں زبان پرعبور حاصل ہے۔مگر روزمرہ اور محاورے بہت کم اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ان کے کئی افسانے بلوچستان کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔جن میں بلوچستانی اُردو کا لہجہ اورلفظیات کا استعمال نظرآتا ہے۔مثلاً ٹانگری،لک پاس(کوئٹہ کے قریب ایک علاقہ)،کلی(گاؤں)،لاندھی(ایک قسم کا خشک گوشت)اور زنانی(عورت)وغیرہ۔بعض کرداروں کی زبانی مخصوص لہجہ بھی پڑھنے کوملتا ہے۔کئی جگہ مؤنث کو مذکر اور مذکر کومؤنث بیان کیا گیا ہے یہ لہجہ بلوچستان بھر میں ملتا ہے۔گویا کئی افسانوں میں مقامیت کا احساس موضوع کے علاوہ زبان کی سطح پر بھی ہوتا ہے۔یہ انداز افسانے کو دلچسپ اور قابل قرات بناتا ہے۔اس طرح ان کے افسانوں میں بلوچستانی اردو کا اسلوب ارتقا پذیرصورت میں نظر آتا ہے۔

خادم مرزا

خادم مرزا بلوچستان میں اردو افسانے کا اہم ترین نام ہے۔ان کا صرف ایک مختصر افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے مگراس ایک افسانوی مجموعے میں ان کافن ایک بلندی پرنظرآتا ہے۔

سات رنگ او رایک گیان

یہ خادم مرزا کا واحد افسانوی مجموعہ ہے جو ذیل کے گیارہ(۱۱)افسانوں پرمشتمل ہے۔

۱۔سسی،سیندوراورسائے ۲۔زمین کی گرہ ۳۔تیسرا گھر ۴۔کاجل کاشہتیر ۵۔ہاروت ماروت

۶۔سمی ۷۔ہمارکہی مانو ۸۔غدارنی ۹۔ڈرے ہوئے لوگ ۱۰۔سات رنگ اورایک گیان ۱۱۔ریت میں گلاب

خادم مرزا بلوچستان کے اُردو افسانے کی روایت کا اہم ترین نام ہے۔اسے زبان وبیان پراستادانہ مہارت حاصل ہے۔اس کے افسانے مقدار میں کم ہونے کے باوجود معیار کے اعلیٰ پیمانے پر پورا اترتے ہیں۔یہ کہانی کی

بنت ،موضوع اور منفرد اسلوب کی بنا پر قاری کی توجہ کھینچتے ہیں۔خادم مرزا گردو پیش کی زندگی کا گہرا مشاہدہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے موضوعات بھی روزمرہ زندگی سے اخذ کرتا ہے مگر اس کی تحریر میں ایک خاص ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔اس کے افسانوں میں سیاست، سماج، حیات و کائنات اور مابعدالطبیعاتی فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔بعض افسانوں میں تاریخی شعور کارفرما نظر آتا ہے جو اس کی تحریروں کو گہرائی و گیرائی بخشتا ہے۔اس کے افسانوں کے عنوانات میں بھی انفرادیت جھلکتی ہے، مثلاً ''سسی سیندور اور سائے''، ''زمین کی گرہ''، ''کاجل کا شہتیر''، اور ''سات رنگ اور ایک گیان'' وغیرہ۔خادم مرزا کو منظر نگاری میں کمال حاصل ہے وہ نہایت کم لفظوں میں منظر کی ایسی تصویر کھینچ دیتا ہے جو قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔وہ بے روح اشیاء میں بھی زندگی کے آثار دکھاتا ہے۔اس کے افسانوں میں سائے آوازیں دیتے ہیں اور ریت کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔یہ فن کاری اس کے پہلے افسانے ''سسی، سیندور اور سائے'' میں بھی نظر آتی ہے جو ایک صحرا کی منظر نگاری سے شروع ہوتا ہے۔یوں لگتا ہے جیسے یہ کہانی کسی ایسے علاقے کی ہو جہاں غیر ملکی فوج قابض ہو۔یہ کشمیر بھی ہو سکتا ہے۔افغانستان، لبنان، بیروت اور اب شام یا عراق وغیرہ کا کوئی علاقہ بھی۔اگر تھل کو ایک علامت سمجھا جائے تو پھر یہ افسانہ کسی بھی صحرا یا پہاڑی علاقے میں قابض فوج کی وجہ سے مقامی لوگوں کو درپیش آنے والے مسائل کی نشان دہی کرتا ہے۔جو لوگ کسی صورت اپنے گاؤں یا گھر کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔وہ کس قسم کے خطروں سے گزرتے ہیں اور کس طرح انسانی المیے رونما ہوتے ہیں۔اس پہلو کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

''زمین کی گرہ'' کا موضوع بھی زمین سے انسان کی وابستگی ہے۔لیکن یہ اس قدر سادہ افسانہ نہیں اس میں بین السطور مابعدالطبیعاتی سوال بھی اٹھائے گئے ہیں مثلاً ایک جگہ پر مرکزی کردار اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

> تم خیالات کی بھیڑ میں کھو جاؤ گے۔زمین کے جس حصے میں قید ہوا سے اگر سمجھ لو۔۔۔تو اتنی ہی جان کاری تمہارے لیے بہت ہے۔ہونا اور نہ ہونا ہر سانس اتر رہا ہے۔یہ سب کایا کے چھل ہیں۔[۲۵]

یہاں کردار ایک فرد نہیں رہتا بلکہ وہ ایک نوع بن جاتا ہے۔اور اس کا گاؤں یا علاقہ پوری دنیا اور زمین بن جاتی ہے۔جو بیکراں کائنات کا محض اک ذرہ ہے۔چنانچہ افسانے کا فکری پھیلاؤ یکدم بہت وسیع ہو جاتا ہے۔'ہونا'

اور 'نہ ہونا' جیسے دو سادہ لفظوں کے کوزے میں ازل و ابد کے مسائل کے دریا کو بند کر دیا گیا ہے۔ افسانے کے اختتام سے پہلے بھی فلسفیانہ نوعیت کے ایسے سوالات ابھارے گئے ہیں۔ خادم مرزا نے بڑی خوبصورتی سے کہانی کے پیرائے میں ان سوالوں کو چھیڑا ہے جو صدیوں سے فکر و فلسفے کا مرغوب موضوع ہیں۔ افسانہ ''کاجل کا شہتیر'' جنس کے موضوع پر ہے مگر اس میں ان خواتین کی جائز جنسی خواہشات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جو شادی شدہ ہونے کے باوجود لمبے عرصے تک اپنے خاوندوں سے دور رہتی ہیں۔ یہ محرومی بالآخر انہیں گناہوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ دیکھا جائے تو عورت کے بجائے اس صورتحال کا قصوار وار مرد ہوتا ہے جو نوکری یا پیسہ کمانے کی خاطر غیر ملکوں میں جاتا ہے اور پیچھے اپنے گھر کو بھول جاتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ میری ایک بیاہتا بیوی بھی ہے جو انسان ہے اور اسے میری ضرورت ہے۔ اس افسانے کے ایک نسوانی کردار پر کاش کور کا واویلا بھرپور احتجاج کی شکل میں یوں سامنے آتا ہے:

> تم سب پتہ نہیں کون سی جنگ لڑ رہے ہو اور پتہ نہیں کون سی شانتی ڈھونڈ رہے ہو۔۔۔ پر تمھیں اپنے گھر کی جنگ کی کوئی خبر نہیں۔۔۔ اس نے دکھ اور تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ خون کے دھبوں کو آخری بار دیکھا۔[۲۶]

خادم مرزا نے جنس سے متعلق اس سماجی المیے کو بھرپور انداز میں اٹھایا ہے۔ افسانہ 'ہاروت ماروت' علامتی افسانہ ہے جس میں اگرچہ ایک کردار ہے مگر وہ راستہ کھویا ہوا ہے۔ یا شاید خود سے کھویا ہوا ہے۔ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ کردار ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کہیں موجود ہے۔

افسانہ ''سمی'' کو نیم علامتی افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ سمی علامت ہے عورت کی۔ جو مختلف اوقات میں مختلف مردوں کے ساتھ تعلق بناتی ہے۔ افسانہ کی ابتداء میں ایک کردار کے ساتھ نظر آتی ہے۔ تو آخر میں مختلف شکلوں میں کئی مردوں کے ساتھ دکھائی جاتی ہے۔ ایک جگہ وہ چار عورتوں میں نظر آتی ہے۔ آجر میں یوں لگتا جیسے ''سمی'' سے مراد روحانی خوشی یا مسرت مراد ہے۔

افسانے ''غدارنی'' میں ان مردوں کے طبقاتی شعور پر گہرا طنز کیا گیا ہے جو کمزور طبقات کی سیاست کرنے کے باوجود اصل میں بورژوا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے استحصال کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ ''پشتونستان'' کے تذکرے کی وجہ سے یہ افسانہ بلوچستان کی مقامی سیاست کے اثرات لیے نظر آتا ہے جبکہ حسن ناصر کا تذکرہ اس کے ترقی پسند رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح افسانہ 'سات رنگ اور ایک گیان' قیام پاکستان اور بنگلہ دیش کے

پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جس میں چاٹگام کے ایک خاندان کے اکثر لوگ پاکستان ہجرت کر آتے ہیں مگر افسانے کا مرکزی کردار اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہ جاتا ہے۔ اور دونوں ماں بیٹا کئی طرح کی مشکلات سے گزرتے ہیں۔

اسلوب

خادم مرزا بلوچستان کے چند گنے چنے صاحب اسلوب افسانہ نگاروں میں سے ہے۔ زبان کے تخلیقی برتاؤ سے اس کی لسانی مہارت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کے چناؤ اور استعمال پر خاصی توجہ دیتا ہے۔ اس کے اکثر جملے مختصر ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں طویل جملے بھی نظر آتے ہیں۔ اس کی منظر نگاری میں زبان و بیان کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ وہ منفرد تشبیہات کا استعمال کرتا ہے۔ بعض جگہ ہم قافیہ الفاظ اس کی نثر میں شاعرانہ خوبی پیدا کرتے ہیں مگر اس کی تحریر افسانے کی زبان ہی رہتی ہے شاعری نہیں بنتی۔ خادم مرزا کی نثر میں ہندی الفاظ و تراکیب، رسم و رواج اور اساطیر کا استعمال حیران کن طور پر بہت زیادہ ہے۔ بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے یہ افسانے کوئٹہ میں نہیں ہندوستان کے کسی شہر میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً ذیل کے جملے میں ہندی الفاظ ایک پوری اسطورہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ ''اس نے انگڑائی لی، چاروں اور رام لیلا پھیلی ہوئی تھی''۔ [۲۷] بعض افسانوں میں اس کا اسلوب علامتی ہو جاتا ہے۔ ایک خاص فکری تہہ داری اور گھمبیرتا اس کی تحریر میں نظر آنے لگتی ہے مگر یہ تفہیم یا معانی کی ترسیل میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ یہ قاری کو بہ غور قرات کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خادم مرزا سادہ جملے بھی بڑی روانی کے ساتھ لکھتا ہے۔ اس کے سادہ جملے بھی فلسفیانہ نکات کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک جگہ لکھتا ہے ''راستہ وہیں رہتا ہے صرف گزرنے والے کھو جاتے ہیں''۔ [۲۸]

خادم مرزا موضوع کی مناسبت سے اسلوب وضع کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے افسانے انسان کے زمینی مسائل ہی کو زیر بحث نہیں لاتے بلکہ ان میں لکھنے والے کے مابعد الطبیعاتی خیالات کی عکاسی بھی ملتی ہے یہ عناصر اس کے افسانوں کی افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسلوب اور مواد کی یہ فنکارانہ بنت اسے پاکستان کے جدید افسانہ نگاروں میں اہم مقام دیتی ہے۔ اس کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے فاروق احمد لکھتے ہیں:

> خادم مرزا جدید افسانہ نگاروں میں ایک سکون، ٹھہراؤ، طمانیت اور نروان کا نام ہے۔ ایسا نروان جس کے پس منظر میں گونجتی گرجتی زندگی کا زیروبم، سیاسی، معاشرتی تغیرات کا اضطراب اور تہذیب و شائستگی کا وقار شامل ہے۔ [۲۹]

آغا گل (پ ۱۹۵۱ء) کی افسانہ نگاری

آغا گل کا شمار بلوچستان کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ بلوچستان اور اس کے سیاسی وسماجی مسائل آغا گل کے افسانوں کا مستقل موضوع ہیں۔ بلوچستان کا 'لوکیل' اور سماج وثقافت اس کے فن کی بنیادی پہچان ہیں۔ مقامی لفظیات کے استعمال اور بلوچستان کے اردو لہجے کی بھر پور عکاسی سے وہ اپنا خاص اسلوب بھی وضع کرتا ہے۔ اس کے اب تک نو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کثیر افسانوی مجموعوں کی بدولت اسے بلوچستان کا اہم افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے مگر جدید اردو افسانے کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعات میں آغا گل کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے حتیٰ تک کہ انوار احمد کی کتاب اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ میں آغا گل کا ذکر ہی نہیں ہے۔ ذیل میں آغا گل کے افسانوی مجموعوں کا الگ الگ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

گوریچ

یہ آغا گل کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے اس میں درج ذیل بارہ (۱۲) افسانے ہیں۔

۱۔ ٹرن ٹیبل ۲۔ ڈاک خانہ ککڑ ۳۔ دوسری بابری مسجد ۴۔ کباڑی بازار ۵۔ اسپیڈ بریکر

۶۔ وادیٔ قاف ۷۔ کورہ کئی ۸۔ ھلی ۹۔ روپے کا جن ۱۰۔ دھوپ کی چادر ۱۱۔ چبر ۱۲۔ گوریچ

پہلا افسانہ ''ٹرن ٹیبل'' ایک اچھا افسانہ ہے۔ یہ ایک ایسے کردار کے بارے میں ہے جو ریلوے میں کلرک ہے۔ وہ فلمی رسالوں میں افسانے بھی لکھتا ہے۔ غریب طبقے سے تعلق رکھنے اور لوگوں کے مقروض ہونے کے باوجود یہ شخص دوستی اور تعلق کی پاسداری کرتا ہے۔ ایک موقع پر جب اُسے پیسوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے وہ اپنے دوست کے خلاف گواہی دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ آخر تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو جاتا ہے۔ افسانے کا راوی جب ایک عرصے بعد اس کے دفتر جاتا ہے تو اس کی جگہ پر اس کا بیٹا کلرک کی سیٹ پر بیٹھا ہوتا ہے۔ جو اپنا تعارف اس شخص کے بیٹے کے طور پر کراتا ہے۔ یعنی کہانی پھر اسی المیے سے شروع ہو جاتی ہے جہاں پر ختم ہوئی تھی۔ اس افسانے کو پڑھ کر بے ساختہ مجید امجد کی نظم ''پنواڑی'' کا آخری شعر یاد آتا ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے:

ایک پتنگا دیپک پر جل جائے، دوسرا آئے
شام کو اس کا کم سن بالا بیٹھا پان لگائے[۳۰]

اس افسانے میں کوئٹہ کی ادبی روایت کی چند اہم شخصیات کا ذکر حقیقی ناموں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جس سے اس پر سچی کہانی کا گمان ہوتا ہے۔ افسانہ 'ڈاک خانہ کلرک' تقسیم ہند کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ جس کا مرکزی کردار امرتسر سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہجرت کا المیہ جھیلتا ہوا بلوچستان کے شہر لورالائی میں قیام کرتا ہے۔ جہاں ڈاکخانے میں ایک چھوٹی سی نوکری کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ڈومیسائل بن جانے کے باوجود اسکے ساتھ دوسرے یا تیسرے درجے کے شہری کا سلوک روا رکھا جاتا ہے جس سے وہ شناخت کے بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ تب وہ پوچھتا ہے:

> میں کون ہوں؟ قمر الدین یا قمر ورفیوجی، نان لوکل، میں کہاں کا لوکل ہوں؟ کس زمین کو اپنا کہوں؟ میں ایسی رجسٹری ہوں جو غلط تقسیم ہوگئی یا ایسا بے رنگ جس کی غلط سارٹنگ ہوگئی ہے۔[۳۱]

افسانے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دوسرے علاقوں سے بلوچستان آنے والے لوگ یہاں کے مختلف علاقوں کے ناموں سے واقف نہیں ہو پاتے۔ جس سے کئی طرح کی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ افسانہ ''دوسری بابری مسجد'' سبی میں زمانہ قدیم سے رہائش پذیر ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی تعلقات کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ بابر سلطان اور شیل (ہندو لڑکی) آپس میں محبت کرتے ہیں۔ مگر مذہب کے اختلاف کے باعث شادی نہیں کر سکتے۔ اس اثناء میں ہندوستان میں بابری مسجد کا سانحہ ہوتا ہے تو دونوں طرف نفرت بڑھ جاتی ہے۔ بابر کا کزن رقابت کی بناء پر موقع پا کر اُسے ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس کا الزام ہندوؤں پر آتا ہے۔ اور لوگ ان کا قدیم مندر جلانا چاہتے ہیں۔ اس دوران بابر ہوش میں آ کر شیل کے ساتھ مشتعل ہجوم میں آتا ہے۔ وہ اپنے قاتل کا نام بتا کر مر جاتا ہے، مگر ہندو مسلم فساد ختم ہو جاتا ہے۔ اگر چہ یہ موضوع نیا نہیں مگر اپنے 'لوکیل' اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے افسانہ دلچسپ ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ آغا گل نے اسے اپنا بہترین افسانہ بتایا ہے۔[۳۲] ''گوریچ'' اس مجموعے کا اہم افسانہ ہے۔ ''گوریچ'' براہوی لفظ ہے اس کے معنی ہیں سخت سرد اور بے رحم ہوا جو انسان، حیوان اور نباتات کے لیے سخت مضر ہوتی ہے۔ یہ افسانہ ان لوگوں پر لکھا گیا جو اپنے حقوق کی جنگ کے لیے پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں، مگر پھر عام معافی کے اعلان کے بعد وہ واپس گھر آ جاتے ہیں۔ انہی کے بچے پڑھ لکھ کر کرپشن کرنے لگتے ہیں۔ اس میں بلوچستان کی سیاسی اور عسکری تحریکوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

گوریچ میں شامل اکثر افسانوں کا لوکیل بلوچستان ہے۔ ان کے موضوعات بھی اسی دھرتی سے متعلق

ہیں۔ان میں بلوچستان کے موسم بھی نظر آتے ہیں اور مناظر بھی۔ان کے افسانوں کے اکثر کردار بلوچستان کے ہی جیتے جاگتے لوگوں پر مشتمل ہیں۔ان کے نام بھی مقامی ہیں۔اکثر کرداروں اور افسانوں پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے آغا گل نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی حقیقی کہانیوں کو افسانے کا روپ دیا ہو۔بعض افسانوں میں زبان کا برتاوا بلوچستانی اردو کی نشاندہی کرتا ہے۔اکثر افسانوں میں بلوچی براہوی اور پشتو زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں۔وہ انگریزی،عربی الفاظ اور جملے بھی بے تکلف استعمال کرتا ہے۔کئی افسانوں میں تاریخی اور تہذیبی آثار بھی نظر آتے ہیں جو اس کے گہرے مطالعے کی علامت ہیں مگر بعض جگہ کچھ تاریخی حوالے غیر فطری محسوس ہوتے ہیں۔آغا گل بعض اوقات مقامی زبانوں کے الفاظ کے معنی بھی افسانے ہی میں بتا دیتا ہے جو افسانے میں مصنف کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے مگر اس سے افسانے کی روانی اور اس کا مجموعی تاثر مجروح ہوتا ہے۔اسی طرح کئی تاریخی حوالے مختلف افسانوں میں دہرائے ہوئے ملتے ہیں۔تاہم بعض جگہ زبان کی غلطیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔آغا گل کے افسانوں پر اپنی رائے دیتے ہوئے قرۃ العین حیدر کہتی ہیں:

مجھے آغا گل کے افسانے بہت پسند ہیں،کیونکہ بلوچستان نے مجھے ہمیشہ فیسی نیٹ کیا ہے۔آغا گل کے افسانوں میں ہیومن ٹریزم کی جوزیریں لہریں ہیں۔اس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔آج کل یہ صنف ہمارے ادب میں مفقود ہوتی جارہی ہے،اسے مختلف النوع معنی پہنا دیے گئے ہیں۔۳۳

آکاش ساگر

یہ آغا گل کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس میں ذیل کے سولہ (۱۶) افسانے ہیں۔

۱۔ اندھا دن ۲۔ جادوگر ۳۔ پرتھوی،غوری

۴۔ بازگشت ۵۔ گنوک ۶۔ کھلی والا

۷۔ آکاش ساگر ۸۔ پوغٹ ۹۔ خان مستانہ

۱۰۔ پووبندغ ۱۱۔ مٹی بکتی ہے ۱۲۔ ایڈکولیم

۱۳۔ سرکک ۱۴۔ کسبی ۱۵۔ استادمہر

۱۶۔ ہابیل قابیل

ان تمام افسانوں کا لوکیل بھی بلوچستان ہے۔ ان میں بلوچستان میں واقع بعض مزاروں سے منسوب کہانیاں بھی ملتی ہیں اور بلوچستان کے سماج وثقافت کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔ کئی افسانوں کے اکثر کردار اور ان کے نام مقامی ہیں، جبکہ زیادہ تر افسانے صیغہ واحد متکلم میں بیان ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں تو شبہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے ذاتی حالات کو قصے کا روپ دیا ہے۔ مثلاً افسانہ ''بازگشت'' میں منصف نے اپنے والد کے حقیقی نام سے دیگر کرداروں کا تعارف کرایا ہے۔ بعض افسانوں میں کچھ فنی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یعنی کہانی میں بلاضرورت تاریخی حوالے پیش کیے جاتے ہیں اور غیر متعلقہ تاریخی معلومات کی بھرمار ہوتی ہے۔ یہ چیزیں کئی افسانوں میں دہرائی ہوئی ملتی ہیں۔ مصنف کا اسلوب اگر چہ انفرادیت رکھتا ہے اور اردو کے بلوچستانی لہجے کی عکاسی کرتا ہے۔ ان افسانوں میں انگریزی الفاظ ومحاورات کثیر تعداد میں ملتے ہے۔ کہیں کہیں تو پورا اقتباس میں انگریزی میں نظر آتا ہے۔ بعض افسانوں پر مثلاً ''آ کاش ساگر'' جو کتاب کا نام بھی ہے مضمون کا گمان ہوتا ہے۔ اس میں قریباً بیس کے قریب حوالے دیئے گئے ہیں جن کی وضاحت آخر میں ملتی ہے۔ کئی افسانوں میں انجیل مقدس اور قرآن شریف کے حوالے بھی وافر نظر آتے ہیں۔ افسانہ ''ہابیل قابیل'' بائبل کی آیات سے بوجھل ہے۔ بعض افسانوں میں بلوچستان پر مابعد نوآبادیاتی اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ ان افسانوں میں بھی ایسے کردار ملتے ہیں جو ہندوستان سے قیام پاکستان کے وقت ہجرت کے بعد بلوچستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے اور ان میں اپنی شناخت کا سوال یا بحران پیدا ہوا۔

راسکوہ

اس میں چودہ (۱۴) افسانے شامل ہیں جن کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔

۱۔ تارمہ	۲۔ دیوانے غالب	۳۔ راسکوہ	۴۔ مطالبہ
۵۔ ساتھی	۶۔ پتھر	۷۔ شودر	۸۔ طلسمی روٹی
۹۔ سنگِ زرد	۱۰۔ لومڑی شہزادی	۱۱۔ گردَنر	۱۲۔ حقوق
۱۳۔ فدوہ	۱۴۔ نیا دیس		

اس کتاب میں شامل اکثر افسانے بلوچستان کے سیاسی وسماجی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ ان کے بیشتر کردار اور ان کی زبان بلوچستان کے اردو لہجے کی غماز ہے۔ انقلاب افغانستان اور افغانستان سے آنے والے افغان

مہاجرین کے اثرات بھی کئی افسانوں میں نظر آتے ہیں۔مثلاً ''گردز'' میں جو اس مجموعے کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ ''تارمہ''، ''راسکوہ'' اور ''لومڑی شہزادی'' اس مجموعے کے دیگر اہم افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ یہاں بھی بعض افسانوں میں انگریزی الفاظ اور جملے ملتے ہیں۔آغا گل کے اسلوب کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تشبیہات بھی مقامی استعمال کرتے ہیں۔اس طرح کی ایک تشبیہ ملاحظہ ہو:

> میں نے دیکھا تاجو کی پلکیں پہ نمی آرہی ہے۔جیسے فرن تنگی میں ہلکی ہلکی نمی آجاتی ہے۔جو قطروں کی صورت میں برسنے لگتی ہے۔اور برستی ہی رہتی ہے ہزاروں برس سے۔چٹانیں توڑ ڈالی ہیں ان قطروں نے۔[۳۴]

مقامی کرداروں اور مقامات کے نام، تاریخی حوالے اور تشبیہات آغا گل کے اسلوب کو منفرد بناتے ہیں۔مگر یہ قاری سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ وہ بلوچستانی ثقافت، یہاں کے مختلف مقامات اور ان کی اہمیت سے واقف ہو۔تب ہی اسے ان افسانوں کی صحیح تفہیم ہو سکتی ہے۔خیال امروہوی آغا گل کے اس قدرے مختلف اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> آغا گل کے افسانوں کی زبان، لب ولہجہ سابقہ افسانوی اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ان افسانوں کی زبان افسانہ نگار کی مختلف تہذیبوں سے آشنائی، علم بشریات، پولیٹیکل سائنس، مقامی عمرانیات، ثقافت سے ہمہ جہت علم، معلومات اور وسعتِ مطالعہ کا بھی پتہ چلتا ہے، جو ان کے کرداروں، ماحول اور تمدنی اثرات سے قاری کو ان کی تخلیقات میں منہمک اور مستغرق کرتا چلا جاتا ہے۔۳۵

گوانکو

اس میں بارہ (۱۲) افسانے شامل ہیں جن کے نام یوں ہیں:

۱۔ فدوا	۲۔ ڈریکولا	۳۔ رموزِ زبان
۴۔ انقلاب	۵۔ کوئٹہ میں ہاتھی	۶۔ ڈاک پہ ڈاکہ
۷۔ غیرتی	۸۔ ڈاک اور حجامت	۹۔ مجاہد اعظم
۱۰۔ محلّہ بلیماراں	۱۱۔ بوانٹو	۱۲۔ گوانکو

ان میں سے پہلا افسانہ ''فدوا'' ان کی کتاب راسکوہ میں بھی شامل ہے۔ دیگر افسانوں میں ''ڈریکولا''، ''انقلاب''، ''ڈاک پہ ڈاک''، ''ڈاک اور حجامت''، ''بوانٹو'' اور ''گوانکو''، ڈاک خانے کے نظام، اس میں غیر قانونی بھرتیوں، ترقیوں اور قصبوں میں واقع ڈاک خانوں کے ملازمین کی تو ہم پرستی اور ناقص کارکردگی کو موضوع بناتے ہیں۔ ان افسانوں کا مصنف ایک طویل عرصہ پاکستان پوسٹ میں ملازمت کرتا رہا ہے۔ لہٰذا ان کہانیوں پر حقیقی واقعات کا گمان ہوتا ہے۔ بعض افسانے، افسانے کم اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین زیادہ محسوس ہوتے ہیں، مثلاً ''رموزِ زباں'' اور ''کوئٹہ میں ہاتھی'' وغیرہ۔ البتہ ''غیرتی'' اس مجموعے کا اہم افسانہ ہے، جو ہم جنسی پرستی کو موضوع بناتا ہے۔ اس کا نوجوان ہیرو لو میرج کے فوراً بعد شک کی بناء پر اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔ جیل میں ایسے قیدیوں کو '' غیرتی'' کہا جاتا ہے۔ جیل میں قید دیگر غیرتی اس پر جنسی حملہ کر کے اسے زخمی کر دیتے ہیں۔ آخر کار وہ دیگر قیدیوں سے خود کو بچانے کے لیے ایک سیاستدان اور سردار قیدی کے ساتھ جنسی تعلقات بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایسے نام نہاد ''غیرتی'' کا عبرت ناک انجام سامنے آتا ہے۔ یہ افسانہ غیرت کے مسئلے پر اپنی عورت کا قتل کرنے والے قاتلوں پر ایک خوبصورت طنز ہے۔

پرتھوی غوری

اس مجموعے میں درج ذیل گیارہ (۱۱) افسانے شامل ہیں۔

۱۔ زباں اور ۲۔ چنگش تول ۳۔ قراقلی

۴۔ ٹیڈی بے عر ۵۔ دودھ پتی ۶۔ پیاز

۷۔ پرتھوی غوری ۸۔ پرندہ ۹۔ پاولی

۱۰۔ عیدی ۱۱۔ چاخو

جس افسانے کے عنوان پر اس کتاب کا عنوان ہے یعنی ''پرتھوی غوری'' وہ آغا گل کی کتاب آکاش ساگر میں بھی شامل ہے۔ اس مجموعے کا اہم افسانہ ''عیدی'' ہے۔ یہ ایک کرداری افسانہ ہے۔ اس میں ڈاکخانہ کے ملازمین کا اپنے ہی طبقے کے ایک غریب کردار قاسم کے ساتھ حسن سلوک واضح ہوتا ہے۔ قاسم اپنے بیٹے کی طرف سے منی آرڈر نہ آنے پر خدا کے نام خط لکھ کر رقم کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے انتظار کو دیکھتے ہوئے ڈاکخانہ کے ملازمین

مل کر اسے اپنے جیب سے مطلوبہ رقم بھیج دیتے ہیں۔ پرتھوی غوری میں شامل دیگر افسانے بلوچستان کے ماحول، یہاں پایا جانے والا لسانی تعصب اور سیاسی محرومیوں کو موضوع بناتے ہیں۔ بعض افسانوں میں غیر ملکی کردار بھی ملتے ہیں۔ افسانہ ''چاخو'' تقسیم ہند سے پہلے کے بلوچستان اور یہاں انگریز فوج کے پس منظر پر لکھا گیا ہے، مگر اس کے مرکزی کردار ہندوستانی ہیں۔ ''چنگش تول'' کے عنوان سے موجود افسانے کو مزاحیہ مضمون کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک کالج میں ضلعی افسر کے مطالبے پر کھیلے جانے والے ڈرامے کی روداد پر مبنی ہے۔ ''زباں اور''، ''ٹیڈی بے عز''، ''دودھ پتی'' اور ''پیاز'' اس مجوعے کے اچھے افسانے کہے جاسکتے ہیں۔ ان افسانوں میں بعض جگہ زبان کا تخلیقی برتاوا خاصا دلچسپ ہے۔

پرندہ

اس مجموعے میں بارہ (۱۲) افسانے شامل ہیں۔ ان کے عنوانات کی تفصیل یوں ہے۔

۱۔ بدروچ	۲۔ انقلابی شاعر	۳۔ بولتے سناٹے
۴۔ چاخو	۵۔ پیاز	۶۔ چیدغ
۷۔ پرندہ	۸۔ پاولی	۹۔ قبرستان کی موت
۱۰۔ گونگا پہاڑ	۱۱۔ مہرگڑھ	۱۲۔ اجنبی

ان میں سے ''چاخو''، ''پیاز''، ''پرندہ'' اور ''پاولی'' ایسے افسانے ہیں جو آغا گل کے پہلے مجموعوں میں شامل ہیں جبکہ باقی آٹھ نئے افسانے ہیں۔

اس کتاب کے تمام تر افسانوں کے موضوعات سیاسی ہیں جو بلوچستان میں جاری شورش یعنی مسلح بغاوت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی افراتفری اور سماجی انتشار کو ظاہر کرتے ہیں۔ پہلا افسانہ ''بدروچ'' قیام پاکستان سے قبل یہاں مقامی طور پر ابھرنے والی سیاسی تحریک اور سیاسی شعور عام کرنے والے ان کرداروں کی کہانی ہے جو اس تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی کوئٹہ کے ۱۹۳۵ء کے ہولناک زلزلے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دیگر کہانیوں میں بلوچستان کے نوجوانوں سے ہونے والی زیادتیاں، حکمران طبقے کی کارستانیاں اور یہاں آباد ہونے والے آباد کاروں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ ''قبرستان کی موت'' معاشرے میں بڑھتی ہوئی مذہبی عدم رواداری،

تعصب اور نفرت کو موضوع بناتا ہے۔ ان تمام افسانوں کا پس منظر اور لوکیل بلوچستان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موضوع ہو یا کردار نگاری اور یا پھر اسلوب کی بات ہو، بلوچستان ہی آغا گل کی افسانہ نگاری کا واحد پس منظر ہے۔ انور سدید ان کی اس خاصیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

اردو افسانے میں ''بلوچستان نگاری'' کا فریضہ تخلیقی سطح پر آغا گل نے ادا کیا ہے۔ اور ان کے افسانوں سے اس خطے کی وہ معاشرتی زندگی رونما ہوتی ہے جس کے مورخ ہنری پوٹینگر، ڈینس برے، ہنری ہالینڈ اور میر گل خان نصیر تھے۔۔۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بلوچستان کی روح کو سمونے اور اس خطے کے انسانوں کی خارجی اور داخلی زندگی کو کرداروں کے وسیلے سے پیش کرنے کی سعی کی۔ ۳۶

پہاڑ اور محبت

یہ کتاب دراصل آغا گل کے افسانوی مجموعے راسکوہ کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس میں تمام افسانے وہی ہیں جو راسکوہ میں شامل ہیں۔ صرف یہ کیا گیا ہے کہ افسانے ''راسکوہ'' کا نام بدل کر ''پہاڑ اور محبت'' کر دیا گیا اور اس کتاب کو بھی یہی عنوان دے دیا گیا ہے۔

فردوس انور قاضی (پ ۱۹۵۱ء)

فردوس انور قاضی جامعہ بلوچستان کوئٹہ میں اردو کی پروفیسر رہی ہیں۔ وہ تنقید کے ساتھ ساتھ افسانہ اور ناول جیسی اصناف لکھتی رہی ہیں۔ ان کا ایک ناول شائع ہو چکا ہے، جس کا تذکرہ ناول کے باب میں شامل ہے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔

آخری ٹرین

فردوس انور قاضی کا واحد افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں موجود کہانیوں کو مصنفہ نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ افسانے کی ذیل میں ۱۷ افسانے جبکہ 'خیالیے' کے تحت ۹ اور 'مصرعوں میں افسانے' کے عنوان سے تین کہانیاں شامل ہیں۔ فردوس انور قاضی کے مطابق 'خیالیے' ایک نئی صنف ہے۔ جو ان کے بقول ''ذہن کے اس حصے کی عکاسی کرتا ہے جو ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں مصروف رہتا ہے اور اس میں بے ربط خیالات ہوتے ہیں۔'' ۳۷ لیکن دیکھا جائے تو یہ تحریریں بھی افسانے کے زمرے میں آتی ہیں۔ جو افسانہ نگار نے 'خیالیے' کے تحت پیش کی ہیں۔ ان میں

اوران کی باقی تحریروں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔انوار احمد ان کے خیالیے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔''فردوس انور نے جنہیں 'خیالیے' کہا ہے وہ بھی ان کے افسانے ہی ہیں۔ان میں اور ان کے دیگر افسانوں میں موضوعات فضا اور اسلوب کا کوئی بنیادی فرق دکھائی نہیں دیتا۔''[۳۸]

کتاب میں شامل پہلا افسانہ ''تاویج'' ہے۔اس میں معاشرے میں رائج ضعیف الاعتقاد خیالات پر طنز کیا گیا ہے۔میاں بیوی از دواجی زندگی میں باہم ایک دوسرے کا خیال نہیں رکھتے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے اور چپقلش گھر کا سکون برباد کر دیتی ہے۔اس سے بچوں کی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے۔گھروں میں ہونے والے ان جھگڑوں کو دوسروں کی کارستانی اور عملیاتِ بد کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اور اس کا ازالہ تعویذ گنڈے سے کیا جاتا ہے۔اس افسانے میں ملا کا کردار اس حوالے سے مثبت ہے کہ وہ گھر کو صاف ستھرا رکھنے اور غصہ کے وقت تعویز منہ میں پکڑنے کو کہتا ہے۔تاکہ اس دوران باہم بات چیت نہ ہو جو بڑھ کر جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔یوں میاں بیوی کا تنازعہ اس خاص ہدایت سے ختم ہو جاتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ خاتون خانہ اس تبدیلی کا باعث مولوی کے تعویز کو سمجھتی ہے۔افسانہ ''آخری رات'' ایک لڑکی عارفہ کا اپنے بہنوئی کے ساتھ جنسی تعلقات کے موضوع پر ہے۔شوہر اور بہن کے تعلقات کا پتہ چلنے پر اس کی بڑی بہن شمسہ باجی کا گھر چھوڑنا غیر منطقی جبکہ عارفہ کی موت غیر فطری نظر آتی ہے۔بہر حال افسانہ ایک ایسے گھریلو اور سماجی پہلو کی عکاسی ضرور کرتا ہے جس سے آباد گھر اجڑ ہو جاتے ہیں۔افسانہ ''محبت کا عظیم تاج محل'' صیغہ واحد متکلم میں ایک سادہ بیانیہ پر مشتمل افسانہ ہے۔اس میں فوزیہ جس طرح شادی سے پہلے اپنے معاشقے کا حال راوی خاتون کو سناتی ہے۔اور اس کا شوہر جاوید اپنی بیوی فوزیہ کے بارے سب کچھ جانتے ہوئے بھی جس طرح اس سے محبت کرتا ہے۔وہ عجیب لگتا ہے۔بالخصوص جب کہانی میں فوزیہ قصوروار اور بدکردار بھی نظر آتی ہے۔افسانہ ''جونک'' نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایسے بچے کی کہانی ہے جس کے باپ کی موت کے بعد اس کی ماں دوسری شادی کر لیتی ہے۔اس کا سوتیلا باپ اسے ہر وقت مارتا رہتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ لڑکا ہر وقت اپنی ماں سے چمٹا رہتا ہے۔اس لیے اس کا سوتیلا باپ اسے 'جونک' کہتا ہے۔یہ ایک غیر موثر کہانی ہے۔افسانہ ''آخری شکار'' مویشی چوری کے حوالے سے ایک عام سی دیہی پس منظر کی کہانی ہے۔

افسانے ''رنگین دنیا'' میں تعلیمی اداروں میں طلبہ سیاست، اس کے غلط اثرات اور منفی نتائج کو موضوع بنایا گیا ہے۔طلبہ کس طرح سیاسی جماعتوں کے آلہ کار بن کر اساتذہ کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں۔نقل سے امتحان

پاس کر کے پوزیشنز لیتے ہیں اور پھرانہیں نوکریاں بھی مل جاتی ہیں۔اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

افسانہ ''تعبیر'' بلوچستان کے پس منظر میں ایک آبادکار [نان لوکل] نوجوان کی کہانی ہے۔اُسے اچھے نمبر حاصل کرنے کے باوجود میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں ملتا مگر سیکنڈ اور تھرڈ ڈویژنرز کو اس لیے داخلہ مل جاتا ہے کہ وہ ''لوکل'' [علاقائی] ہوتے ہیں یعنی کوٹہ سسٹم میرٹ کی حق تلفی کرتا ہے۔چنانچہ یہ نوجوان مایوس ہو کر اپنا گھر اور شہر چھوڑ کر کسی غیر ملک چلا جاتا ہے۔بلوچستان کے سماجی اور سیاسی تناظر میں نان لوکل کمیونٹی کے حوالے سے یہ افسانہ ایک خاص معنویت کا حامل ہے۔

اسلوب

> فردوس قاضی سادہ اور رواں اردو لکھنے پر قادر ہیں۔اس کی تحریر میں اردو روزمرہ اور محاورے کا استعمال ملتا ہے مگر یونیورسٹی میں اردو کی استاد ہونے اور اردو افسانہ نگاری کے رجحانات ۱۹۹۰ء جیسی تنقیدی کتاب لکھنے کے باوجود ان کے موضوعات میں تنوع ہے نہ ان کا اسلوب ہی جاندار اور پختہ ہے۔ان کے افسانوں میں گہرائی اور گیرائی کا فقدان ہے اور ان کے تمام افسانے اکہری سطح رکھتے ہیں۔ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر میں افسانوی اور تخلیقی نثر کا جوہر نظر آئے۔مثلاً جب وہ ایک جگہ لکھتی ہیں۔''نیم تاریکی میں دور تک بچھی ہوئی قبریں یوں لگ رہی تھیں جیسے زمین کی پیٹھ پر سینکڑوں کب نکل آئے ہوں۔''[۳۹]

اس طرح کی مثالیں ان کی تحریر میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔بعض اوقات وہ کردار کے حوالے سے زبان کا برتاو مختلف طبقوں کے مخصوص لہجوں میں کرتی ہیں۔بعض اچھے جملوں کے باجود فردوس انور قاضی کے افسانے فنی طور پر کمزور ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے یہ تحریریں جلد بازی میں لکھی گئی ہوں۔یا لکھنے والا تخلیق کے لیے درکار کڑی تپسیا سے نہ گزرا ہو۔جہاں ان افسانوں کے موضوعات میں تنوع نظر نہیں آتا۔وہاں ان کے عنوانات میں بھی ایک طرح کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔مثلاً ''آخری رات''، ''آخری شکار''، ''آخری ٹرین''، ''ایک رات''، ''دودن''، ''روح کا سناٹا'' اور ''نئی روح'' وغیرہ وغیرہ۔کتاب میں شامل آخری تین افسانے دراصل نثری نظمیں ہیں جنھیں افسانے کہا گیا ہے۔ان کے عنوانات ''پروین شاکر''، ''وادیٔ شہرجاں'' اور ''وہ آنکھیں'' ہیں۔

طاہر محمد خان (۱۹۳۶ء۔۲۰۱۰ء) کے افسانے

طاہر محمد خاں پیشے کے لحاظ سے وکیل اور سیاسی طور پر بھی کافی فعال تھے۔ان کا صرایک افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے،جس کا تجزی آگے پیش کیا جاتا ہے۔

ذود پشیماں

یہ طاہر محمد خان کا افسانوی مجموعہ ہے اس میں کل درج ذیل انیس (۱۹) افسانے ہیں۔

۱۔زود پشیماں ۲۔اور دیوار گر گئی ۳۔پانی کا جبر ۴۔اک ذرا سی خوشی کے لیے ۵۔سالمی

۶۔ایک سپیشل چائلڈ ۷۔خالی کلائی ۸۔مرد کے سائے بغیر ۹۔نیلی ۱۰۔گھاؤ ۱۱۔جرگہ

۱۲۔ایسا تو ہونا تھا ۱۳۔دردنا تمام ۱۴۔ایک خط ایک افسانچہ ۱۵۔تنہائی کا روگ ۱۶۔رنگ حنا

۱۷۔ہمزاد ۱۸۔کڑوی گولیاں ۱۹۔مانگے کے چند لمحے

طاہر محمد خان کے افسانوں میں جاگیرادانہ معاشرت،قبائلی رسم ورواج اور جنس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان کے اکثر افسانے اور ان میں پیش کردہ کردار بلوچستانی سماج اور ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔مثلاً اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''زود پشیماں'' بلوچستان کے ایک قبیح قبائلی رواج کے بارے میں ہے۔اسے عرف عام میں تور [یعنی کالا] یا سیاہ کہا جاتا ہے یعنی زنا کار۔جس مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگایا جاتا ہے قبائلی رواج کے مطابق اس کا قتل واجب ہو جاتا ہے۔حکومت نے اگر چہ ایسی واردات کرنے والوں کو قاتل قرار دے کر سزا دینے کا قانون بنایا ہے،مگر پھر بھی اس رواج پر کسی نہ کسی صورت میں عملدرآمد ہوتا ہے۔ یہ ایک سیدھا سادہ بیانیہ افسانہ ہے جس میں ایک وکیل کسی 'ٹکری' [ملک، چوہدری] کا قصہ سناتا ہے۔ بلوچستان کے قبائلی نظام میں سب سے چھوٹی اکائی کا سربراہ یا سردار 'ٹکری' کہلاتا ہے۔ٹکری نے اپنی چودہ پندرہ سالہ بیٹی گل پری اور ایک لڑکے صلائی کو سیاہ قرار دے کر قتل کیا ہوتا ہے۔قانون کے مطابق اس کے دو بیٹوں اور ایک بھتیجے کو گرفتار کیا جاتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ جرگہ اس قتل کو سیاہ کاری کا نتیجہ قرار دے کیونکہ انہوں نے یہ اقدام اپنے خاندان کے وقار کے تحفظ کے لیے کیا تھا۔اگر چہ قانون بدل چکا ہے مگر جرگہ ابھی موجود ہے۔ چنانچہ جرگہ ٹکری کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے اس قتل کو جائز قرار دیتا ہے جس پر اس کا بیٹا اور بھتیجا بری ہو جاتے ہیں۔ فیصلے کے ایک دن بعد جب ٹکری وکیل کے پاس آتا ہے۔اور باتوں باتوں میں وکیل اس

سے پوچھتا ہے کہ کیا گل پری کی بے بس موت پر آپ کو کبھی دکھ ہوا یا نہیں ۔تو وہ بتاتا ہے:

جب میں نے گل پری کو ذبح کیا تو اس کے خون کی دھار میرے ہاتھ پر گری ۔جس نے میرے ہاتھ کو جلا دیا جس کی جلن آج بھی محسوس کرتا ہوں ۔گل پری ہر رات میرے خواب میں آتی ہے اور بے بسی میں اب بھی وہی آواز دیتی ہے 'ہائے ماں' یہ کہہ کر ٹکری دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔[۴۰]

اس افسانے میں بڑے موثر انداز میں بلوچستان میں رواج پذیر ایک ظالمانہ رسم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک چودہ پندرہ سال کی لڑکی جس سے کم عمری اور ناسمجھی میں ایک غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔اسے ایک عرصے بعد اس کی انتہائی خوفناک سزا دی جاتی ہے۔افسانے سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ جو لوگ معاشرے میں اپنی جھوٹی شان و شوکت برقرار رکھنے اور غیرت کا مظاہر کے لیے اس طرح کے کام کرتے ہیں، انہیں کبھی سکون نہیں ملتا۔ان کے ہاتھ اپنے عزیز ترین رشتوں کے خون سے رنگے ہوتے ہیں۔وہ بظاہر جتنے بھی سخت دل یا بے حس نظر آئیں۔غم اندر ہی اندر انہیں کھائے جاتا ہے یا اس ٹکری کی طرح ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں۔گویا صرف مرنے والے ہی تکلیف دہ انجام کو نہیں پہنچتے بلکہ مارنے والے بھی باقی عمر اذیت میں جیتے ہیں۔افسانہ''پانی کا جبر'' بلوچستان کی غربت، افلاس اور صحرائی لوگوں کی مشکلات کی کہانی سناتا ہے۔ایک عورت خصوصاً ایک حاملہ عورت کن کٹھن حالات سے دوچار ہوتی ہے۔یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔افسانے میں بارش کے دن جب تمام راستے بند ہوتے ہیں اور بچے کی پیدائش کا وقت ہو جاتا ہے تو ایک خانہ بدوش مرد رضائی بچہ جننے کے عمل میں اپنی بیوی کی مدد اور معاونت کرتا ہے اور زچہ و بچہ خیریت سے رہتے ہیں۔پسماندہ اور ناخواندہ سمجھے جانے والے خانہ بدوش کس طرح بوقت ضرورت اپنی عورتوں کے معاون و مددگار بنتے ہیں اور ایک طبیب کا کردار ادا کرتے ہیں۔یہ افسانہ ایسے حیرت انگیز قصے کو پیش کرتا ہے، جس کا ترقی یافتہ شہروں میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔البتہ افسانے کی آخری دو ڈھائی سطریں اضافی نظر آتی ہیں۔افسانہ نگار نے اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ افسانہ اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب آخر میں رضائی یہ بات کہتا ہے کہ شکر ہے اب دونوں ٹھیک ہیں۔مجموعے میں شامل ایک افسانہ''سالمی'' اس بلوچ نوجوان کی کہانی ہے جو کراچی میں تعلیم حاصل کر کے افسر بن جاتا ہے۔اس کی شادی پر بلوچ رواج کے مطابق دلہن کی کمر کے گرد سفید چادر باندھی جاتی ہے تاکہ صبح کو خون آلود چادر اس کی شرافت اور کنوارپن کا ثبوت سامنے لائے۔لیکن شادی کی رات پتہ چلتا ہے کہ اس لڑکی

نے خیانت کی ہوتی ہے۔اس لیے جب صبح ہوتی ہے تو وہ چادر سامنے نہیں لائی جاتی جس پر سارے گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے۔اب دولہا کا انتظار کیا جاتا ہے کہ وہ حقیقت بتائے اور اپنی بیوی کو فوراً طلاق دے یا اسے قتل کرے اور اس شخص کو بھی جس نے خیانت کی تھی مگر یہ بلوچ قبائلی لڑکا جدید تعلیم کی بدولت بدل چکا ہوتا ہے وہ اپنی بیوی کا گناہ اپنے سر لے لیتا ہے اور بتاتا ہے کہ لڑکی کا کوئی قصور نہیں۔کسی نے اُسے 'بند' کر دیا ہے۔یہ بھی ایک روایت یا توہم ہے کہ اگر شب زفاف میں مرد کارکردگی نہ دکھا سکے تو کہا جاتا ہے کہ اس کے دشمنوں نے تعویز گنڈا کر کے اسے 'بند' کر دیا ہے۔افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اچھے لوگوں کی صحبت، تعلیم اور شعور انسان کو مہذب بنا دیتا ہے اور وہ وحشیانہ عمل ترک کر دیتا ہے۔یہ ایک طرح سے پہلے افسانے ''ذود پشیمان'' کی بدلی ہوئی صورت ہے۔جس میں قبائلی لوگ بھی تعلیم کے بعد اپنے غلط رسم و رواج ختم کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔فاروق احمد لکھتے ہیں:

پریم چند کے کردار ''بھوندو'' سے لے کر طاہر محمد خان کے افسانے ''سالمی'' تک ہماری معاشرتی ناہمواری اور روایت کی مضبوط گرفت میں تڑپتا ہوا انسان اور اس کا اندوہناک کرب نا قابل پیائش ہے۔۔۔طاہر محمد خان کے افسانے قدیم روایت میں جکڑے ہوئے انسان کی بپتا ہیں۔ایسی بپتا جسے اب تک شاید بہت کم ادیبوں نے محسوس کیا اور لکھا ہے۔۱۴۱

طاہر محمد خان کے کئی افسانے جنس اور رومان کو موضوع بناتے ہیں۔جنس کے پس منظر میں لوگوں کی معاشی مجبوری اور معاشرتی جبر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔مرد افسانہ نگار ہونے کے باوجود ان کے افسانے میں نسوانی کردار عورتوں کی بے چارگی کا احوال سناتے ہیں۔ایسے افسانوں میں ''مرد کے سائے کے بغیر''، ''نیلی کڑوی گولیاں''، ''مانگے کے چند لمحے'' اور ایسا تو ہونا تھا، وغیرہ شامل ہیں۔''رنگ حنا'' خواہش کی اسیر لڑکی کی کہانی ہے۔جبکہ ''تنہائی کا روگ'' بظاہر جبر کے خلاف فرد کی احتجاجی آواز ہے مگر یہ افسانہ فنی طور پر کمزور ہے۔اس مجموعے کا ایک اہم افسانہ ''جرگہ'' ہے جو 'بدل' میں دی جانے والی عورت کی کتھا بیان کرتا ہے۔قتل کی واردات میں مقتول کے ورثا کو قاتلوں کے خاندان میں سے کسی عورت کا دیت کے طور پر دینا بدل کہلاتا ہے۔وہ اپنے خاندان کے کسی بھی شخص سے اس عورت کو بیاہ دیتے ہیں مگر شادی کے بعد اس عورت کی زندگی قابل رحم ہوتی ہے۔سماج میں اس کی کوئی حیثیت اور حقوق نہیں ہوتے۔اب اس رسم میں اگر چہ کچھ کمی واقع ہوتی ہے۔مگر ماضی قریب تک قتل کی وارداتوں کے اکثر فیصلوں میں 'بدل' دیا جاتا تھا۔قبائلی نظام میں بدل میں دی گئی عورت جن نا قابل رشک حالات سے گزرتی ہے۔

افسانہ نگار نے کھل کر اسے موضوع بنایا ہے۔ طاہر محمد خان کے بیشتر افسانے بلوچستان کے سماج اور معاشرے کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں سے یہاں کے معاشرتی ماحول، اور ظالمانہ رسم و رواج سے گہری واقفیت حاصل ہوتی ہے، جبکہ عورتوں کے متعلق لکھتے ہوئے افسانہ نگار اپنے ہمدردانہ موقف کا اظہار ادبی پیرائے میں کرتا ہے۔ فردوس انور قاضی ان کے افسانوں پر اپنی رائے میں لکھتی ہیں:

طاہر محمد خان کے افسانوں میں بلوچ معاشرے کی روایات، بلوچستان کے موسم، فضائیں، غربت سے پیدا ہونے والے مسائل کا عکس بڑے فنکارانہ انداز میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ان کے یہاں رومانیت کا گہرا عکس ہے، جس میں جنسی حقیقت نگاری اور معاشی زندگی کے مسائل کا ادراک ہے۔۴۲

اسلوب

طاہر محمد خان کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ ان کی تحریر میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ ان کے موضوعات اور کردار اکثر اوقات حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ساری توجہ سادہ لفظوں میں کہانی بیان کرنے پر ہوتی ہے۔ اس لیے ان میں زبان کا چٹخارہ بہت کم ملتا ہے۔ وہ جس طرح کوئی قصہ بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کی تحریر میں اردو محاورات اور روزمرہ کا استعمال کم کم ملتا ہے البتہ بلوچی زبان کے الفاظ ان کی تحریر میں در آتے ہیں۔ مثلاً ٹکری سیاہ، اوتاخ (مردانہ مہمان خانہ) استا کار، بزگری (تجارت) پر آپ (بھرا بھرا) گدان (خیمہ)، ریگواڑ (قبیلے کا نام) بے وس (بے بس) مولد (غلام) اس طرح وہ بلوچی محاوروں اور روزمرہ کو اردو کا روپ بھی دیتے ہیں۔ مثلاً لڑکی کا باز و دینا (قتل میں ویت کے طور پر عورت دینا)۔ طاہر محمد خان اپنے قاری کو قبائلی سماج کی معاشرت اور اس کے مصائب سے ہی متعارف نہیں کراتے بلکہ اُردو زبان میں نئے الفاظ و محاورات کا اضافہ بھی کرتے ہیں۔ ایک افسانے میں جب مرد کئی بیٹوں کی پیدائش کے بعد بیوی سے بچی کی فرمائش کرتا ہے تب طاہر محمد خان قبائلی میاں بیوی کی بے تکلفی دکھاتے ہوئے بیوی کا جواب یوں لکھتے ہیں۔ ''وہ ہنس کر کہتی ''میرے کوئی مشین ہے کہ میں اس میں بیٹی بناؤں۔ تم مرد ہو۔ تخم تمہارا ہے۔ تم ایسا بیج ڈالو کہ لڑکی پیدا ہو۔'' ۴۳

جمیل زبیری (کے افسانے

زرد پتے

جمیل زبیری کا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ بیشتر کرداری افسانے ہیں۔ بعض افسانوں کے مرکزی کردار نسوانی ہیں۔ ابوالخیر کشفی نے اپنے طویل دیباچے میں جمیل زبیری کا موضوع 'انسان' کو قرار دیا ہے جبکہ سلیم احمد اپنے فلیپ میں لکھتے ہیں۔ ''جمیل زبیری کی تحریروں کی خوبی کو اگر میں ایک لفظ میں بیان کروں تو وہ ہے سلیقہ! بات کہنے کا سلیقہ، بات کو خوبصورت اور مؤثر بنانے کا سلیقہ۔''[۴۴]

حقیقت یہ ہے کہ ان فاضل بزرگوں کی آرا اس مجموعے کے حوالے سے ذاتی تعلقات کا نتیجہ نظر آتی ہے۔ یہ افسانے فنی حوالے سے کافی کمزور ہیں۔ ان میں دلچسپی کا عنصر سرے سے مفقود ہے۔ اکثر کہانیاں محبت کے عمومی واقعات پر مشتمل ہیں۔ البتہ بعض کہانیوں میں غربت اور مفلسی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جبکہ ایک آدھ کہانی معاشرتی مسائل کو اُجاگر کرتی نظر آتی ہے۔ زرد پتے میں شامل بعض کہانیوں کا لوکیل کراچی اور صرف ایک کہانی پکنک کا لوکیل کوئٹہ ہے۔ جمیل زبیری صاف اور شستہ عبارت لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں زبان و بیان کی کوئی غلطی نظر نہیں آتی مگر یہ افسانے تخلیقی بصیرت اور فکری گہرائی سے یکسر عاری ہیں۔ اس لیے قاری پر کوئی تاثر ڈالنے میں ناکام رہتے ہیں۔

نسیم جاوید (پ ۱۹۶۵ء)

نسیم جاوید ایک ہمہ جہت فنکار ہیں۔ وہ تھیٹر، ٹی وی اور ریڈیو سے بھی وابستگی رکھتے ہیں۔ دری زبان میں ان کی ایک ٹیلی فلم ''شکستِ شب'' بن چکی ہے، جس کا موضوع طالبانائزیشن ہے۔ اردو میں ان کا صرف ایک افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے۔

جمیل زبیری کے دوسرے افسانوی مجموعے لمحوں کی دہلیز میں چار افسانے ایسے ہیں جو بلوچستان پر لکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ انھوں نے یہاں اپنے زمانہ قیام کے دوران لکھے تھے۔ ان افسانوں کے عنوانات یوں ہیں۔

۱۔ شادی کور کی ڈھلوان پر   ۲۔ لاہوت لامکان

۳۔ لمحوں کی دہلیز ۴۔ ملگجے افق

ان افسانوں میں نہ صرف بلوچستان کے مختلف علاقوں کا جغرافیائی منظر نامہ ملتا ہے بلکہ ان میں غریب بلوچ عوام کی کسمپرسی اور مشکل حالات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔فطرت کے عناصر کی بے رحمی اور اپنے صاحب اقتدار لوگوں کی کرپشن کے باعث عام لوگ مختلف المیوں کا شکار ہوکر غیر طبعی موت مرجاتے ہیں۔افسانہ ''شادی کور کی ڈھلوان'' اس کی نمایاں مثال ہے۔اس میں محمود کی بیوی اس وقت حالت زچگی میں مرجاتی ہے جب بارشوں اور طغیانی کی وجہ سے شہر کے ہسپتال تک جانے کے راستے بند ہوتے ہیں۔کرپشن کی وجہ سے ان ندیوں پر پل نہیں بن پائے یا اگر بنتے ہیں تو وہ جلد بہہ جاتے ہیں اور عوام مشکلات کا شکار ہوتے ہیں۔اس حوالے سے یہ ایک اثر انگیز کہانی ہے۔اس میں بلوچستان کے بیابانوں کا منظر نامہ اپنی پوری وحشت کے ساتھ نظر آتا ہے۔جمیل زبیری کے ان افسانوں میں بعض تاریخی عناصر کا بیان بھی ملتا ہے۔مثلاً سکندر کا بلوچستان سے گزرنا اور ملیریا کا شکار ہونا اور یا پھر سسی پنوں کی کہانی اور پنوں کے قلعہ کا بندر ہنا وغیرہ۔جمیل زبیری کی کہانی بلوچستان کے باشندوں کی مشکل اور کھٹن حالات میں زندگی کی جدوجہد کرنے کی داستان سناتی ہیں۔کتاب میں شامل دیگر کہانیاں منافقت جبر وتشدد اور انسانی رویوں سے متعلق ہیں۔

محسن سلطان( ) کے افسانے

خود سے چھپا اُداس آدمی

محسن سلطان کے اس افسانوی مجموعے میں کل چھبیس افسانے ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ تنہائی کے بستر پر بچھی ہوئی سیج ۲۔ ھو ۳۔ ثواب

۴۔ ویران سٹیشن کا بند وزٹینگ روم ۵۔ رقیب ۶۔ کیا وہ صرف موچی تھا

۷۔ بند مکان میں پھولوں بھری خودکشی ۸۔ کیلنڈر سے گری ہوئی تاریخ

۹۔ وہ کہانی جو میں لکھنا بھول گیا تھا ۱۰۔ الیکشن

۱۱۔ کھڑکی سے جھانکتی انتظار بھری شام ۱۲۔ اب تیل عام ہے

۱۳۔ خود سے چھپا اداس آدمی ۱۴۔ ایک شام جوان کی آنکھوں میں آ کر ٹھہر گئی

۱۵۔ پیاسے ہونٹوں سے پھوٹتی شام

۱۶۔ ایک سے خواب
۱۷۔ پتھر کے نیچے دبی سرگوشیاں
۱۸۔ مرنے کے بعد خودکشی
۱۹۔ اتنی سے رہائی
۲۰۔ گمشدہ مکان کی تلاش
۲۱۔ گرے ریسور سے بہتی باتیں
۲۲۔ بکی ہوئی موت سے ایک مکالمہ
۲۳۔ سگریٹ کے دھویں میں چھپی لڑکی
۲۴۔ اب!
۲۵۔ میری شادی میں آئی ہوئی لڑکی
۲۶۔ نون۔ نامکمل

ان افسانوں میں سے بعض بہت مختصر یعنی صرف ایک اقتباس کی صورت میں ہیں۔ یہ ایسی کہانیاں جیسی آج کل مختلف اخبارات میں ادارتی صفحات پر روزانہ شائع ہوتی ہیں۔ مثلاً روز نامہ جـــــنگ میں شائع ہونے والی مشرف زیدی کی کہانیاں بہت معروف ہیں۔

محسن سلطان نے اپنے افسانوی مجموعے کا انتساب مظہرالاسلام کے نام کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے درج بالا عنوانات سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مظہرالاسلام سے بہت متاثر ہیں۔ نہ صرف افسانوں کے عنوانات بلکہ ان کی کہانیاں اور اسلوب پر بھی مظہرالاسلام کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ مظہرالاسلام کے برعکس ان کی کہانیوں کا موضوع البتہ محدود ہے۔ محبت اور اس کے نتیجے میں ملنے والا ہجر محسن سلطان کی بیشتر کہانیوں کا مرکزی خیال ہے۔ ان کی کہانیوں کا مرکزی کردار اکثر اس لڑکی سے مکالمہ کرتا نظر آتا ہے جس سے وہ شدید محبت کرتا ہے مگر وہ اُسے پا نہیں سکا۔ اس لیے ان کی تحریر میں ایک کسک بھی ملتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ کہانیاں ان کے شخصی تجربے اور خود پر گزری واردات کا افسانوی بیان ہے۔ محبت کے علاوہ ان کی کہانیوں میں موت اور خودکشی کے میلانات بہت زیادہ ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کہیں کہیں وجودی افکار بھی ملتے ہیں اور اس کے برعکس تصوف کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانے ''ھو'' اور ''وہ کہانی جو میں لکھنا بھول گیا تھا'' دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس میں نہ صرف اللہ ھو کی تکرار ملتی ہے بلکہ مصنف اپنے مرشد حضرت سلطان باہُوؒ کا ذکر بھی کرتے ہیں جو ان کے صوفی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''بابا میں تو شاہ حسین کی وہ روٹی ہوں جو دکھوں کے توے پر تنہائی کی آگ میں پکی۔ اب میرا وجود جل رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں میں راکھ نہ ہو جاؤں۔''۴۵

یہاں شاید انھوں نے غیر شعوری طور پر ایک ہی جملے میں صوفی اور وجودی افکار یکجا کر دیے ہیں۔ اسی

افسانے میں جسے وہ بابا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں وہ کردار آخر میں کبوتر بن کر دربار کے مینار پر جا پہنچتا ہے۔اس طرح ان کے افسانوں میں داستانوی رنگ بھی ملتا ہے۔یہ رجحان اردو افسانے کو انتظار حسین کی دین ہے۔ان باتوں سے محسن سلطان کے اردو افسانے اور اردو داستانوں کی روایت کے مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔اصغر ندیم سید لکھتے ہیں۔

''محسن سلطان نے کہانی کو ایک نئی جہت پر آ کر دریافت کیا ہے۔وہ کہانی کو اپنا آئینہ سمجھتا ہے اور اس آئینے میں اپنے ساتھ کائنات کی دوسری سچائیوں کو بھی دیکھنا چاہتا ہے۔''۴۶

اصغر ندیم سید نے بھی محسن سلطان کے افسانوں میں بیک وقت صوفی اور وجودی افکار ے باعث ایک جگہ تو ان کی کہانیوں کے خمیر کو صوفیانہ عشق کا سبب گردانتے ہیں جبکہ اسی اقتباس کے آخر میں وہ بتاتے ہیں کہ وجودی انسان کا بکھرنا ان افسانوں کا اصل سوال ہے۔بہرحال یہ حقیقت ہے کہ محسن سلطان کے افسانوں میں بلوچستان کا اردو افسانہ ایک قدم آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔اس سے ان افسانوں کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

صوفیانہ اثرات کے باعث محسن سلطان کے اسلوب میں ایک ٹھہراؤ اور سکون ملتا ہے۔وہ تخلیقی نثر لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ان کا انداز بیان خاصا دلچسپ ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔موت اور اس سے متعلق معاملات کا کثرت سے ذکر ان کے افسانوں کی مجموعی فضا کو اداس اور سوگوار بنا دیتا ہے۔

محسن سلطان سلجھی ہوئی اور شائستہ اُردو لکھتے ہیں۔ان کے ہاں مشکل الفاظ ہیں نہ وہ مقامی زبانوں کا کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ان کے ہاں خاموشی، اداسی، تنہائی اور موت کے زندہ وجود کا احساس ہوتا ہے۔ان عناصر نے ان کی نثر کو قابل قرأت بنا دیا ہے۔

فاروق سرور (۱۹۶۲ء) کی افسانہ نگاری

فاروق سرور دراصل پشتو کے افسانہ و ناول نگار ہیں جبکہ اردو میں بھی افسانے لکھتے ہیں۔وہ ایک عرصے سے روزنامہ جـــــنگ میں ''ادب سیر'' کے نام سے ادبی کالم بھی لکھتے ہیں۔اردو میں ان کے واحد افسانوی مجموعے کا تعارف و تجزیہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ندی کی پیاس

فاروق سرور کا افسانوی مجموعہ ہے اس میں کل درج ذیل دس (۱۰) افسانے ہیں:

۱۔ ندی کی پیاس ۲۔ لمبو چاچا ۳۔ دف
۴۔ بھیڑیا ۵۔ چارگل ۶۔ اڑان
۷۔ مجرم ۸۔ جالے ۹۔ بونا
۱۰۔ فاختائیں

فاروق سرور نہ صرف اردو زبان پر دسترس رکھتا ہے بلکہ وہ افسانے کے فن سے بھی آگاہ ہے۔اس لیے اس کی کہانیوں میں افسانوی بنت کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، وہ روزنامہ جنگ کوئٹہ میں ایک عرصے سے عالمی ادب کے مطالعات پیش کرتا رہا ہے، جس کے اثرات اس کی تحریروں میں بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے بعض افسانوں میں کافکائی رنگ نظر آتا ہے۔مثلاً اس کے افسانے ''لمبو چاچا'' میں افسانے کا کردار اپنی جون بدلتا ہے۔وہ کبھی چوہا بن جاتا ہے اور کبھی چوہے سے پھر آدمی بن جاتا ہے۔اس مرکزی کردار کو دوسرے لوگ بھی جون بدلتے دکھائی دیتے ہیں۔اس کے افسانے ''اڑان'' س میں بھی کچھ کردار کبھی نظر آتے ہیں اور کبھی غائب ہو جاتے ہیں۔یہ چیز عالمی ادب میں کافکا سے متعلق ہے۔فاروق سرور کا افسانہ 'بھیڑیا' انسانی خوف کو موضوع بناتا ہے یہ نفسیاتی رجحان کا افسانہ ہے۔اس کا بنیادی خیال یہ ہے کہ انسان مختلف توہمات کا شکار ہو کر حوصلہ ہار دیتا ہے۔اگر وہ پرعزم ہو کر سخت حالات کا جوانمردی سے مقابلہ کرے تو مشکل حالات پر قابو پا سکتا ہے۔اس موضوع پر یہ ایک خوبصورت کہانی ہے۔افسانہ ''فاختائیں'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو سمجھتا ہے کہ وہ مر چکا ہے۔وہ اپنے مرنے کے بعد کے حالات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے عمل پر تاسف کا اظہار کرتا ہے۔جب گھر والوں کے شور سے اس کی آنکھ کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو خواب تھا۔تب وہ اپنا رویہ بدلتا ہے۔اپنے آس پاس رہتے لوگوں کے ساتھ بھی اور فطرت کے مختلف مظاہر سے لطف اندوز ہونا شروع کرتا ہے۔اس طرح اس کہانی کے مثبت اثرات نظر آتے ہیں۔البتہ اس افسانے پر سرسید احمد خان کے مضمون ''ایک بوڑھے کا خواب'' کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔فاروق سرور کے بعض افسانوں میں مقامی اثرات زبان، کردار اور ماحول کی صورت میں ملتے ہیں۔ان کے بعض افسانوں میں علامتی انداز بھی نظر آتا ہے جبکہ ان کا افسانہ ''ندی کی پیاس'' جنسی رجحان کا افسانہ ہے۔اس میں عورت کی جنسی بے راہ روی کو اُجاگر کیا گیا ہے۔''ندی کی پیاس'' اگرچہ مختصر افسانوی مجموعہ ہے مگر یہ اپنے افسانوی اسالیب اور رجحانات کے باعث بلوچستان کے اردو افسانے کی روایت کا ایک اہم مجموعہ ہے۔

فاروق سرور کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ اس کی تحریر میں اردو روزمرہ اور محاورے بھی ملتے ہیں۔ وہ بعض جگہ پشتو کے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کرتا ہے۔ ایسے الفاظ میں واش [تندور کی ایک قسم] پزوان [ناک کا زیور] دادیٔ [پشتو میں اردو لفظ دادی کا تلفظ] پالیز [کھیت] کوچی [خانہ بدوش] اور ولور [شادی کے لیے دی جانے والے مخصوص رقم] وغیرہ ہیں۔ اس طرح فاروق سرور کے اکثر افسانوں میں کرداروں کے نام بھی مقامی ملتے ہیں۔ یہ مرد اور عورت ہر دو صورتوں میں نظر آتے ہیں مثلاً شاہ محمد، ذرتشت، گل، تور [.کتے کا نام] نورو وغیرہ۔ فاروق سرور کی نثر پختہ اور افسانوی تاثیر کی حامل ہے۔ یہ وہ نثر ہے جو جدید اردو افسانے کا خاصا ہے۔ اس میں بھاری بھر کم اور مشکل الفاظ بالکل ناپید ہیں۔ اس میں خاص طرح کی سنجیدگی اور پختگی نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی نثر بلوچستان کے اردو فکشن میں بہت کم ملتی ہے۔ فاروق احمد ان کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اچھے افسانے کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود بخود پڑھوالیتا ہے۔ فاروق سرور کے تمام افسانے اس خوبی کے حامل ہیں۔ وہ علامتی رنگ میں گفتگو کریں یا براہ راست مخاطب ہوں ان کا افسانہ پڑھنے والے کو پوری طرح متوجہ رکھتا ہے۔۔۔ انھوں نے اپنے افسانوں کی فضا بلوچستان کے منظرنامے سے ہی اخذ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں بڑی جاذبیت اور دلکشی ہے۔ [۴۷]

عرفان احمد بیگ

عربان احمد بیگ صحافی، شاعر، محقق اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی شاعری اور افسانوں کا ایک ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔

گتے کے پہلوان

یہ عرفان احمد بیگ کا واحد افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں کل چودہ (۱۴) افسانے شامل ہیں۔

۱۔ مشرق ۲۔ انعطافِ نظر ۳۔ گتے کے پہلوان ۴۔ گھنٹہ گھر ۵۔ بندر اور ملیریا ۶۔ چوتھا زاویہ ۷۔ گنگ ۸۔ ببول ۹۔ کوکلا چھپا کی ۱۰۔ کبڑے مسافر ۱۱۔ انصاف سے پہلے ۱۲۔ سیڑھی پر رکھا آنکھ ۱۳۔ ذرا سی بات ۱۴۔ آخری رسوائی

پہلا افسانہ ''مشرق'' ایک ایسی خوبصورت لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے جسم کو آئینے میں دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ جلد ہی اس کی شادی ہو جاتی ہے مگر اس کا شوہر اس کے جسم میں دلچسپی نہیں لیتا جس کی وہ تمنا رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بچے جوان ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر کا جسم روشنی میں پہلی بار اس وقت دیکھتی ہے جب اس پر فالج کا حملہ ہوتا ہے۔ کہانی کا موضوع یہ ہے کہ مشرق میں میاں بیوی بھی رسم و رواج کے ایسے پابند ہوتے ہیں کہ وہ ازدواجی تعلق سے خوشگوار انداز میں لطف اندوز نہیں ہوتے۔ افسانے ''انعطافِ نظر'' کی بنیاد زندگی، کائنات اور زمین کو فلسفیانہ انداز میں زیرِ بحث لانے پر رکھی گئی ہے۔ اس میں فلسفہ تو ہے مگر بہ طور افسانہ اس کی کہانی اور فنی بنت کمزور ہے۔ یہی صورت حال ''گتے کے پہلوان'' کی ہے، جس پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ یہ بھی فنی طور پر بہت کمزور افسانہ ہے۔ اس میں دو بچوں گڈو اور بے بی کو دھاگے میں گتے کے پہلوان پرو کر ان کو لڑاتے دکھایا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دنیا کے آپس میں لڑنے والے ملکوں کے حکمرانوں کو گتے کے پہلوان قرار دیا گیا ہو جن کی ڈوری دوسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ افسانے میں دلچسپی کے عنصر کا فقدان ظاہر ہوتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بہ طور افسانہ اس کی قرات آسان نہیں۔ عرفان احمد کے اکثر افسانے اسی طرح کے سطحی افسانے ہیں۔ ان میں تخلیقی نثر کا فقدان ہے۔ البتہ 'سیڑھی پر رکھی آنکھ' قدرے بہتر افسانہ ہے اس میں ایک پاگل عورت سکول کے بچوں کو پاگل کتے سے بچاتے ہوئے ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ پاگل بھی بچوں سے محبت کرتے ہیں، اور ان کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دے دیتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ اچھا افسانہ ہے۔ اسی طرح 'ذرا سی بات' میں انگریز افسروں کا وجود اس بات کی علامت ہے کہ یہ افسانہ تقسیم سے پہلے کے زمانے سے متعلق ہے جب یہاں انگریز حکمران تھے۔ اس میں ایک انگریز افسر کی بیوی کا قیمتی ہیرا گم جانے سے پیدا ہونے والی افراتفری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سے حکمران طبقے کے اقتدار اور ان کے ذاتی و معاشرتی رویے واضح ہوتے ہیں۔ انگریز افسر کی بیوی کا نیکلس اس کے لباس میں ہوتا ہے مگر اس کی تلاش میں سارے شہر کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔ آخر جب یہ ہیرے کا نیکلس ملتا ہے تو سب سکون کا سانس لیتے ہیں۔ یہ افسانہ بھی قدرے اچھی کہانی بیان کرتا ہے۔ اس کی مابعد نو آبادیاتی قرات بلوچستانی ادب کی تنقید میں اہم ثابت ہو سکتی ہے۔

اسلوب

عرفان احمد بیگ بنیادی طور پر صحافی اور اخبار نویس ہیں۔ ان کے افسانوں میں صحافتی رنگ نمایاں نظر آتا ہے

۔ان کا اسلوب انفرادی پہچان نہیں رکھتا بلکہ اکثر تحریروں میں تخلیقی زبان تک کا اظہار نہیں ہوتا۔ زبان اور واقعات کے بیان میں وہ کئی جگہ فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ انھیں بیانیہ پر وہ قدرت حاصل نہیں ہے جو کسی افسانہ نگار کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسلوب اور مواد کے حوالے سے ان کے افسانے بہت کمزور ہیں مگر اس کے باوجود فردوس انور قاضی ان کے بارے میں لکھتی ہیں:

> عرفان احمد بیگ کے افسانے، رجحان کے اعتبار سے رومانی، فسلفیانہ سوچ کے حامل ہیں جن میں حقیقت کی گہری تلخیاں سمٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ گتے کے پہلوان کا اسلوب عرفان احمد بیگ کی تحریروں میں ایک نئی جہت اور نئے انداز کا نقطہ آغاز ہے۔ [۴۸]

یہ تنقیدی رائے یا تو عرفان بیگ کے افسانے پڑھے بغیر دی گئی ہے اور یا پھر یہ ان کے فن کی بجائے تعلق داری کو ملحوظ رکھتے ہوئے دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرفان احمد بیگ کے اکثر افسانے کچی پکی کہانیوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی نثر میں تخلیقی رچاؤ ناپید ہے اس لیے ان کی تحریر ذوق سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ اس طرح ان کی تحریروں میں افسانے کی فنی بنت بہت کمزور ہے۔ یوں لگتا ہے انھوں نے فن کے لیے درکار تپسیا سے گزرے بغیر صحافیانہ انداز میں ان افسانوں کو لکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی بناء پر زبان و بیان کی خامیاں نظر آتی ہیں۔ البتہ گتے کے پہلوان میں شامل تین افسانے ''ببول''، ''ذرا سی بات'' اور ''آخری رسوائی'' ایسے ہیں جو افسانہ کی کم تر سطح پر پورا اترتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی افسانے قاری پر کوئی تاثر ڈالنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ فاروق احمد جیسا نقاد عرفان احمد بیگ کو ''ایک اہم افسانہ نگار'' قرار دیتے ہوئے، جہاں اس کے افسانے کی اہمیت بیان کرتے ہے، تو چیخوف، موپساں، منٹو اور بیدی کا حوالہ دیتا ہے؛ وہاں وہ عرفان بیگ کے فن کی کمزوری اور تحریر کی بے کیفی پر پردہ ڈالتے ہوئے، اسے ٹالسٹائی، دوستوفسکی، فلابیئر اور بالزاک ایسے بلند پایہ ناول نگاروں کے ہاں بعض جگہ موجود کمزور عناصر سے جوڑتا ہے۔ [۴۹] یہ نہ صرف ایک مناسب تنقیدی رویہ نہیں ہے بلکہ یہ عرفان بیگ ایسے عام افسانہ نگار اور لکھاری کے ساتھ زیادتی ہے کہ اس کا موازنہ عالمی طور پر تسلیم شدہ بہترین افسانہ نگاروں کے ساتھ کیا جائے یا ان کی مثال دی جائے۔

یعقوب شاہ غرشین

یعقوب شاہ غرشین کے دو افسانوی مجموعے آخری آنسو اور باز گیر کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔

غرشین کو بیانیہ کہانی کا ملکہ حاصل ہے۔ وہ اردو زبان پر عبور رکھتا ہے جس کا پتہ اس کی کہانیوں کی بنت سے چلتا ہے۔ ان مجموعوں کا الگ الگ تجزیاتی مطالعہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

آخری آنسو

اس میں کل چودہ (۱۴) افسانے شامل ہیں۔

افسانہ 'شبِ ندامت' میں معاشرتی بے حسی کو موضوع بناتے ہوئے یہ دکھایا گیا ہے کہ جدید انسان کو صنعتی عہد میں مختلف سہولیات تو حاصل ہیں مگر اس کی انسانیت مر چکی ہے۔ افسانہ ''آخری آنسو'' ایک سادہ بیانیہ اسلوب میں لکھی گئی کہانی ہے۔ اس میں بلوچستان میں آنے والی شدید خشک سالی اور قحط کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک ہنستا بستا گھرانہ اور گاؤں اجڑ کر رہ جاتا ہے۔ خشک سالی کے ساتھ پھوٹنے والی وبا سے ایک گھرانے کا اہم فرد یعنی مرد اور اس کے دو بچے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک ماں بیٹا بھوکے پیاسے رہ جاتے ہیں۔ ماں بچے کے ساتھ پیدل صحرا کا سفر کرتے ہوئے شہر کی طرف روانہ ہوتی ہے جو دو دن کے فاصلے پر ہوتا ہے۔ مگر راستے میں بچہ شدید بھوک کی وجہ سے بے دم ہو کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ آس پاس دور و نزدیک پانی کا کہیں نام و نشان نہیں ہوتا۔ ماں اپنا ''آخری آنسو'' اس وقت اپنے بچے کے حلق میں انڈیلتی ہے جب وہ دم توڑ چکا ہوتا ہے۔ اس افسانے میں تلخ حقیقت نگاری کا احساس ہوتا ہے جو قاری کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ ''بڑھاپا'' اس مجموعے کا اور شاید یعقوب غرشین کا بہترین افسانہ ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ یعقوب شاہ غرشین ایک مکمل کردار تخلیق کرنے میں کامیاب ہوا ہے، جو بلوچستان کی قبائلی خصوصیات سے متصف ہے۔ یہ ایک خاندان میں دادا جان کا کردار ہے، کہانی کی ابتداء میں نہ صرف اس کا مناسب تعارف کرایا جاتا ہے؛ بلکہ جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے اس کی دلچسپ عادات سامنے آتی ہیں۔ دادا جان نے کسی زمانے میں اپنے ایک دوست کو تین سو روپے قرض دیے تھے۔ وہ شخص ایک عرصے سے لاپتہ تھا۔ مگر پھر اچانک دادا جان کو پتہ چلتا ہے کہ وہ میر پور خاص میں موجود ہے۔ وہ اسی وقت سفر پہ روانہ ہو جاتے ہیں مگر وہاں ایک حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال پہنچتے ہیں۔ ان کی صحت پر لاکھ روپے کا خرچ اٹھ جاتا ہے مگر روبصحت ہونے کے بعد وہ پھر سے اپنا قرض وصول کرنے کے لیے میر پور جانا چاہتے ہیں۔ ان کے بیٹے ان کی ضد کو دیکھتے ہوئے ڈاک کے ذریعے انھیں تین سو روپے اپنی جیب سے اس مقروض کی طرف سے ادا کرنے کا بندوبست کرتے ہیں جن کی وصولی کے بعد ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آتی ہے اور وہ کہتے ہیں اس خبیث کو پتہ تھا کہ میں نے اپنے پیسے چھوڑنے نہیں۔ وہ

اپنے بیٹوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔''میری جگہ اگر تم لوگ ہوتے تو اپنی لاپرواہی سے یہ رقم بھول چکے ہوتے۔ نئی نسل میں یہی تو خرابی ہے''۔ [۵۰] درحقیقت یہ افسانہ ان سطور پر ختم ہو جاتا ہے۔آخری دو سطریں جو افسانہ نگار نے لکھی میں وہ اضافی معلوم ہوتی ہیں۔اس مجموعے میں دو کہانیاں ایسی ہیں جن کا محل وقوع جاپان اور ناروے کے شہر ٹوکیو اور اوسلو ہیں۔ان میں پیش کیے گئے نسوانی کردار بھی غیر ملکی خواتین کے ہیں۔صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے ان ملکوں کے سیاحت کے بعد یہ افسانے لکھے ہیں۔محمد حمید شاہد،غرشین کو ایک باشعور اور اہم افسانہ نگار سمجھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

وہ [یعقوب شاہ غرشین] فکشن کے حوالے سے معروف شہروں سے دور رہتے ہوئے بھی افسانے کے مزاج میں در آنے والی تبدیلیوں سے خوب آگاہ ہے۔وہ زندگی کو درپیش سوالات کو کہانی کے مقابل لا کھڑا کرنے کا حوصلہ اور ڈھنگ رکھتا ہے۔اس کے ہاں تخلیقی منہاج اور انفرادی تجربہ دولخت نہیں ہوتے،آمیخت ہو جاتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ اپنی تخلیقی زندگی کے عین آغاز ہی میں وہ انتہائی اہم کہانیاں لکھ کر قابل توجہ افسانہ نگار بن گیا ہے۔۵۱

باز گیر

اس مجموعے میں چودہ (۱۴) افسانے شامل ہیں جن کے عنوانات یوں ہیں:

۱۔پھوڑا ۲۔ٹوٹے بندھن ۳۔من کے ہارے ہار ہے من کے جیتے جیت

۴۔ماں ۵۔موت کے بطن میں پلتی زندگی ۶۔بوئے خونِ دل ریش

۷۔طلب ہم عنان ۸۔ملنگ باچا ۹۔مانوس راہیں

۱۰۔باپ،شوہر،بیٹا اور وہ ۱۱۔ملاپ

۱۲۔شکست داور ۱۳۔زرد نگاہیں ۱۴۔باز گیر

ان میں پہلا افسانہ''پھوڑا''ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جسے ماتھے پر عین آنکھوں کے بیچ پھوڑا نکلتا ہے اور اس کے چہرے کو بدنما بنا دیتا ہے۔اس پھوڑے کی وجہ سے جمیل نامی اس کردار کو منحوس تصور کیا جاتا ہے مگر جب وہ بڑا ہو کر خوب پیسے کما لیتا ہے اور شہر کا معزز اور امیر ترین شخص بن جاتا ہے تو ہر شخص اس کے پھوڑے کو خوش بختی کی علامت سمجھنے لگتا ہے۔آخر وہ تنگ آ کر کھجا کھجا کر اس پھوڑے کو نوچ کر لوگوں کی طرف اچھال دیتا ہے اور اس پھوڑے سے اپنی جان چھڑا لیتا ہے جو پہلے نحوست اور بعد میں خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔افسانہ''ٹوٹے

بندھن''، تقسیم ہند کے وقت بچھڑے دو بہنوں کی کہانی ہے جو ایک طویل عرصے کے بعد اتفاقاً ملتی ہیں مگر اب ان کی زندگی الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ دونوں بہنوں کی اولاد آپس میں محبت کے باوجود ایک نہیں ہو سکتیں کہ اب وہ الگ الگ خاندانوں کے لوگ ہوتے ہیں جن کا ملنا ممکن نہیں ہوتا۔ افسانہ ''من کے ہارے ہار ہے من کے جیتے جیت'' ایک گاؤں کے ضعیف الاعتقاد لوگوں کی کہانی ہے جو گاؤں کے راستے میں ایک آسیب کی موجودگی سے ڈرتے ہیں۔ جنھیں بالآخر دوسرے ملک سے آنے والا گاؤں کا باسی اس آسیب سے رہائی دلاتا ہے۔ یہ آسیب دراصل علاقے کے ایک سردار کا آدمی ہوتا ہے جو آسیب کا روپ دھار کر سادہ لوح لوگوں کو رات کو ڈراتا ہے تا کہ وہ یہ علاقہ خالی کر جائیں۔ ''ماں'' کے عنوان سے جو افسانہ اس مجموعے میں شامل ہے اسے مختصر انشائی مضمون کہنا مناسب ہوگا کہ یہ افسانے کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ ''موت کے بطن میں پلتی زندگی'' دیس اور پردیس کی دو عورتوں کی کہانی ہے جو ایک جیسی خطرناک بیماری کے دوران حاملہ ہوتی ہیں۔ دیسی خاتون بچے کی پیدائش سے پہلے بچے سمیت مر جاتی ہے جبکہ بدیسی خاتون بچے کی پیدائش کے بعد مرتی ہے۔ اس میں دو ملکوں میں رہنے والی خواتین کے سماجی اور معاشی حالات کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ''بوئے خونِ دل ریش'' کے عنوان سے جو افسانہ ہے وہ افسانہ کی بجائے کسی سفر نامے کا ایک جزو لگتا ہے۔ باقی افسانوں میں ''طلب ہم عنان''، ''ملنگ باچا''، ''شکست داور'' اور ''باز گیر'' بلوچستان کے لوکیل میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں کرداروں کے نام اور زبان کا ورتاوا مقامیت کی عکاسی کرتے ہیں؛ اس کے ساتھ ساتھ ان میں مقامی ماحول کی منظر کشی بھی ملتی ہے۔ افسانہ ''ملاپ'' میں گلاب اور تتلی کے درمیان مکالمہ اسے افسانہ کی بجائے ایک تمثیل ثابت کرتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو بـــاز گیـــر یعقوب شاہ غرشین کی افسانہ نگاری کا دوسرا پڑاؤ ہے، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس میں غرشین کا فن پہلے مجموعے آخـــری آنســو کے مقابلے میں ترقی کرتا ہوا نظر نہیں آتا؛ بلکہ اس میں شامل افسانے اپنی ٹریٹمنٹ، کہانی پن اور کردار نگاری کے حوالے سے کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ ہر لکھنے والے کا فن وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتا ہے اور اس میں زیادہ تخلیقی وفور اور فنی پختگی نظر آتی ہے، یہ صورتحال غرشین کے افسانوی مجموعوں میں نظر نہیں آتی ہے۔

اسلوب

یعقوب شاہ غرشین سادہ بیانیہ انداز میں کہانیاں لکھتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کے لیے بیشتر موضوعات اور کردار اپنے گرد و پیش کی زندگی سے اخذ کرتا ہے۔ اسے اردو زبان پر عبور حاصل ہے۔ اس لیے وہ اردو میں اپنی تخلیقی

ذات کے اظہار پر کامل قدرت رکھتا ہے۔اس کی زبان سادہ اور رواں ہے۔وہ اردو محاورے، روزمرہ، کہاوتیں اور ضرب المثال بھی استعمال میں لاتا ہے۔بلوچستانی اردو کے الفاظ کم کم اس کی نثر میں آتے ہیں۔اس کے بعض افسانوں کے عنوانات بھی اپنے لوکیل یعنی بلوچستان کی عکاسی کرتے ہیں۔مثلاً ''ملنگ باچا'' اور ''باز گیر'' وغیرہ۔اسی طرح غرشین کی کہانیوں کے بعض کردار بھی مقامی ہیں جیسا کہ فیضو، رحمت چاچا، ملک یاقوت، ملک کشمالو اور ملک بنگو وغیرہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی مقامی کردار ہی غرشین کے جاندار کرداروں میں سے ہیں۔زبان اور موضوع کی سطح پر مقامیت کا عنصر غرشین کے دوسرے افسانوی مجموعے باز گیر میں زیادہ نظر آتا ہے،مگر فکری اور فنی حوالے سے ان کے پہلے مجموعے آخری آنسو کو برتری حاصل ہے کہ باز گیر کے بیشتر افسانے اس حوالے سے کمزور دکھائی دیتے ہیں۔

عارف ضیاء(پ۱۹۵۳ء)

عارف ضیاء اردو اور براہوی زبان میں شاعری کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھتا ہے۔اردو میں اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے،جس کا تعارف وتجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

اندر کا آدمی

عارف ضیا کا واحد افسانوی مجموعہ ہے اس میں ذیل کے تیئس (۲۳) مختصر افسانے شامل ہیں۔

۱۔بارش کی دعا ۲۔اور لکیر مٹ گئی ۳۔ڈور کا آخری سرا ۴۔اندر کا آدمی ۵۔خاکے میں رنگ

۶۔بلونت سنگھ ۷۔آکاش کے پر ۸۔ایف آئی آر ۹۔اپنا اپنا کھیل ۱۰۔سیپ ۱۱۔خانہ خالی نہیں رہتا

۱۲۔آنچل میں انگارے ۱۳۔تنہائی کا موسم ۱۴۔خالق کی مخلوق ۱۵۔چرواہے کے لوک گیتوں کی محبوبہ

۱۶۔انگور کی بیل ۱۷۔دھند کے پار ۱۸۔فرضی کہانی ۱۹۔تیسری بار پھانسی کی سزا ۲۰۔ایک دو تین چار

۲۱۔ حیا ۲۲۔اڑتی چڑیا ۲۳۔پناہ

عارف ضیاء کے افسانوں میں سے بیشتر میں شہری فضا ملتی ہے جبکہ کچھ افسانے دیہات کا پس منظر رکھتے ہیں جو یقینی طور پر بلوچستان کے ہی دیہاتی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔شہری فضا کے حامل افسانوں میں کوئٹہ کے

علاوہ کراچی اور لاہور کے رنگ بھی ملتے ہیں۔ مثلاً اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''بارش کی دعا'' اگر چہ بے گھری کا مسئلہ اٹھاتا ہے جس میں خشک سالی کے ہاتھوں تنگ آئے لوگ نمازِ استسقاء کے لیے ایک میدان میں جمع ہوتے ہیں مگر اس میدان میں عارضی طور پر قائم ایک جھگی میں رہائش پذیر ننھی زیبو بارش کے لیے ان لوگوں کی دعا کے جواب میں بارش نہ ہونے کی دعا مانگی ہے۔ اس افسانے کے دوسرے اقتباس کا پہلا جملہ ''فلک بوس عمارتوں کے اس میلوں پھیلے شہر کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زمین سکڑ کر رہ گئی ہو'' ۔[۵۲] واضح کرتا ہے کہ اس کا لوکیل کوئٹہ کی بجائے کراچی یا کوئی دوسرا بڑا شہر ہے مگر عارف ضیاء کی اردو کا لہجہ بعض جگہ بلوچستانی ہی رہتا ہے مثلاً 'میدانوں کی ناپیدی'۔ اسی طرح وہ اپنے پہلے ہی افسانے میں ترکیب سازی میں جدت ظاہر کرنے کی شعوری کاوش کرتے ہیں مثلاً 'پلاٹ بدر' ہونا، مگر ان کی اس طرح کی ترکیب اُردو اور انگریزی الفاظ کے ان مل جوڑ کی وجہ سے اچھی یا ادبی نہیں لگتی؛ البتہ زیبو کی بارش نہ ہونے کی دعا پوری ہونے پر عارف ضیاء کا یہ جملہ اس کہانی میں افسانویت کا مکمل اور خوبصورت ذائقہ رکھتا ہے۔ ''قبولیت کا لمحہ جیسے معصوم زیبو کی کھلی ہتھیلیوں میں سمٹ آیا تھا'' ۔[۵۳] حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے تخلیقی جملے بلوچستان کے اردو فکشن میں بہت کم پڑھنے کو ملتے ہیں۔

عارف ضیاء کے افسانوں کے موضوعات، غربت، افلاس، خاندانی نظام کے تاروپود بکھرنے کا المیہ، جنس اور قبائلی رنجشیں وغیرہ ہیں۔ اس کتاب میں شامل بعض کہانیاں اچھی ہیں مثلاً ''اپنا اپنا کھیل''، ''آنچل میں انگارے''، ''اڑتی چڑیا'' اور ''پناہ''، جبکہ ان کے کئی افسانوں میں عدم تکمیلیت کا احساس ملتا ہے، مثلاً ''خاک میں رنگ''، ''سیپ'' اور ''حیا''، ان کہانیوں کا آغاز بہت اچھا ہے، مگر آخر میں یوں لگتا ہے، جیسے اسے جلدی میں ختم کیا گیا ہو یا ادھورا چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس افسانے کا اختتام بھی افسانے جیسا نہیں ہے۔ عارف ضیاء کے کئی افسانوں میں فنی سقم پایا جاتا ہے۔ بعض جگہ تو یہ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ افسانہ محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ مضمون یا انشاپردازی کی مشق محسوس ہوتی ہے۔ کئی جگہ ان کے احساسات یا مشاہدات بہت کمزور محسوس ہوتے ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں: ''قادر بخش اپنی جسمانی کمزوری کی بناء پر صرف ساٹھ سال کی عمر میں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا'' [۵۴] یہاں ساٹھ سال کی عمر کو صرف ساٹھ سال کہنا محل نظر ہے حالانکہ پاکستان کے باشندوں کی اوسط عمر ساٹھ سال سے بھی کم ہے۔ اس طرح افسانے ''اندر کا آدمی'' میں افسانے کے مرکزی کردار کو ہوٹل کی دوسری منزل سے سڑک پر کھڑی ہوئی لڑکیوں کے موتی جیسے سفید دانت دکھائی دیتے ہیں۔[۵۵] اس قدر فاصلے سے کوئی ہنستا ہوا تو شاید دیکھا جا سکے لیکن اس کے دانت نظر آئیں اور ان کی خوبصورتی یا بدصورتی کا فیصلہ بھی کر دیا جائے یہ حقیقت کے بالکل برعکس لگتا ہے۔ صاف محسوس

ہوتا ہے کہ افسانہ لکھتے ہوئے عارف ضیاء نے ان باریکیوں پر توجہ نہیں دی۔ افسانہ ''خالق کی مخلوق'' احمد (مسلمان) اور الپنا (ہندو) کی محبت پر لکھا گیا ہے۔ یہاں مذہب ان دونوں کی محبت کے درمیان دیوار بنا تا نظر آ تا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر منٹو اور اردو کے دیگر اہم افسانہ نگاروں نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ لہٰذا موضوع کی حد تک اس میں کوئی جدت نہیں۔ اس مجموعے کے تین افسانے ''فرضی کہانی''، ''اڑتی چڑیا'' اور ''پناہ'' ایسے افسانے ہیں جن کے کرداروں، زبان کے ماحول اور موضوعات کے پس منظر میں بلوچستان کا عکس ملتا ہے، جبکہ افسانہ ''دھند کے پار'' میں جنگ افغانستان کے اثرات نظر آتے ہیں۔ عارف ضیاء کا مجموعہ اندر کا آدمی ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب بلوچستان سماجی اور سیاسی حوالے سے سخت بدحالی اور انتشار کا شکار ہے، مگر کتاب میں کوئی افسانہ ایسا نہیں ملتا ، جس میں بلوچستان کے سماجی و سیاسی المیے کا کوئی رنگ نظر آ تا ہو۔ فنی حوالے سے بھی عارف ضیا کے افسانے جدید افسانے کے فن پر پورے نہیں اترتے۔

اسلوب

عارف ضیاء کو بڑی حد تک زبان پر عبور حاصل ہے۔ اس کی تحریر میں اردو روزمرہ اور محاورے کا استعمال نظر آتا ہے۔ وہ کئی جگہ پر ہندی الفاظ کو اپنی تحریر کا حصہ بناتا ہے۔ افسانے ''خالق کی مخلوق'' میں نہ صرف گرمکھ داس، الپنا، روپا اور پنڈت کی شکل میں کئی ہندو کردار نظر آتے ہیں بلکہ کئی دیگر ہندی الفاظ مثلاً رام، بھگوان، ہولی، بھوجن، پتی، ماتا، پتا، شانتی، پنچایت، پنگھٹ، اگنی، دھرم، نشٹ اور چرنوں وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے میں بلوچستان کے مقامی اردو لہجے کی نمائندگی کرتے صرف دو الفاظ یا ایک ہی ترکیب ملتی ہے۔ اور وہ ہے 'کش وگیر' یعنی کھینچا تانی کرنا۔ عارف ضیاء کے افسانوں میں جو اردو محاورے عام ملتے ہیں ان میں کمربستہ ہونا، جوئے شیر لانا، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ہونا، ناک میں دم کرنا، کتے کی دم ہونا، غصہ ناک پر دھرا ہونا، ڈھاک کے تین پات، کنویں کا مینڈک ہونا، پھولے نہ سمانا اور بھیگی بلی بننا وغیرہ شامل ہیں۔ ایک جگہ صلوٰتیں سنانا کی بجائے صلوٰتیں بھیجنا لکھا گیا ہے۔ اگر عارف ضیاء افسانے کے نام پر لکھی گئی اپنی ہر تحریر کو اس کتاب میں شامل نہ کرتے ،صرف دس بارہ افسانوں کا انتخاب کرتے اور ان پر مزید کچھ وقت صرف کرتے ،تو ان سے چند اچھے افسانوں کی امید کی جا سکتی تھی۔

ہاشم ندیم کی افسانہ نگاری

ہاشم ندیم بلوچستان میں پاپولر اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے مگر اس کی وجہ شہرت ناول نگاری ہے۔ وہ اب تک

پانچ سے زائد پاپولر ناول لکھ چکا ہے جنھیں ملک بھر میں خاصی پذیرائی ملی ہے۔اس کی ناول نگاری کا تجزیاتی جائزہ اگلے باب میں پیش کیا جائے گا جو بلوچستان میں اردو ناول سے متعلق ہے۔ ہاشم ندیم نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ جن کا مطالعہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

صلیبِ عشق

اس میں نو(۹) افسانے اور پانچ (۵) نظمیں شامل ہیں۔اس کتاب میں شامل پہلا افسانہ ''پری زاد'' ایک بدصورت مرد کے المیے کو سامنے لاتا ہے۔اگر چہ وہ پیدائشی طور پر بدصورت ہوتا ہے مگر اس کی ماں اس کا نام پری زاد رکھتی ہے۔ وہ پہلے سکول اور پھر کالج یونیورسٹی میں لوگوں کے التفات سے محروم رہتا ہے۔ وہ شاعری کرتا ہے یونیورسٹی میں جس لڑکی سے محبت کرتا ہے ایک بار اس کی اپنے بارے میں گفتگو سن کر یونیورسٹی چھوڑ دیتا ہے۔اس کی شاعری روز بروز نکھرتی چلی جاتی ہے۔اسی اثنا میں گل رُخ نامی ایک نابینا لڑکی اس کی شاعری کی مداح بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ گل رخ کا علاج کرتا ہے مگر خود اس کی زندگی سے نکل جاتا ہے اور گمنامی کی زندگی جینا شروع کر دیتا ہے۔دراصل وہ سمجھتا ہے کہ بینائی ملتے ہی جب گل رُخ اس کا چہرہ دیکھے گی تو اس کی محبت نفرت میں بدل جائے گی جو اسے کسی صورت قبول نہ تھی۔ وہ ایک درویش منش فقیر بن جاتا ہے۔ پھر ایک روز اس کی گل رُخ سے اتفاقاً ملاقات ہوتی ہے۔گل رُخ پری زاد کو آواز سے پہچان لیتی ہے اور شکوہ کرتے ہوئے اسے اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے۔گویا 'پری زاد' کو ایک حقیقی چاہنے والا مل جاتا ہے۔ پری زاد کی تنہائی اجاگر کرتا یہ جملہ اپنے اندر ایک حقیقی قدر رکھتا ہے۔

''تنہائی صرف آس پاس کے لوگوں کے دور ہو جانے کا ہی تو نام نہیں۔۔۔کبھی کبھی شدید بھیڑ اور بہت بڑے ہجوم میں بھی ہم تنہا ہوتے ہیں۔''[۵٦]

ہاشم ندیم نے بعد میں اسی افسانے کو پھیلا کر پـــــری زاد ہی کے عنوان سے ناول لکھا ہے۔افسانہ ''لفظ گر' 'ایسے ادیب کا المیہ ہے جو ایک دوسرے ابھرتے ہوئے ادیب کی پذیرائی کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا۔نو جوان مصنف کو اس کی کہانی پر انعام ملنے میں بھی فیصلہ کن حیثیت اس ادیب کی رائے کی ہوتی ہے۔ وہ مصنف کے خلاف فیصلہ دیتا ہے مگر اس کے بعد خودکشی کر لیتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے میں سینئر ادیبوں کے اس المیے کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ نئے مگر اچھا لکھنے والوں سے حسد کرنے لگتے ہیں جو انھیں کسی طور زیب نہیں دیتا۔البتہ سینئر ادیب کی خودکشی حقیقت کے خلاف لگتی ہے۔''صلیب عشق'' تیسرا افسانہ ہے،جس کا مرکزی کردار ایک تعلیم یافتہ خاتون ہے۔اسے بین الاقوامی

دہشت گرد قرار دیتے ہوئے اٹھالیا جاتا ہے اور تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پاگل ہو جاتی ہے۔ اس کے بیٹے کو بھی اغوا کر کے ان کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔ اس لیے جس دن رہائی کے بعد اس کی ماں اپنی بے گناہی کے لیے پریس کانفرنس کرنے لگتی ہے تو اس کا بیٹا خود کو دھماکے میں اڑا کر اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ اس کہانی کی قرات سے یوں لگتا ہے، جیسے اس کہانی میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور اس پر گزرے واقعات کو موضوع بنایا گیا ہو۔ اس فرق کے ساتھ افسانے میں اسے دھماکے میں ہلاک ہونا دکھایا گیا ہے۔ افسانہ ''کیفے فراق'' کے مرکزی کردار ایرانی ہیں جو انقلاب ایران کے بعد پاکستان آتے ہیں۔ کیفے کا مالک اور ملازم کیفے میں آنے والی ایرانی ماں بیٹی کو دیکھتے ہیں تو دونوں اپنی اپنی جگہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مالک جب خاتون سے اس کی بیٹی سے شادی کی بات کرتا ہے تو وہ اسے اپنا رشتہ سمجھتے ہوئے اقرار کر لیتی ہے جس سے مالک کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ کیفے کا ملازم لڑکی سے شادی کرنے کی خاطر مالک کی دولت لوٹ کر اس کے گھر پہنچتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑکی تو پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کا خاوند ابھی ابھی ایران سے یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے۔ گویا غالب کے لفظوں میں آخر میں پتہ چلتا ہے ''ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ''۔ افسانے میں کوئٹہ کے کئی مقامی عناصر ملتے ہیں۔ افسانہ ''رانگ نمبر'' ایک لڑکے اور مقامی لڑکی کی کہانی ہے جو اتفاقیہ طور پر ملنے والی کال کے بعد ایک دوسرے کو پیغام بھیجنے لگتے ہیں مگر وہ عدم اعتماد کی بنا پر ایک دوسرے سے مل نہیں پاتے اور کہانی کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کا افسانہ ''رین کوٹ'' ہے۔ نعمان اور کاجل کالج لائف میں ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں مگر پھر کاجل کے گھر والے اس کی شادی کہیں اور کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد نعمان امریکہ چلا جاتا ہے۔ وہاں سے واپس آ کر وہ ایک فیکٹری لگاتا ہے۔ تب اس کی اچانک کاجل سے ایک بس سٹاپ پر ملاقات ہوتی ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ بارش میں بھیگ رہی تھی مگر وہ اس سے بات نہیں کر سکتا۔ وہ جاتے ہوئے وہی رین کوٹ چھوڑ جاتا ہے جو کبھی کاجل نے اسے خرید کر دیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے سالوں کے بعد بھی وہ رین کوٹ نہ صرف اس کے پاس بلکہ گاڑی میں اس وقت موجود ہوتا ہے جب یہ ریٹ کوٹ دینے والی بارش میں بھیگتے ہوئے اسے ایک طویل عرصے بعد ملتی ہے اس سے افسانے کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ افسانہ ''توبہ اور استغفار'' ایک جواری کو موضوع بناتا ہے جو اس رات بھی جوا کھیلتا رہتا ہے جب اس کی بیوی شدید بیماری کے بعد مر جاتی ہے۔ صبح جب گھر واپسی پر اسے بیوی کی موت کا پتہ چلتا ہے تو وہ جوے میں جیتے ہوئے سارے نوٹ پھینکنے لگتا ہے اور توبہ کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کے بعد کا افسانہ ''جلاد'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو غربت کے باعث دہشت گردوں کے ساتھ مل کر شہر میں ایک دھماکہ کرنا چاہتا ہے کہ اس طرح

اسے بہت سارے پیسے ملتے ہیں مگر اس کے ایمان دار باپ کو پتہ چل جاتا ہے۔ جب اگلی صبح وہ بم لگے موٹر سائیکل کے ساتھ لوگوں سے بھرے میدان کی طرف جانے لگتا ہے تو اس کا باپ اسے قتل کر دیتا ہے۔ ''جان نشین'' اس مجموعے کا آخری افسانہ ہے جو اسپین کے شہر بارسلونا میں ہونے والے بل فائٹنگ کے آخری مقابلے کی روداد سناتا ہے۔لڑا کا انتونیو نے کبھی شکست نہیں کھائی ہوتی اور اس کے مقابل جو بھینسا ہوتا ہے اسے کلر (Killer) کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لڑنے والے کو بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے یا پھر مار گراتا ہے۔ یہ دلچسپ کہانی جب ختم ہوتی ہے تو دونوں لڑاکے نیم جان ہو چکے ہوتے ہیں۔ دونوں ہی نے ایک دوسرے کو اس طرح شدید زخمی کیا ہوتا ہے کہ ان کے بچنے کی اُمید نہیں رہتی۔ گویا دونوں آخر تک فاتح رہتے ہیں۔ یہ کہانی دلچسپ ہے اور قاری کی توجہ آخر تک برقرار رہتی ہے۔ ہاشم ندیم کو اردو پر مکمل عبور حاصل ہے۔اس کی تحریر میں جہاں تہاں اردو روزمرہ اور محاورات کا استعمال نظر آتا ہے۔ضرب المثال بھی کم کم ملتی ہیں۔ان کا انداز بیان سادہ اور رواں ہے۔

عابد میر

عابد میر کی کہانیوں کے اب تک تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا جدائی کا پیش لفظ دوسرا جنگ ،محبت اور کہانی جبکہ تیسرا مجموعہ سرخ حاشیے کے عنوان سے ہیں۔ان تینوں کتابوں میں شامل کہانیوں کا الگ الگ مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

جدائی کا پیش لفظ

عابد میر کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ اگرچہ ۱۸ مختلف عنوانات پر مشتمل کہانیاں ہیں، مگر ان کا مرکزی موضوع ایک ہے اور وہ ہے محبت۔ ان تمام کہانیوں میں محبت کے ایک وقوعے کو پھیلا کر یہ ۱۸ کہانیاں تخلیق کی گئی ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ دراصل یہ ایک ہی قصہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ان کہانیوں میں عابد میر نے یونیورسٹی کے کیمپس میں ہونے والی محبت کو موضوع بنایا ہے۔ ہیرو کا دوست اس میں ولن اور رقیب کا کردار ادا کرتا ہے۔ جب وہ اس کی محبوبہ سے شادی کر لیتا ہے ان کہانیوں کا ہیرو بھی محبت میں ناکامی کے بعد اپنے بچپن کی سہیلی سے شادی کر لیتا ہے، مگر اس کے دل میں اپنی گم شدہ محبت کی تڑپ برقرار رہتی ہے۔محبت کے وقوع پر مشتمل ان کہانیوں کو دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ان میں کہیں جنگل کے جانوروں کا قصہ بھی ہے اور دیوتاؤں کا مرد کو عورت کا تحفہ دینے کی کتھا بھی۔ ایک کہانی میں گارشیا مارکیز کے ناول وفا کے دنوں میں محبت کا تذکرہ ہے اور ہیرو اس ناول کے انجام کی طرح رقیب

کو اپنی کھوئی ہوئی محبت پانے کے لیے انتظار کرنے کا عہد کرتا ہے۔ آخری کہانی میں مصطفیٰ زیدی کی نظم شطرنج بھی لکھی گئی ہے۔ عابد میر کو شستہ اور رواں نثر لکھنے کی قدرت حاصل ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ عبارت میں کہیں کہیں ایک آدھ لفظ ہندی کا بھی ملتا ہے۔

جنگ، محبت اور کہانی

عابد میر کا پہلا باقاعدہ افسانوی مجموعہ ہے جو سال ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں درج ذیل تیرہ (۱۳) کہانیاں شامل ہیں۔

۱۔ کہانی رنگ بدلتی ہے ۲۔ بانجھ ۳۔ سچائی سے پاگل پن تک ۴۔ دستک ۵۔ گھر کو آگ لگ گئی

۶۔ شرم نہیں آتی ۷۔ آگ اور پانی ۸۔ سرخی ۹۔ کہانی سے نکلے ہوئے کردار

۱۰۔ ایمان کی سلامتی کا سفر ۱۱۔ کہانہ لاپتہ ۱۲۔ سوتے رہنا بھائیو ۱۳۔ جنگ محبت اور کہانی

عابد اپنے دیباچے کے عنوان ''بارود کے ڈھیر پہ بیٹھی کہانی کا چہرہ'' سے ہی اپنی کہانیوں کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کہانیوں کا مرکز بلوچستان ہے، جو سیاسی انتشار، بدامنی اور مسلح بغاوت کا شکار ہے؛ جہاں آئے دن بم دھماکے، ریاستی اداروں پر حملے، نوجوانوں کو اغوا اور غائب کر دیے جانے کا کھیل کھیلا جا رہا ہے لیکن خود عابد اپنی کہانیوں کے بارے میں کوئی حتمی نتیجہ قائم نہیں کرتا۔ وہ خود اس بات پر شک کا اظہار کرتا ہے کہ آیا اس کی ان کہانیوں کو کہانیاں یا افسانہ کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں اس کے اپنے الفاظ میں:

> اسے رپورٹنگ کہیے، رپوتاژ جانیے، سوانح عمری کا نام دیجیے، آپ بیتی سمجھ کر پڑھیے یا کچھ نہ جان کر کوڑے دان کی نذر کر دیجیے۔ ہمارے عہد اور ہمارے اردگرد کی کہانی کا یہی چہرہ مہرہ ہے۔[۵۷]

بہرحال یہ کہانیاں ہی ہیں۔ جنگ، محبت اور کہانی میں شامل بیشتر کہانیاں بلوچستان کی حالیہ سیاسی تحریک اور مسلح بغاوت کا پس منظر لیے ہوئے ہیں۔ ان میں خود کہانی بھی ایک بدلے ہوئے کردار کے روپ میں نظر آتی ہے۔ مثلاً افسانہ 'بانجھ' ایک ایسے حساس شخص کا المیہ ہے جو اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات کی بنا پر شدید ذہنی بحران کا شکار ہو کر نہ صرف پاگل ہو جاتا ہے بلکہ مردانہ صلاحیت بھی کھو دیتا ہے۔

اگلے' افسانے سچائی سے پاگل پن تک' بھی ایسے ہی فرد کی کہانی ہے جو نائن الیون کے بعد افغانستان و عراق میں رونما ہونے والے انسانی المیوں سے متاثر ہو کر حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس طرح کئی افسانوں میں کہانی خود ایک کردار کے روپ میں مختلف افراد سے مکالمہ کرتی نظر آتی ہے اور ان میں سیاسی و سماجی منظر نامے کے کئی رنگ ملتے ہیں۔ کس طرح لوگ اپنے رویوں میں منافقت سے کام لیتے ہیں۔ ایسا شہر یا علاقہ جو بدامنی اور انتشار کا شکار ہوتا ہے اس میں مختلف طبقوں کے لوگ کیا سوچتے اور کیا محسوس کرتے ہیں کس طرح وہ دوسرے کے مسائل اور مصاحب سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ہمسائے میں لگی آگ جلد یا بدیر ان تک پہنچنے والی ہوتی ہے مگر وہ اس سے یکسر لاتعلق اور بے پرواہ نظر آتے ہیں۔ کہانی 'ایمان کی سلامتی کا سفر' دراصل مصنف کے ساتھ پیش آنے والے حقیقی واقعے کے بیان پر مشتمل ہے جب اسے سیکورٹی کے لوگ دو تین دن اپنے پاس رکھتے ہیں اور اس سے علیحدگی پسندوں سے رابطے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ اسے اپنے لیے کام کی ترغیب دیتے ہیں جس سے وہ انکار کر دیتا ہے اور آخر اُسے بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس وارننگ کے ساتھ کہ وہ علیحدگی پسندوں سے کوئی رابطہ نہ رکھے وہ ملک دشمن لوگ ہیں۔ مصنف چوں کہ ان کا آلہ کار بننے سے معذرت کر دیتا ہے اس لیے اس نے اس کہانی کو' ایمان کی سلامتی کا سفر' قرار دیا ہے۔ آخری کہانی 'جنگ محبت اور کہانی' میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک منتشر معاشرے کے لوگ کہانی اور کہانی کار کو رد کر دیتے ہیں۔ وہ لکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں نہ قصہ کہانی سننے والوں کو، بلکہ آزادی کے لیے لڑنے والے مسلح جنگجوؤں کو عوام زیادہ سراہتے ہیں۔

عابد میر جدید عہد کا کہانی کار ہے۔ وہ اپنے مجموعے کے بیشتر افسانوں میں بہ طور مصنف اپنا نقطۂ نظر ہی واضح نہیں کرتا بلکہ اپنے قارئین کو سیاسی شعور دینے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس کی تحریر میں کہیں کہیں جذباتیت بھی نظر آتی ہے۔ بعض افسانوں میں قصہ گو، پریم کہانیاں، قاضیِ شہر، دربار اور فقیہہ شہر کے الفاظ و تراکیب سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس کا اسلوب داستانوی ہے مگر ایسا ہے نہیں داستانوں میں استعمال ہونے والے الفاظ کے باوجود اس کا اسلوب داستانوی رنگ اختیار نہیں کرتا بلکہ یہ جدید سادہ اور رواں اسلوب دکھتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں عابد کی تحریر میں اسلوب اور کہانی کی سطح پر کئی جگہ نیم علامتی اجزا بھی پائے جاتے ہیں مثلاً ایک افسانے میں وہ لکھتا ہے:

> رات طاری ہو چکی تھی۔ کال کوٹھڑی کی تاریکی میں کہانی کار کو سسکیوں کی آواز سنائی دی۔
> اس نے پہلو بدل کر دیکھا۔ اس کے پہلو میں اس کی پریم کہانی سسک رہی تھی۔ کہانی کار

> نے پیار سے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور گلے سے لگا لیا۔ دونوں کی سسکیاں رات کی تاریکی میں ڈوب گئیں۔ [۵۸]

محولہ بالا اقتباس میں وہ تمثیلی انداز میں کہانی کو بھی ایک کردار کے روپ میں پیش کرتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے جدید کہانی کے اسلوب سے کچھ اثر لیا ہے۔ یہ انداز مظہر الاسلام سمیت کئی جدید افسانہ نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے۔

سرخ حاشیے

عابد میر کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس کے تین حصوں میں کم و بیش پینتیس (۳۵) مختصر کہانیاں شامل ہیں، جو ایک مختصر اقتباس سے لے کر ایک یا دو صفحوں پر مشتمل ہیں۔ اردو میں منٹو نے پہلے پہل اس نوعیت کی مختصر کہانیاں لکھنے کی ابتدا کی تھی، منٹو کی اس کی کتاب کا عنوان سیاہ حاشیے ہے۔ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے، عابد میر کی کتاب منٹو کے تتبع ہی میں لکھی گئی ہے، البتہ اس کی بیشتر کہانیوں کا لوکیل بلوچستان ہے۔ عابد اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ہندوستان کی سرحدوں پر پھیرے گئے حاشیوں کو منٹو نے سیاہ حاشیے بنا دیا۔ وہی سرحدیں اور ان سرحدوں سے منسلک ہر حد اب ایک عرصے سے لہولہو ہو کر سرخ ہو چکی ہے جس نے اس سارے جغرافیے کا چہرہ سرخ کر دیا ہے۔ ایسے میں جو حاشیہ کھینچئے سرخ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی کچھ سرخ حاشیوں کا مجموعہ ہے یہ۔ [۵۹]

سرخ حاشیے دراصل تین حصوں پر مشتمل مجموعہ ہے، جن کے الگ الگ ذیلی عنوانات ہیں۔ پہلے ''کہانی سرخ ہو جاتی ہے'' کے عنوان سے ۱۸ مختصر اور ۲ قدرے تفصیلی افسانے ہیں۔ ان میں سے نصف افسانے ۲۰۱۳ء میں بہادر خان وویمن یونیورسٹی کوئٹہ میں ہونے والے بم دھماکے کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کے ذیلی عنوانات ''کٹے ہوئے اعضاء کی گفتگو''، ''شکر خدا کا''، ''پوسٹ''، ''لائیک''، ''شیئر''، ''ٹیگ''، ''کومنٹس''، ''منظور خدا''، ''خبر''، ''مقتول کی دعا'' اور ''واہ واہ'' اس سانحے سے پیدا ہونے والے المیوں کی کہانی سناتے ہیں۔ ان میں دو یا تین صفحات سے لے کر صرف دو سطروں تک کے مختصر ترین افسانے بھی شامل ہیں۔ کتاب میں شامل باقی افسانے بلوچستان کے سماجی و سیاسی منظر نامے کا حال سناتے ہیں۔ اس مجموعے کا دوسرا حصہ ''پانی نے کہانی لکھی'' کے عنوان

سے ہے اس میں دس کہانیاں شامل ہیں جن میں ۲۰۱۰ء میں پاکستان میں آنے والے سیلاب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان میں شامل کہانی ''ملٹی نیشنل کمپنی کے مینجر کی ڈائری'' یہ بتاتی ہے کہ یہ سیلاب مصنوعی تھا جو ملٹی نیشنل کمپنیوں نے حصول زر کی خاطر پاکستان و ہندوستان میں برپا کیا تھا۔ دوسری کہانی ''سیلابی جوتوں کا مکالمہ'' ہے جس میں کہانی کار نے سیلاب میں بہہ کر سکھر بیراج کے بند میں پھنسے ہوئے جوتوں کو آپس میں مکالمہ کرتے دکھایا ہے جو اپنے اپنے مالکوں کا حال سناتے ہیں۔ اس کہانی سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

> لیکن بھائی جب تک یہاں کے محکوم اور لاچار لوگ ہمیں صرف پیروں میں ڈالتے رہیں گے، ظالموں کے منہ پہ دے مارنا نہیں سیکھیں گے تب تک ہم یونہی سیلابی ریلوں کی نذر ہوتے رہیں گے۔[۶۰]

محولا بالا اقتباس سے نہ صرف عابد کا سلجھا ہوا اسلوب آشکارہ ہوتا ہے، بلکہ وہ جس طرح بے جان جوتوں کو قوتِ گویائی دیتا اور ان میں زندگی پیدا کرتا ہے وہ بھی بخوبی نظر آتا ہے، جس سے اس کی تحریر کی فن کارانہ پختگی سامنے آتی ہے۔ اسی طرح سیلاب کو موضوع بناتے ہوئے افسانہ ''۲۱۱۰ء کا ایک منظر'' ہے، جس میں سو سال بعد کے دو کردار ایک دادا اور اس کی پوتی سیلاب اور قدرتی آفات پر تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں؛ ان کی بحث کے مطابق سو سال پہلے لوگ ان قدرتی آفات کا شکار اس لیے ہو جاتے تھے کہ وہ ان زمینی مسائل کو قدرت کی طرف سے اپنے بداعمال کا نتیجہ سمجھتے تھے، جبکہ آج [یعنی ۲۱۱۰ء میں] سائنسی ترقی کی بدولت ان مسائل کی وجوہات ختم کر کے لوگ سکون کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس طرح افسانے میں افسانہ نگار کا سائنسی شعور جھلکتا ہے۔ مگر وہ یہ بات نظر انداز کر دیتا ہے کہ زلزلہ اور سیلاب کی صورت جب قدرتی آفات نازل ہوتی ہیں تو ان کے سامنے انسان کا بنایا ہوا تمام بندوبست دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ مغرب کے انتہائی ترقی یافتہ ملک بھی بعض اوقات قدرتی آفات کے ہاتھوں تباہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال حال ہی میں امریکہ میں آنے والے متعدد سمندری سیلاب ہیں۔ جنھوں نے امریکی شہروں کی زندگی درہم برہم کر دی۔

اس مجموعے کے آخری حصّے کی کہانی ختم نہیں ہوتی، اس میں پانچ مختصر کہانیاں ہیں، جن میں سماج کے مختلف پہلوؤں پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔ مثلاً جس طرح استاد اپنے طلبہ سے نوٹس کے منہ مانگے پیسے لیتے ہیں اور پیسے نہ ہونے کی بنا پر غریب طلبہ کو اپنے نوٹس نہیں دیتے۔ ان کے طلبہ جب عملی زندگی میں آتے ہیں تو وہ رشوت کے بغیر کسی کا کام

نہیں کرتے حتیٰ کہ اپنے اساتذہ کا بھی جائز کام بغیر رشوت کرنے سے صاف انکار کردیتے ہیں۔

سیاہ حاشیے میں شامل کہانیاں اپنے موضوعات اور اسلوب کی بنا پر عابد کے اولین مجموعوں میں شامل افسانوی کی نسبت زیادہ بہتر اور قابل مطالعہ ہیں۔ اس میں عابد میر کا فن ارتقا پذیر صورت میں نظر آتا ہے۔ پہلی کتاب کے تقابل میں اس کے جملوں کی ساخت میں زیادہ بے ساختگی اور فنکارانہ اپج نظر آتی ہے۔

اسرار احمد شاکر (پ۱۹۸۲ء)

اسرار احمد شاکر نوجوان افسانہ نگار ہے جس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔

میرے بھی افسانے

اس میں کل بارہ (۱۲) افسانے شامل ہیں جن کے عنوانات یوں ہیں:

۱۔ منڈی	۲۔ آوارہ خواب	۳۔ روشنی
۴۔ مزارع	۵۔ سنڈے	۶۔ ابنارمل
۷۔ یکم مئی	۸۔ رہبر	۹۔ بارش، میں اور میرا شہر
۱۰۔ وصولی مہم	۱۱۔ حصّہ	۱۲۔ دلیر بادشاہ

اس مجموعے میں شامل اکثر افسانے جاگیردارانہ سماج میں زندگی کرتے عام انسانوں کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ غربت، عدم مساوات اور ناہموار طبقاتی معاشرت انسان کی زندگی مشکلات سے بھر دیتی ہے اور وہ بے موت مارا جاتا ہے۔ اس مجموعے کی اکثر کہانیاں انہی موضوعات کے گرد گھومتی ہیں۔ ان میں ''منڈی''، ''روشنی'' اور ''مزارع'' اچھے افسانے ہیں یہ افسانے بالاتر طبقے کے ظالم کرداروں کو پیش کرتے ہیں مصنف زبان پر گرفت کی بناء پر اپنی تحریر میں اثر اور زور پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آغا گل نے شاکر کو 'بائیں بازو کا ریڈیکل افسانہ نگار'' قرار دیا ہے۔[۶۱] دوسری طرف اس مجموعے میں شامل بعض کہانیاں جیسے ''رہبر''، ''وصولی مہم''، ''حصّہ'' اور ''دلیر بادشاہ'' فنی طور پر کمزور ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے، ان افسانوں میں مصنف فن سے پورا انصاف نہیں کرسکا۔ ان میں بعض معاشرتی واقعات کو سیدھے سادھے انداز میں پیش کردیا گیا ہے۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے افسانوں کا لکھاری کوئٹہ کے مضافات سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کی مادری زبان سندھی ہے اور وہ

سرائیکی بھی جانتا ہے، جبکہ اس نے اپنی تخلیقی شخصیت کے اظہار کے لیے اردو زبان کو چنا ہے۔ اس کے باوجود اس کی زبان میں کہیں کوئی لغوی یا لسانی غلطی نظر نہیں آتی۔ وہ سادہ اور رواں نثر لکھنے پر قادر ہے۔ شاکر اردو لکھتے ہوئے جا بجا سرائیکی اور سندھی الفاظ بھی لکھتا ہے جو بیشتر اس کی تحریر کی روانی کو متاثر نہیں کرتے البتہ کہیں کہیں بعض الفاظ اضافی یا زبردستی ٹھونسے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دیگر زبانوں کے ایسے الفاظ میں پکھڑے، امڑ، بوچھنڑ اور ٹوڑی بند وغیرہ شامل ہیں۔ اسرار احمد شاکر کی نثر میں اردو الفاظ سے ترکیب سازی کی نئی کوشش بھی نظر آتی ہے، مثلاً حافظے کی پٹاری، مایہ جال دانشور، خزاں رسیدہ نصیب اور ہونٹوں کی خشکابی وغیرہ۔ وہ کئی جگہ انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتا ہے جو کہیں کہیں غیر فطری معلوم ہوتے ہیں جیسے افسانے 'منڈی' کا ان پڑھ مرکزی کردار محمود اپنی بیوی وفا سے ایک جگہ کہتا ہے کہ ''وہ شہر کے ماحول میں 'ایڈجسٹ' نہیں ہو پا رہا''۔[۶۲] یہاں محمود کی زبانی ایڈجسٹ کا لفظ افسانے کے سنجیدہ قاری پر گراں گزرتا ہے۔

اسرار احمد شاکر کے افسانوں میں تشبیہ کا استعمال اس کے ہنر اور سلیقہ کی اچھی مثال بن کر سامنے آتا ہے۔ مثلاً محمود کے کردار کی اداسی کو ظاہر کرتا ہوا یہ جملہ کہ ''محمود کا چہرہ سوکھی روٹی کی طرح سوکھ جاتا تھا''۔[۶۳] اسی طرح اس کے افسانوں میں کہیں کہیں بہت اچھی منظر نگاری بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ لہٰذا بعض فنی کمزوریوں کے باوجود ایک نوجوان لکھاری کے طور پر اس کے افسانوں کا منظر عام پر آنا بلوچستان کے اردو فکشن کے لیے اچھا شگون ثابت ہوسکتا ہے۔

واپسی کا سفر

یہ نسیم جاوید کا واحد افسانوی مجموعہ ہے، اس میں درج ذیل پندرہ افسانے شامل ہیں:

۱۔ برادر مسلمان	۲۔ ادھورا خواب	۳۔ واپسی کا سفر
۴۔ الزام	۵۔ خوف	۶۔ کھوج
۷۔ مرد کی زبان	۸۔ غصہ	۹۔ کیڑا
۱۰۔ رحمت اللہ	۱۱۔ بینائی	۱۲۔ جہالت
۱۳۔ آزاد پرندہ	۱۴۔ دشت ماندہ	۱۵۔ سائیکل

نسیم جاوید کے افسانوں کی اہم بات مقامیت کا عنصر ہے۔ ان کی اکثر کہانیاں وادی کوئٹہ سے متعلق ہیں۔

ان میں کوئٹہ کا موسم، شہر کے محلوں کا ذکر، ہنہ اوڑک جیسے مضافاتی علاقوں اور مختلف پھلوں سے بھرے باغات کا تذکرہ ملتا ہے۔ پہلا افسانہ ''برادر مسلمان'' کوئٹہ میں افغان مہاجرین کے مسائل اور ان کی مجبوریوں کی کہانی سناتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے ہجرت کے المیے کے باعث دیارِ غیر میں یہ افغان مہاجرین اپنی ذات یہاں تک کہ اپنی عزت تک کھودیتے ہیں۔ نسیم جاوید کے کردار بھی مقامی ہیں اور وہ اپنی گفتگو میں کوئٹہ کی بولی کا اثر اور لہجہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں کوئٹہ کے لوگوں کی فطری اخلاص سادگی اور خلوص بھی نظر آتا ہے اور روایتی بے تکلفی بھی، یہ بات ان افسانوں کو قابلِ مطالعہ بنادیتی ہے۔ ان میں لوگوں کی غربت، مجبوری اور عورتوں کے جنسی وسماجی مسائل کا عکس بھی ملتا ہے۔ افسانے ''خوف'' میں بابو جمیل کہتا ہے:

> قسم خدا کی! ہماری زندگی بھی کتے جیسی ہے۔ کبھی ہم آٹے کے پیچھے دوڑتے ہیں اور کبھی دواؤں کے پیچھے خوار ہیں، کبھی بجلی کا بل جان نکال دیتا ہے تو کبھی مہنگائی کا جن ہماری رگوں میں خوف کا زہر بھر دیتا ہے۔[۶۴]

اسی طرح افسانے ''کھوج'' کا مرکزی کردار عبداللہ بدامنی کی فضا میں دائمی امن کا بیج تلاش کرتا ہے۔ امن نہ صرف کوئٹہ اور بلوچستان بلکہ شاید اس وقت ملک بھر کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ آج کی دنیا بدامنی کے جس عفریت کی زد میں ہے یہ افسانہ اس کی عکاسی کرتا ہے۔ نسیم جاوید بامحاورہ زبان لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر دلچسپ ہے، جو قاری کو حظ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔ کہیں کہیں مقامی لہجے کی بازگشت ان کے افسانوں میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ محمد حمید شاہد، نسیم جاوید کے افسانوں کو ساخت اور بنت کے اعتبار سے دو طرح کا قرار دیتے ہیں، مگر ساتھ ہی وہ ان میں مقامی عناصر کی موجودگی کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں:

> اس کے ہاں کہانی کا منظر نامہ اس منظر نامے سے قدرے مختلف ہو جاتا ہے، جو ہمارے اردو افسانے کو بالعموم مرغوب رہا ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ نسیم جاوید کے افسانوں کو اس فضا سے الگ کر کے دیکھا جاسکتا ہے، نہ سمجھا جاسکتا ہے۔[۶۵]

مصطفےٰ شاہد (پ ۱۹۷۴ء)

مصطفےٰ شاہد کوئٹہ کے ایک کالج میں اردو کے استاد ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ افسانوں کا چھپا ہے، اس کا تعارف و تجزیہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔

آخری صفحہ

مصطفیٰ شاہد کے اس واحد افسانوی مجموعے میں درج ذیل ۲۶ افسانے شامل ہیں:

۱۔ خون	۲۔ اپنی نظر	۳۔ مکافات	۴۔ ردعمل
۵۔ پیرسائیں	۶۔ اپنی زندگی	۷۔ آخری صفحہ	۸۔ مشکل
۹۔ بے ایمانی	۱۰۔ انسان	۱۱۔ خودغرضی	۱۲۔ اظہار
۱۳۔ ہوس	۱۴۔ میں ایسا نہیں ہوں	۱۵۔ فاصلہ	۱۶۔ شکست
۱۷۔ آزمائش	۱۸۔ انتقام	۱۹۔ مصلحت	۲۰۔ اعتراف
۲۱۔ ہاں اور ناں	۲۲۔ کافرستان	۲۳۔ آئینہ	۲۴۔ مہذب وحشی
۲۵۔ بازگشت	۲۶۔ حویلی		

ان افسانوں میں ''آخری صفحہ''، ''اپنی زندگی''، ''ردعمل''، ''مشکل'' اور'' مکافات'' زیادہ اچھے افسانے ہیں۔ ان کے دو افسانے ''خون'' اور'' انسان'' میں بالترتیب بیروت اور بمبئی کا لوکیل ملتا ہے۔ افسانے 'خون' کا یہودی کردار، بیروت پر اسرائیلی حملے کے بعد یہودی ہونے کے باوجود لاشیں اٹھانے اور زخمیوں کو ہسپتال پہنچانے میں مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوتا ہے اور مذہب کی بجائے انسانیت پر یقین رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ سوالیہ انداز میں افسانے کے ایک مسلم کردار سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے۔ ''کیا یہ ضروری ہے کہ انسان کو مذہب، رنگ، نسل، قوم، قبیلے اور جغرافیے کے حوالے سے دیکھا جائے۔ کیا انسان کی پہچان اور شناخت کے لیے اس کا کردار کافی نہیں ہے۔''[٦٦]

مصطفیٰ شاہد کے افسانوں کے کردار ہمعصر زندگی کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے لوگ ہیں۔ وہ ان کی مدد سے اپنی کہانیوں کا خمیر زندگی اور زمین سے جڑے ہوئے بنیادی حقائق سے اٹھاتا ہے۔ اس لیے ان میں حقیقت کے کئی رنگ ملتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے باطن تک پہنچنے اور اسے قاری سے آشنا کرنے میں بھی کامیاب نظر آتا ہے۔ اس کی زبان صاف اور رواں ہے۔ بعض کہانیوں میں کوئٹہ کے سماجی ماحول کا تذکرہ ملتا ہے۔ مگر زبان کی سطح پر وہ کوئی مقامی لفظ نہیں لکھتا بلکہ وہ اپنی نثر کو اردو روزمرہ اور محاورے سے پر لطف بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ منشا یاد اس کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

مصطفیٰ شاہد کی کہانیوں کے موضوعات نہایت متنوع ہیں اور ان میں زندگی کے مختلف اور طرح طرح کے

رنگ دکھائی دیتے ہیں۔۔۔عمدہ کردار نگاری ان کہانیوں کی دوسری خوبی ہے،ان کے کردار ہم عصر زندگی کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے لوگ ہیں۔اسی وجہ سے ان کی کہانیاں اپنے عہد اور زمین سے جڑی ہوئی ہیں اور زندگی کی ایسی تصویر پیش کرتی ہیں، جن میں سچائی اور حقیقت کا رنگ بہت گہرا ہے۔۶۷

زیب لونی

زیب لونی کے افسانے ایک عرصے سے مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔وہ ایک مقامی گرلز کالج اردو پڑھاتی ہیں۔بلوچستان کی نئی افسانہ نگار خواتین میں زیب لونی ایک اہم نام ہے۔

جلتے خواب

زیب لونی کا واحد افسانوی مجموعہ ہے جو حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔اس میں درج ذیل ۱۷ افسانے شامل ہیں:

۱۔ میجیشن	۲۔ تفریق	۳۔ پیدائشی غلام
۴۔ ذات کا سودا	۵۔ بیگی	۶۔ مجھ شاخ برہنہ پہ سجا برف کی کلیاں
۷۔ بدقسمت	۸۔ الٹرا ساؤنڈ	۹۔ جلتے خواب
۱۰۔ کب بدلوگے	۱۱۔ ظلمت شب قفس دراز ہوئی جاتی ہے	
۱۲۔ صدیوں کی گرد	۱۳۔ جو دل نے چاہا	۱۴۔ اعتراف شکست
۱۵۔ بوجھ	۱۶۔ کسانوں کے حقوق	۱۷۔ اب کیا بیچوں

ان میں سے دو کہانیاں ''صدیوں کی گرد'' اور ''جو دل نے چاہا'' سندھی افسانوں کے تراجم ہیں۔زیب لونی کی اکثر کہانیاں بلوچستان کے دیہات کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ان کے موضوعات میں غربت، بھوک، عورت کا جنسی وسماجی استحصال اور طبقاتی تفریق کو نمایاں کرنا شامل ہیں۔وہ کہانی کو بیانیے میں ڈھالنے کا ہنر جانتی ہے۔اس کا بے باک قلم بعض اوقات سفا کی کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔اس مجموعے کی اہم کہانیوں میں ''میجیشن''، ''پیدائشی غلام''، ''بیگی''، ''الٹرا ساؤنڈ''، ''ظلمت شب قفس دراز ہوئی جاتی ہے'' اور ''کسانوں کے حقوق'' ہیں۔ایک عورت ہونے کی بناء پر زیب نے دیہی اور غیر تعلیم یافتہ عورت کو درپیش مسائل کو خوبی سے نمایاں کیا ہے۔

افسانے ''جلتے خواب میں'' موجودہ دہشت گردی کے حوالے سے خودکش حملوں کوموضوع بنایا گیا ہے۔زیب لونی سادہ اور رواں نثر لکھنے پر قادر ہے۔کہیں کہیں ایک آدھ لفظ دیگر زبانوں کا بھی ملتا ہے جیسے گدان [خیمہ] وغیرہ۔ کہانی کو اچھی اٹھان دینے کے باوجود زیب کی کہانیوں میں فنی حوالے سے ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ قاری پر ایک گہرا یا دیرپا تاثر قائم نہیں کر پاتیں۔مثلاً افسانہ ذات کا سودا میں زینب جب غربت کے باعث ایک بڑی عمر کے آدمی سے رشتے کے لیے ہاں کرتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ:

> ہاں بابا ہاں۔۔۔میں کروں گی اس پچاس سالہ آدمی سے شادی بے شک میں خوبصورت ہوں مگر پچاس ہزار تو مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔۔۔زینب کو پچاس ہزار نے اس طرح اپنی طرف کھینچا جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔[۶۸]

محولا بالا اقتباس میں روپے کی قدر کے حوالے سے بات بنتی نظر نہیں آتی کہ آج کے زمانے میں پچاس ہزار کی کچھ اہمیت نہیں ہے۔زیب کا یہ مجموعہ ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔ یہاں پانچ لاکھ ہوتے تو جملہ اپنی معنویت کے لحاظ سے قدرے مکمل ہوتا۔ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد حمید شاہد لکھتے ہیں:

> یہ افسانہ نگار اپنے موضوعات سے محض کہانی لکھنے کے لیے نہیں، بلکہ اخلاص کی سطح پر جڑتی ہیں۔وہ کہانی کے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھتے ہوئے ،کرداروں کو کہانی کے منظر نامے میں رکھتی ہیں اور کہیں کہیں خود بھی اسی رہتل میں رچ بس کر یوں بات مکمل کرتی ہیں کہ تحریر میں اثر انگیزی کا وصف جی اٹھتا ہے۔۶۹

امرت مراد

امرت مراد بلوچستان کے ادبی افق پر حال ہی نمودار ہوئی تھی اور پھر اچانک اہ ایک بیماری کا شکار ہو کر نوجوانی میں انتقال کر گئی۔اس کی نظموں اور افسانوں کا ایک ایک مجموعہ اس کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

گیلا کاغذ

گیلا کاغذ امرت مراد کا واحد افسانوی مجموعہ ہے جو اس نوجوان خاتون افسانہ نگار کی بے وقت موت کے بعد ۲۰۱۶ء میں منظر عام پر آیا۔گیلا کاغذ میں درج ذیل سولہ کہانیاں شامل ہیں:

۱۔ کتے کا بچہ ۲۔ لوری ۳۔ بدلہ ۴۔ میزان

۵۔ جلی ہوئی گڑیا ۶۔ ننگا پن ۷۔ Order for World ۸۔ لفر مای

۹۔ رکشے والا ۱۰۔ ایک دونی دونی، دو دونی چار ۱۱۔ World is Empty

۱۲۔ سڑک پر پڑا گیلا کاغذ ۱۳۔ فالتو گھاس ۱۴۔ نئی شمع ۱۵۔ محبت کا مہر گڑھ

۱۶۔ تحقیقی مقالہ

اس مجموعے میں شامل بعض افسانے مثلاً ''کتے کا بچہ''، ''بدلہ''، ''میزان''، ''رکشے والا''، World is empty اور ''نئی شمع'' اچھے افسانے ہیں، جن میں کہانی کی بنت اور کردار نگاری میں مصنفہ کی ہنر مندی جھلکتی ہے؛ جبکہ دیگر افسانے کمزور ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو تو افسانہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی تحریروں میں ''سڑک پر پڑا گیلا کاغذ''، ''محبت کا مہر گڑھ''، تحقیقی مقالہ اور دیگر تحریریں شامل ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے امرت مراد نے اپنے مختلف افسانوں کا خمیر بعض واقعات سے اٹھایا ہے۔

امرت مراد غربت، عدم مساوات، طبقاتی تفریق اور صنفی امتیاز کو اپنے افسانے میں موضوع بناتی ہے۔ اسے زبان پر مہارت حاصل ہے مگر کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ لفاظی اس کی تحریر کو کمزور کر دیتی ہے۔ وہ جملے میں لفظ کے استعمال پر بھی زیادہ توجہ نہیں دیتی۔ اس سے بعض اوقات اچھا خاصا جملہ ضائع ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اکثر تحریریں جلد بازی میں یا ایک ہی نشست میں لکھی گئی ہوں۔ مصنفہ کو ان پر از سرِ نو غور کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ اہم بات یہ ہے کہ امرت مراد کے کئی افسانوں میں بلوچستان کے شہر، کرداروں کے مقامی نام، مقامی ماحول اور موسمی حالات کی عکاسی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنفہ زندگی کے بارے میں زیادہ تر مثبت رجحان رکھتی ہے۔ افسانے World is empty اور ''نئی شمع'' میں انسانی زندگی میں عورت کی اہمیت اور مردانہ معاشرے میں عورت کی جرات کو بخوبی اُجاگر کیا گیا ہے۔ World is empty میں یہ تصور یا انکشاف بہت اہم ہے کہ اگر کرۂ ارض پر عورتیں نہ رہیں اور صرف مرد باقی رہ جائیں تو مردوں کی بھاری آوازوں سے کرۂ ارض کا توازن بگڑ جائے گا اور زلزلے جیسی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی مرد اور عورت ہر دو کی آوازوں سے اس کرے کا توازن برقرار ہے۔ شاید ایسی بات سائنس دانوں نے کی ہو اور امرت مراد نے اس خیال کو اپنے افسانے میں پیش کیا ہو۔ یہ غالباً اردو افسانے میں ایک نئی بات ہے اور جس طرح سے افسانے میں اسے پیش کیا گیا ہے وہ مصنفہ کے تخلیقی شعور کی علامت ہے۔

گل اندام

یعقوب عامل کا افسانوی مجموعہ ہے جس میں کل ۱۶ کہانیاں ہیں۔ ان ساری کہانیوں کو اسلوب اور موضوع کی سطح پر افسانہ کہنا مناسب نہیں۔ یہ خام اور کچی پکی کہانیاں ہیں جن میں زیادہ تر محبت اور شادی دیگر لفظوں میں عورت کے جسمانی حصول کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کا مصنف تخلیقی نثر لکھنے سے قاصر ہے البتہ ان میں اردو کا مقامی لہجہ ملتا ہے۔ یعقوب عامل شاید اسی سطح کی اردو لکھ سکتا ہے۔ ان کہانیوں کو سنجیدہ ادب کے دائرے میں شامل سمجھنا قرین انصاف نہیں۔ اس کا تذکرہ یہاں صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ کتاب افسانوی مجموعے کے طور پر شائع ہوئی ہے۔

اردو میں بلوچی اور پشتو افسانوں کے تراجم

گذشتہ کچھ عرصے سے مختلف اخبارات و رسائل میں بلوچی اور پشتو افسانوں کے تراجم وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں بلوچستانی زبانوں کے تراجم کی روایت ابھی تشکیل کے مراحل میں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک تو ان زبانوں میں فکشن کی روایت قیام پاکستان کے بعد ہی شروع ہوئی، آغاز میں بہت کم افسانے لکھے گئے؛ ایک عرصے بعد جا کر ان زبانوں میں افسانوں کا باقاعدہ رواج نظر آتا ہے۔ پھر ان کے تراجم ہونے میں بھی کافی وقت لگا۔ ابتداء میں ایک آدھ افسانہ ہی ترجمہ ہو سکا، مگر رفتہ رفتہ مختلف زبانوں کے تراجم باقاعدہ کتابی صورت میں شائع ہونے لگے۔ ایسے تراجم مکمل صورت میں جن چند کتب کی صورت شائع ہوئے ہیں، ان کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

غنی پرواز (پ ۱۹۴۵ء) کے افسانے

غنی پرواز بلوچی افسانے اور ادب کا ایک اہم نام ہے۔ اردو میں اس کا ایک افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے۔

تھوڑا سا پانی

یہ غنی پرواز کے منتخب بلوچی افسانوں کے اردو تراجم کا مجموعہ ہے، اس میں کل تیئس (۲۳) افسانے شامل ہیں؛ ان میں سے پندرہ (۱۵) مصنف نے خود ترجمہ کیے ہیں جبکہ باقی مختلف لوگوں نے ہیں۔ غنی پرواز کے اکثر افسانے بلوچستان کے سماجی و سیاسی مسائل کی گرہ کشائی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ماحول، کردار اور

موضوعات سب بلوچستان سے متعلق ہیں۔ یہ زیادہ تر سادہ معاشرتی کہانیاں ہیں۔ان میں کسی فکر یا فرد کے وجودی مسائل نہیں ملتے نہ ہی ان کی تحریر میں کوئی علامتی انداز ملتا ہے۔آغا گل، غنی پرواز کے ان تراجم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

زیرِنظر تراجم سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام تراجم چابکدستی سے کیے گئے ہیں، ورنہ غنی پرواز کے اوریجنل خیالات، احساسات اور واقعات کو بلوچی سے اردو میں منتقل کرنا ایک دشوار مرحلہ تھا۔۔۔یہ تراجم اس قدر مکمل، جیتے جاگتے اور پراثر ہیں کہ اوریجنل ورق کا گماں ہوتا ہے۔۷۰

مختلف زبانوں کے تراجم کا مجموعہ:انجیر کے پھول

اس مجموعے کو افضل مراد نے ترتیب دیا ہے،اس میں بلوچی اور براہوی کے گیارہ گیارہ، جبکہ پشتو کے صرف تین افسانوں کے اردو تراجم شامل ہیں۔اس میں بلوچی زبان کے افسانہ نگاروں میں گوہر ملک، نعمت اللہ گچکی، غنی پرواز، صورت خان مری، صبا دشتیاری، منیر بادینی، علی دوست بلوچ، حکیم بلوچ اور عزیز بگٹی شامل ہیں؛ ان میں سے گوہر ملک اور غنی پرواز کے دو دو، جبکہ باقی سب کا ایک ایک افسانہ دیا گیا ہے۔پشتو کے افسانہ نگاروں میں درمحمد کاسی، نصیب اللہ سیماب، اور فاروق سرور کا ایک ایک افسانہ ہے۔ براہوی افسانے کے حصے میں وحید زہیر اور افضل مراد کے تین تین، عارف ضیاء کے دو افسانے، جبکہ تاج رئیسانی، ظفر مرزا اور اثیر عبدالقادر شاہوانی کا ایک ایک افسانہ شامل ہے۔اس مجموعے کا نام تاج رئیسانی کے براہوی افسانے ''انجیر نا پھُل'' سے لیا گیا ہے۔ان تمام افسانوں کو اردو کے روپ میں افضل مراد نے ڈھالا ہے۔محمد حمید شاہد ان تراجم کو''اردو کہانی پر ایک نئے ذائقے کا دریچہ کا کھلنا'' گردانتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ کہانیاں شہری زندگی کی پرپیچ گلیوں، بھرے پڑے دفتروں، لہلہاتے کھیتوں اور لمحہ لمحہ انسانوں کو نگلتے بازاروں سے نہیں پھوٹیں، بلکہ انھیں سراوان اور جھالاوان کے علاقوں نے جنم دیا ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ ان میں بلوچستان کی وسعتیں سما گئی ہیں۔۔۔وسعتیں بھی اور اور ان وسعتوں پر محیط دکھ کے آسمان بھی۔۷۱

تاہم حقیقت یہ ہے کہ، ان سب افسانوں کو فکر وفن کی سطح پر اردو کے مرکزی دھارے میں شامل افسانے کے مقابل نہ رکھا جائے تو بہتر ہے۔ان کی اپنی فضا، ماحول اور زبان ہے۔ان میں پیش کردہ مسائل بھی مختلف ہیں اور کردار بھی۔ان میں مزاحمتی عنصر بھی ملتا ہے اور سماجی وسیاسی صورتحال کی عکاسی بھی اور اس کے ساتھ ساتھ بلوچ

نوجوانوں کا احساسِ محرومی بھی۔ آصف فرخی اردو افسانے کی تعین قدر کے تناظر میں بلوچستان کے ان افسانوں کی فنی کمزوریوں سے آگاہ ہونے کے باوجود انھیں اہم پیش رفت قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

جو کہانیاں یہ افسانے سنا رہے ہیں، ان کے درمیان ان کہی پھر بھی رہ جاتی ہے۔ اس کے باوجود جو کہانی یہاں ٹکڑے ٹکڑے سننے کو ملتی ہے، اس میں یہاں کے کئی رنگ ہیں اور بعض اپنی جگہ پر اثر۔۔۔ افضل مراد نے بلوچستان کے افسانے چن کر ایک کتاب بنا دی ہے۔ اس کی خصوصیات اور حدود کا اندازہ بھی رہے تو ان افسانوں کے مطالعے کے لیے سودمند ہوگا۔۷۲

نور محمد تره کئی (۱۹۱۷ء۔۱۹۷۹ء) کے افسانے

نور محمد تره کئی افغانستان میں انقلابِ ثور کی بنیاد رکھنے والوں میں تھے، جو ایک سوشلسٹ انقلاب تھا۔ وہ ۱۹۷۸۔۷۹ء کے دوران افغانستان کے صدر بھی رہے، وہ ایک کمیونسٹ سیاستدان تھے؛ انھوں نے پشتو میں کئی ناول اور افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں کے اردو تراجم پر مشتمل ایک مجموعہ شائع ہوا۔

ہاری کی بیٹی

اس میں نور محمد تره کئی کے چودہ (۱۴) پشتو افسانوں کے اردو تراجم شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کل اڑسٹھ (۶۸) صفحات پر مشتمل ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تمام مختصر افسانے ہیں۔ محمد نعیم آزاد اور جعفر خان ترین نے انھیں اردو میں ترجمہ کیا ہے، تاہم اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ انھوں نے مل کر یہ تراجم کیے یا الگ الگ، اگر الگ الگ کیا ہے تو یہ واضح نہیں کہ کون سا افسانہ کس نے ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے ''بیل کی لاندی'' اور ''ہاری کی بیٹی'' اچھے افسانے ہیں، جبکہ ''ایسا کب ہوگا'' افسانے کی بجائے کوئی مضمون لگتا ہے۔ نور محمد تره کئی کے ان تراجم کے بارے میں کتاب کے ناشران کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

پشتو کے ممتاز و بے بدل تخلیق کار نور محمد تره کئی کے افسانوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پشتو کے اس عظیم ادیب کی تخلیقات سے مستفید کروانے کے ساتھ اس حقیقت کو اجاگر کیا جائے کہ اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے بدحال، جنگ زدہ اور طبقاتی سماج میں میں انتہائی درجے کے اعلیٰ فن پارے تخلیق کیے گئے۔ نور محمد تره کئی پشتون سماج کی شناخت کا بنیادی حوالہ ہے اور پشتون شناسی کے لیے اس ادیب کی

تخلیقات کی حیثیت اساسی ماخذ کی ہے۔۷۳

نور محمد ترہ کئی کے افسانوں کا موضوع انتہا درجے کی غربت جھیلتا افغانی، سود کا ظالمانہ نظام اور بچیوں کی کم عمری میں شادی وغیرہ ہیں۔ترہ کئی خود چونکہ کمیونسٹ نظریے سے جڑے ہوئے تھے، اس لیے وہ طبقاتی نظام کو تمام مسائل کی جڑ سمجھتے ہیں۔وہ اس کی خرابیوں کو سماج اور فرد کے پردے میں اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہیں۔طبقاتی نظام کے شکنجے کس طرح آدمی کو اپنی گرفت میں جکڑتے ہیں، ان مختصر افسانوں میں خوبی سی اجاگر کیا گیا ہے۔ان افسانوں کے اکثر کردار لاچارگی اور بے بسی کی تصویر نظر آتے ہیں۔یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ترہ کئی کا مقصد عام آدمی کو شعور دینا تھا تاکہ وہ سوشلسٹ انقلاب کے لیے تیار ہو سکیں۔انھوں نے اپنی تحریر سے اپنے نظریے کی تبلیغ کا کام لیا، مگر ان کے ملک میں تعلیم عام نہیں تھی اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مجموعی جائزہ

قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں لکھا گیا اردو کا پہلا افسانہ ''ویری ناگ'' ہے جو انور رومان کی تخلیق ہے۔اس مقالے میں پہلی بار نہ صرف اس کا تعین کیا گیا ہے بلکہ اس کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہوئے اس کے خالق انور رومان کو بلوچستان میں اردو کا پہلا باقاعدہ افسانہ نگار قرار دیا گیا ہے۔قبل ازیں کسی تنقیدی کتاب یا مضمون میں انور رومان کے پہلے افسانے یا ان کے پہلے افسانہ نگار ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا۔انور رومان کا نام بلوچستان کے ادبی اور علمی افق پر نمایاں رہا ہے۔مختلف موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی مضامین یا کتابیں ہوں اور یا پھر بلوچستان پر لکھی گئی اہم انگریزی کتب کا ترجمہ ہو، انور رومان کا نام کسی حوالے سے محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ یہ سوال اٹھتا ہے کہ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی افسانہ نگاری نظر انداز ہوتی رہی ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ ان کا درویشانہ مزاج تھا۔وہ اپنی تخلیقات کو اُردو کے اچھے رسائل و جرائد میں شائع کرنے کی بجائے ان سے اغماض برتتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی جس قدر تحریریں دستیاب ہیں وہ ان کے بھائی انعام الحق کوثر اور ان کے خانوادے کے طفیل ہے۔ان کی عادت تھی کہ وہ کاغذ پر لکھنے کے بعد ان چیزوں کو گھر کے مختلف کونوں کھدروں میں لاپروائی سے پھینک دیا کرتے تھے۔اس کی وجہ جو بھی ہو مگر اس طرح وہ تخلیقی ادب کے افق پر اس طرح ابھر کر سامنے نہیں آسکے جیسا کہ ان کو آنا چاہیے تھا۔مثلاً یہی دیکھیئے کہ انور رومان نثری نظم لکھنے والے اولین لوگوں میں شامل ہیں مگر نثری نظم پر لکھے گئے مضامین یا کتب میں ان کا ذکر ملتا ہے نہ ہی نثری نظم کے شاعر کی حیثیت سے کوئی انہیں جانتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت اپنا کلام اردو کے اہم رسائل میں اشاعت کی غرض سے نہیں بھیجا۔اپنے اس درویشانہ مزاج اور بے پرواہ عمل کے باعث وہ جائز ادبی مقام نہ پاسکے جو اُن کا حق ہے۔

انور رومان کا افسانہ ''ویری ناگ'' کشمیر کی آزادی کے موضوع پر ہے۔ یہ مختصر افسانہ ایک ایسے کشمیری نوجوان کا قصہ ہے جو اپنے وطن سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ وہ اس کے پھولوں، باغوں اور مختلف علاقوں کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتا ہے جہاں وہ سکون سے رہنا چاہتا ہے۔مگر دشمن کے فوجی اس کے خوبصورت وطن پر حملہ آور ہوتے اس سے غالباً بھارتی فوج مراد ہے۔ یہ نوجوان اس فوج کے سامنے ایک بندوق لے کر ڈٹ جاتا ہے اور وطن کا دفاع کرتے ہوئے حملہ آور فوج کے دانت کھٹے کر دیتا ہے۔گویا افسانہ ''ویری ناگ'' مقبوضہ کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضے کے خلاف کشمیری نوجوانوں کی مزاحمت کا قصہ سناتا ہے اور اس طرح اس کا شمار مزاحمتی ادب میں ہوتا ہے۔

انور رومان کا افسانہ ''ویری ناگ'' ۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے ٹھیک ایک برس بعد لکھا گیا اور یہ وہ زمانہ ہے جب کشمیر پر بھارتی فوج کے حملے کے بعد پاکستان کی فوج اور قبائلی نوجوان بڑی تعداد میں کشمیر بھارتی فوج سے لڑنے گئے تھے۔ کئی محاذوں پر بھارت کو پسپا ہونا پڑا تھا۔ تب وہ یہ مسئلہ اقوام متحدہ لے گیا اور جنگ بندی کی اپیل کی جس پر جنگ بند ہوئی تھی۔ انور رومان کا افسانہ پڑھتے ہوئے قاری ماضی کے دریچے میں جھانکنے لگتا ہے اور اسے وہ ساری تاریخ یاد آ جاتی ہے۔ انور رومان کشمیری نہیں وہ مشرقی پنجاب کے علاقے لدھیانہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔اے کرنے کے بعد وہ قیام پاکستان سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۴۶ء میں کوئٹہ کے واحد کالج میں تاریخ کے لیکچرر کے طور پر فائز ہوئے اور پھر ان کی ساری زندگی بلوچستان کے مختلف کالجوں میں تاریخ پڑھاتے اور کتابیں لکھتے گزری۔ یہ افسانہ انھوں نے کشمیر سے ہزاروں میل دور بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں لکھا لیکن اس طور لکھا جیسے وہ کشمیر میں مقیم ہوں اور اس کا دکھ درد سمجھتے ہوں۔ اس افسانے سے اس وقت کے لوگوں کے ذہنی رجحان باہمی محبت اور اس یگانگت کا پتہ چلتا ہے جو طویل فاصلوں کے باوجود وہ ایک دوسرے کے دلوں میں رکھتے تھے۔ ''ویری ناگ'' اس باہمی تعلق اور ذہنی قربت کا عملی اظہار یہ ہے۔

انور رومان نے کچھ اور افسانے بھی لکھے ہیں جو ان کی کتابوں انوارئیے اور قمقمے میں شامل ہیں۔ ان افسانوں کا بغور مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ جدید اسلوب میں لکھے گئے افسانے ہیں۔ مصنف نے چونکہ خود انھیں افسانہ قرار نہیں دیا اس لیے یہ بھی افسانے تصور نہیں کیے گئے۔ خلیل صدیقی ان افسانوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''یہ روایتی اور مروجہ اصناف ادب کے لوازمات اور تکنیک کا التزام کر کے نہیں لکھے گئے۔''[۴۷]

خلیل صدیقی نے جب یہ بات کہی تو شاید ان کے ذہن میں افسانے کا وہ روایتی تصور جس میں کہانی سیدھے سادے رواں انداز میں چلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کی ''صنفی حیثیت کا حتمی اور قطعی تعین نہیں کر پائے''۔ ان میں سے بعض افسانے مکمل طور پر مکالمے کے روپ میں ہیں جبکہ بعض افسانے پہلے ایک عنوان اور پھر بعد میں کئی ذیلی عنوانات کے تحت مختصر اقتباسات کی شکل میں ہیں۔ یہ بظاہر الگ الگ نظر آتے ہیں مگر ان کیا بنیادی تقسیم ایک ہے۔ ان اقتباسات کی اہم بات یہ ہے کہ ان میں افسانویت یا کہانی پن پایا جاتا ہے اور زبان کا استعمال بھی خالصتاً ادبی رنگ روپ لیے ہے۔

خلیل صدیقی کو جس بات نے ان تحریروں کی صنف کا تعین نہیں کرنے دیا شاید وہ ان کتابوں میں شامل انور

رومان کی نثری نظمیں ہیں۔ جدید طرز کے یہ افسانے اور نثری نظمیں چونکہ ایک ہی کتاب میں یکجا کیے گئے ہیں۔ اس لیے خلیل صدیقی ان نئی نظموں کے ساتھ ساتھ افسانہ کے اس نئے روپ سے بھی دھوکا کھا گئے اور ان کے بھرپور تاثر اور کرشمہ سازیوں کے باوجود وہ کہانیوں کو نظموں سے الگ کر کے انھیں افسانے نہ سمجھ سکے جو دراصل افسانہ ہی ہیں جدید افسانے۔ ان تمام دلائل کی بنیاد پر اس مقالے میں پہلی بار انور رومان کو بلوچستان کا پہلا باقاعدہ افسانہ نگار قرار دیا گیا ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد کے زمانے یعنی ۱۹۵۵ء میں ایک کتاب وادی بولان میں کوئٹہ سے شائع ہوئی۔ اس میں شاعری اور مضامین کے ساتھ چار افسانے شامل ہیں، جو افسانے بالترتیب عبدالمنان شیخ، سید اختر شمی، فضل الٰہی حلیم اور ملک محمد صادق ناظر کے ہیں۔ یہ سادہ کہانیاں ہیں جو غربت، استحصال، جنسی مسائل اور بیروزگاری وغیرہ کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کہانیوں کے لکھنے والوں نے شاید یہی ایک ایک کہانی لکھی ہے، کہ بعد کے زمانے میں ان کی کوئی تحریر یا افسانہ نہیں ملتا۔ ان سادہ کہانیوں میں سے ایک کہانی بھی ایسی نہیں، جو اپنے اندر موضوع، مواد، افسانوی بنت یا اسلوب کی سطح پر قاری کو چونکانے کا سامان رکھتی ہو۔ ان کہانیوں سے البتہ یہ بات سامنے آئی ہے، کہ اس دور میں کوئٹہ کے بعض ادیبوں نے افسانہ لکھنے کی کوشش ضرور کی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار کی صورت میں سامنے نہ آ سکے۔ تاہم ان کی کاوش قابل داد ہے۔

بلوچستان میں اردو کے دوسرے باقاعدہ افسانہ نگار سید خلیل احمد ہیں جن کا افسانوی مجموعہ خمارِ زہر آلود بلوچستان سے شائع ہونے والا اردو کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس افسانوی مجموعے کی اشاعت سے پہلے سید خلیل احمد کے کئی مختصر افسانے اردو کے قابل ذکر رسالوں مثلاً ادب لطیف اور نقوش وغیرہ میں شائع ہو کر اردو کے اہم ادیبوں سے تحسین پا چکے تھے۔ خمار زہر آلود میں تین طویل افسانے شامل ہیں۔ انھیں اگر ناولٹ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ یہ ناولٹ کی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں کا لوکیل کراچی، لاہور اور مری ہے۔ ان تینوں افسانوں کا بنیادی موضوع محبت اور اس سے وابستہ عوامل ہیں۔ اس طرح ان میں کرداروں کی جذباتی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ تینوں طویل کہانیاں زبان و بیان اور کہانی کے دیگر جملہ لوازمات رکھتی ہیں مگر ان میں اس چیز کی کمی ہے جسے ادب عالیہ کہتے ہیں۔ سید خلیل احمد کے مختصر افسانے البتہ تخلیقی جوہر رکھتے ہیں جو زندگی کے حقیقی مسائل کو اعلیٰ ادبی پیرائے میں موضوع بناتے ہیں بالخصوص ان کا افسانہ ''مالک'' اردو کے چند بہترین افسانوں میں شمار

ہونے کے لائق ہے۔اس افسانے میں ان کا فن نکھری ہوئی صورت میں نظر آتا ہے۔اس میں لوگ ایک بڑی عمارت میں کئی منزلوں میں مقیم ہوتے ہیں سب سے نچلی منزل میں انتہائی غریب لوگ رہتے ہیں ان میں سے ایک بیوہ عورت اوراس کی بیٹیاں ہیں، جن کا یکے بعد دیگرے افسانے میں استحصال دکھایا جاتا ہے۔ بیوہ عورت اپنی بیٹیوں کے جنسی استحصال سے بے خبر اس بات پر خوش ہوتی ہے کہ عمارت کا ''مالک'' انھیں اپنے ہاں کام پر رکھے ہوئے ہے۔اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ کیسے معاشرے کے امیر لوگ غریبوں کا جسمانی اور مالی استحصال کرتے ہیں اور وہ اپنے استحصال سے بے خبر ایسے بدکردار لوگوں کو مہذب اور شریف سمجھتے ہیں جو دراصل اسفل اور رذیل ہوتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ افسانہ ''مالک'' ترقی پسند رجحان کا ایسا افسانہ ہے، جس میں افسانے کا فن اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔

بلوچستان میں اردو افسانے کے افق پر معین الحق اپنے واحد افسانوی مجموعے تاریکیاں کے ساتھ نمودار ہوا۔معین الحق اپنے افسانوں میں جاگیردارانہ معاشرت کی خرابیاں اور سماجی مسائل کو بلوچستان کے تناظر میں دیکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں جو کردار نظر آتے ہیں وہ مقامی یعنی بلوچستان کے ہوتے ہیں۔ان مقامی کرداروں کی ساخت اور پیش کش میں وہ اس دھرتی کے مختلف رنگ بھی دکھاتا ہے۔ان کرداروں کے نام ہی مقامی نہیں ہوتے بلکہ ان کا حلیہ، زبان اور انداز واطوار سب مقامی دیہی معاشرت سے مملو ہوتے ہیں۔معین الحق کے افسانوں میں بلوچستان کی ثقافت کے متنوع رنگ بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔اس طرح یہ افسانے اپنی بنت میں اُردو کے مجموعی افسانوں سے قدرے الگ نظر آتے ہیں۔معین الحق کے افسانوں میں بلوچستان کی عورت اور اس کے استحصال کی صورتیں بھی ملتی ہیں۔ یہ کہیں ضعیف العتقادی کے باعث ہیں تو کہیں کم علمی اور کہیں مرد کے حاکمانہ رویے کی وجہ سے ہیں۔ایک قبائلی جاگیردارانہ سماج میں عورت جو کمتر حیثیت رکھتی ہے اور جس طرح چپ چاپ وہ اپنے استحصال کو مسلسل برداشت کرتی چلی جاتی ہے۔اس کا اظہار معین الحق عمدگی سے اپنے افسانوں میں کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کا افسانہ مغلوب رشتے ،عورت کی اس بے چارگی اور بے کسی کی مکمل تصویر دکھاتا ہے۔ اس میں ایک عورت کی عزت لٹتی ہے تو اس کا بھائی وقت پر آنے پر دوسرے فریق کی عورت کی عزت لوٹ کر حساب چکتا کرتا ہے۔یعنی ایک عورت کی بے عزتی کا خمیازہ بھی ایک عورت ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔مرد ہر حال میں دونوں طرف سے فائدے میں رہتا ہے۔اس کی انا کی تسکین ہوتی ہے اور اس کی غیرت کو سکون ملتا ہے۔معین الحق نے خود مرد ہوتے ہوئے جس طرح عورت کی مظلومیت اور مردانہ بالا دستی کی خوفناک حقیقت تو تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس کے ایک عمدہ تخلیقار ہونے کی گواہی ملتی ہے مگر اس کے تمام افسانے اسی معیار کے نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اس کے چند

ہی افسانہ کے فن پر پورا اترتے ہیں۔ اس کے کئی افسانے کئی طرح کی خامیاں بھی رکھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کمزور پلاٹ پر اپنی کہانی کی بنیاد رکھتا ہے۔ بعض دفعہ کردار نگاری میں کمی آ جاتی ہے۔ ایک آدھ جگہ وہ غلط رواج کا ذکر کر جاتا ہے۔ جیسے افسانے ''خان بادشاہ'' میں ایک پٹھان کردار اپنی بیٹی کے لیے جہیز دینے کی خاطر مر جاتا ہے۔ پٹھان کردار کی موت کے غیر فطری پن کے علاوہ بھی یہ افسانہ کمزور ہے۔ معین الحق کے بعض افسانے کمزور حقیقی واقعات کے گرد گھومتے ہیں۔ ان سب نقائص کی وجہ سے اس کا فن ابھر کر سامنے نہیں آ پاتا۔ معین الحق افسانہ لکھنا جانتا ہے مگر جلد بازی، کہانی مکمل کرنے کی جلدی اور جملے کی ساخت پر توجہ نہ دینے کے باعث وہ زیادہ بہتر افسانے لکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معین الحق کے پاس کہانیاں ہیں اور انھیں بیان کرنے کا ملکہ بھی اُسے حاصل ہے مگر اس کے لیے جس ٹھہراؤ، سکون اور مسلسل محنت کی ضرورت ہے وہ نہ ہونے کے باعث وہ اپنی اچھی خاصی کہانی کو بعض اوقات ضائع کر دیتا ہے۔

بلوچستان میں اردو افسانے کے ارتقائی سفر میں سب سے اہم نام خادم مرزا کا ہے۔ ان کے افسانوں کا صرف ایک مجموعہ سات رنگ اور ایک گیان کے نام سے موجود ہے۔ خادم مرزا جدیدیت کا حامل افسانہ نگار ہے جو اپنا ایک منفرد اسلوب بھی رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خادم مرزا کو تخلیقی نثر لکھنے کا جو ملکہ حاصل ہے اور اس کے افسانوں میں جو فنی پختگی جھلکتی ہے اس حوالے سے بلوچستان کا شاید ہی کوئی دوسرا کہانی کار اس کی ہمسری کرتا ہو۔ روزمرّہ زندگی سے متعلق ہونے کے باوجود خادم مرزا کے افسانے ایک خاص گہرائی اور معنویت رکھتے ہیں۔ اس کے افسانوں میں سیاسی اور سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ سوالات بھی ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ادب کی انتہا فلسفہ ہے۔ یعنی ادب نہ صرف فلسفیانہ غور و فکر یا سوال قائم کرتا ہے بلکہ ان کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب کی اس تعریف پر خادم مرزا کے افسانے پورا اُترتے ہیں مگر اہم بات یہ ہے کہ یہ ادب ہی رہتے ہیں فلسفہ نہیں بن جاتے۔ یعنی اس کے افسانوں کا ظاہری تار پود افسانوی وجود رکھتا ہے۔ یہ کہانی ہی رہتا ہے جو اس کا بنیادی وصف ہے۔ البتہ اس کی کہانیوں میں فلسفیانہ واردات کا عکس نظر آتا ہے جو قاری کو چونکا دیتا ہے اور وہ ذرا دیر کے لیے افسانے کو بھول کر فلسفے کی دنیا کی جانب چل پڑتا ہے۔ خادم مرزا واحد افسانہ نگار ہے جس کی کہانیوں میں فلسفیانہ خیالات کی آمیزش ملتی ہے مثلاً وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔ ''ہونا اور نہ ہونا ہر سانس اتر رہا ہے۔ یہ سب کایا کے چھل میں ہیں۔''۷۵

اس ایک مختصر جملے میں انسانی زندگی کی ناپائیداری وجوداور کائنات پرغوروفکر کا کتنا سامان ہے۔ خادم مرزا انسان اور زمین کے ربط کوموضوع بناتے ہوئے کئی سوال اٹھاتا ہے۔ ایک اور نکتہ جو اہم ہے وہ اس کی تحریروں میں ہندی لفظیات وتراکیب کا کثیر استعمال ہے۔ وہ بعض ایسی ہندی لفظیات نہایت خوبی سے استعمال میں لاتا ہے جن سے پوری ایک اسطورہ جڑی ہوتی ہے۔ مثلاً "چاروں اور رام لیلا پھیلی ہوئی تھی۔"[۶۷] ہندی اساطیر میں رام لیلا کی داستان کی جو اہمیت ہے اور اس سے جو واقعات جڑے ہوئے ہیں، اس مختصر جملے کی قرأت سے ایک بامطالعہ قاری کے ذہن میں وہ تمام واقعات روشن ہو جاتے ہیں اور افسانے کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسے جملوں یا تراکیب سے خادم مرزا کے وسیع مطالعہ ہندوضمیات واساطیر میں دلچسپی اور کہانی سے اس کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ خادم مرزا علامتی افسانہ نگار نہیں ہے مگر اس کے بعض افسانوں میں علامتی اندازِ بیاں ملتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے شعوری طور پر علامتی افسانہ لکھنا چاہا یا علامتی افسانے کا طرزِ بیان شعوری طور پر اختیار کیا مگر اس کے افسانے بیانیہ افسانے ہی رہتے ہیں۔ یہ مکمل علامتی افسانے میں نہیں ڈھلتے۔ اس کے افسانوں میں سیاسی وسماجی موضوعات بھی ملتے ہیں اور جیسا کہ پہلے کہا گیا فلسفیانہ نکات بھی ان کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔

وہ جنس کو بھی موضوع بناتا ہے۔ مثلاً افسانہ "کاجل کا شہتیر" یا "سمی" وغیرہ، ان میں عورت کے جنسی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ "کاجل کا شہتیر" میں ان شادی شدہ عورتوں کی جنسی کجروی بیان کی گئی ہے جو شادی کے بعد ایک طویل عرصہ اپنے شوہروں سے دور رہتی ہیں۔ ان کے شوہر پیسے کمانے یا معاش کی غرض سے پردیس میں رہتے ہیں اور ان کی جوان بیویاں ان کے بغیر اپنی جسمانی ضرورت یا جنسی اشتہا سے مجبور ہو کر غلط راہ پر چل پڑتی ہیں۔ اس طرح در پردہ اس افسانے میں مرد ہی قصوروار نکلتا ہے۔ یہ ایسا معاشرتی موضوع ہے جس کے حوالے سے ہمارے شہروں اور دیہات میں آج بھی طرح طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ پاکستانی مردوں کی ایک کثیر تعداد بیرون ملک ملازمت کرتی ہے اور سال کا بیشتر حصّہ باہر رہتی ہے بعض لوگ تو سالہا سال تک اپنے گھروں کو نہیں آتے جہاں ان کی بیویاں اور بچے ان کے بغیر رہتے ہیں۔ اس سے دیہات میں رہنے والی نوجوان بیویوں کے ہاں جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، وہ اس افسانے میں دکھائے گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس افسانے کے مرکزی کردار سکھ خواتین پرکاش کور وغیرہ ہیں۔ کوئٹہ میں رہتے ہوئے خادم مرزا نے بلوچ یا پٹھان خواتین کی بجائے ہندو یا سکھ خواتین کی جنسی کجروی یا محرومی کو بیان کیا ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا بلوچستان کی خواتین ایسے مسائل سے دوچار نہیں ہوتیں جن کے خاوند شادی کے بعد روزگار کی غرض سے عرب ریاستوں میں مقیم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی

لمبے عرصے تک گھر نہیں آتے۔ خادم مرزا نے بلوچستان کی عورتوں کے بجائے ہندو عورتوں کے کردار اپنے افسانوں میں کیوں لکھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہوگی کہ تقسیم ہند سے پہلے ہندو کرداروں کا تجربہ اُسے حاصل ہوا ہو۔ دوسری وجہ خوفِ فسادِ خلق ہو سکتا ہے کہ ایک قبائلی معاشرے میں رہتے ہوئے وہ ایسے کردار اور نام نہ لکھ سکا اور ان مقامی کرداروں کو اس نے ہندو کرداروں کے بھیس میں پیش کیا ہو کہ بہر حال ایسے مسائل انسانی سطح پر پیش آتے ہیں۔ خادم مرزا کا افسانہ ''غداری'' اس بات کا رد نظر آتا ہے کہ وہ مقامی کرداروں کے جنسی مسائل اپنے افسانوں میں خوفِ فسادِ خلق کے باعث نہیں لکھ پایا۔ اس افسانے کا کردار ایک مقامی پٹھان خاتون ہے جس کا شوہر سیاست میں سرگرم ہونے کے باعث گرفتار ہو کر جیل میں قید ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو رہا کرانے کی غرض سے اس کی سیاسی پارٹی کے راہنماؤں سے ملتی ہے تو وہ اس کا کام کرانے کے لیے اس کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی رہائی کے لیے اس قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ افسانہ میں لفظ ''پشتونستان'' کا تذکرہ یہ نشاندہی کرتا ہے کہ یہ پارٹی پٹھان قوم پرست پارٹی ہوتی ہے جو پشتونستان بنانا چاہتی ہے یعنی پٹھانوں کے لیے الگ دیس یا پاکستان کے اندر ایک صوبہ مگر اس کے سیاسی رہنما دنیا پرست اور عیاش اور بدکردار لوگ ہوتے ہیں جو اپنی پارٹی کے لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ خادم مرزا کا یہ واحد افسانہ ہے جس میں مقامیت کا عنصر اس طور واضح نظر آتا ہے۔ افسانہ ''سات رنگ اور ایک گیان'' بنگلہ دیش کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ بلوچستان کا فن کار بھی ملک ٹوٹنے کے سانحے سے شکستہ دل ہے۔ اس طرح وہ اس قومی احساس سے منسلک ہے جو اس سانحے کے نتیجے میں ملک بھر میں موجود تھا۔ خادم مرزا ہر موضوع پر کہانی لکھتے ہوئے اپنے اسلوب کی تشکیل میں لفظ اور جملے کی سطح پر ایک پختہ شعور کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر میں پوری ادبی چاشنی ملتی ہے اور کہانی کی روانی یا طرزِ بیان میں کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ یہ اس کے ایک اعلیٰ فنکار اور اچھے افسانہ نگار ہونے کی دلیل ہے۔

بلوچستان میں اردو افسانے کا تذکرہ آغا گل کے بغیر نامکمل ہے۔ آغا گل نے تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ افسانے ہی نہیں لکھے بلکہ ان میں بلوچستان کا تذکرہ بھی زیادہ نظر آتا ہے۔ آغا گل بلوچستان کے افسانہ نگاروں کی صف میں اس لیے بھی نمایاں ہے کہ اس کے سب سے زیادہ افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ آغا گل کے فن کی بنیادی پہچان اس کے افسانوں میں بلوچستان کے لوکیل کی پیش کش اور یہاں کے ثقافتی و سماجی عناصر کی موجودگی ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کا خمیر بلوچستان میں پیش آمدہ حقیقی واقعات اور ان کی افسانوی تعبیر سے اٹھاتا ہے۔ اس کے بعض افسانوں میں کئی کردار ایسے ہیں جو حقیقی ناموں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی تصویر کشی کرتے

ہوئے آغا گل تلخ حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے واقعات کو اسی طور اپنے افسانوں میں پیش کر دیتا ہے جیسے وہ رونما ہوئے تھے۔ اس کے پہلے افسانوی مجموعے گوریچ کا پہلا افسانہ ''ٹرن ٹیبل'' اس کی مثال ہے۔ یہ افسانہ ایک حقیقی واقعے کے تناظر میں ہے۔ کوئٹہ کے رہنے والے اس افسانے میں پیش کیے گئے مرکزی کرداروں کو جانتے ہیں۔ اس لیے یہ افسانے کی بجائے ایک حقیقی یا سچی کہانی کی تعریف پر پورا اترتا ہے لیکن بلوچستان سے باہر کے وہ قاری اس کہانی کے پس منظر سے واقف نہیں ان کے لیے یہ ایک اچھا افسانہ ہو سکتا ہے۔

اس کے خیال میں بلوچستان کے وہی مسائل ہیں جو یہاں کے مردوں کو پیش آتے ہیں اور بلوچستان میں صرف وہی زندگی ہے جو یہاں کے مرد جیتے اور بھگتتے ہیں۔ بلوچستان کا احساسِ محرومی بھی صرف مردوں کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے اور انھیں کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔ بلوچستان کی عورت کا اپنے صوبے کے ان تمام مسائل سے اپنی ذات سے کوئی تعلق ہے۔ نہ ہی بلوچستان کی عورت اپنے ذاتی اور نجی مسائل رکھتی ہے، نہ اس کے جذبات و احساسات ہیں۔ جن کے اظہار پر سخت معاشرتی قدغن ہے اور وہ گھٹ گھٹ کے جیتی ہے اور اس کی بلوچستان کے سب سے بڑے یا اہم افسانہ نگار کو اس کی کہانیاں بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ امر باعث حیرت ہے کہ آغا گل کے افسانوں میں نسوانی کردار نہیں ملتے۔ بلوچستان کی محرومیوں اور دکھوں کی تمام داستان بھی وہ مرد کرداروں کے پس منظر میں بیان کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا بلوچستان میں خواتین نہیں رہتیں۔ کیا ان کے مسائل نہیں ہیں۔ یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اتنے بہت افسانے اور افسانوی مجموعوں کے باوجود اس کے کسی واحد افسانے کا مرکزی کردار کوئی عورت نہیں ہے۔ آغا گل کے مقابلے میں بلوچستان کے دوسرے افسانہ نگاروں مثلاً معین الحق، طاہر محمد خان، یعقوب شاہ غرشین وغیرہ کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ ان میں سے بعض لکھنے والوں کے کئی افسانوں میں تو مرکزی کردار عورت کے ہیں۔ بلوچستان ایک مکمل قبائلی اور جاگیردارانہ معاشرت کا حامل صوبہ ہے جہاں غربت اور جہالت نہتا درجے کی ہے۔ یہاں رہنے والی خواتین چاہے وہ بلوچ ہوں یا پٹھان زندگی بھر مختلف قسم کے مسائل اور تکالیف کا سامنا کرتی ہیں۔ ان کا جسمانی استحصال بھی ہوتا ہے، ان کے جنسی مسائل بھی ہیں اور وہ اپنے معاشرے میں کئی طرح سے عدم تحفظ کا شکار رہتی ہیں۔ ان سب حقائق کے باوجود آغا گل کے افسانوں میں بلوچستان کی چلتی پھرتی جیتی جاگتی عورت نظر آتی ہے، نہ ہی اس کے گوناگوں مسائل میں سے کوئی ایک مسئلہ اس کے افسانوں میں اپنی

جھلک دکھاتا ہے۔ یہ آغا گل کے افسانوں کا وہ کمزور پہلو ہے جس پر آج سے پہلے کوئی بات کی گئی ہے نہ اسے ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے ظاہراً منفرد اسلوب [جس کی بنیاد مقامی لہجے اور لفظیات کے تال میل پر ہے] اور بلوچستانی سماج وثقافت کی بھرپور پیش کش کے باوجود نسوانی کرداروں کی غیر موجودگی آغا گل کے فن میں ایسا خلا پیدا کرتی ہے جو اس کے فن پر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔

بلوچ ثقافت اور سماج کے بعض منفی پہلوؤں کی بھرپور عکاسی اور بلوچ مرد وزن کے کردار جس افسانہ نگار کے ہاں زیادہ تعداد میں نظر آتے ہیں وہ طاہر محمد خان ہے۔ بلوچستان کے قبائلی معاشرے میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خرابیاں بھی ملتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ غلط رسم ورواج بن گئے جو انسانوں کی زندگی کے لیے زہر قاتل ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک مثال کے طور پر شادی کے وقت عورت کا اپنے کنوار پن کا عملی ثبوت دینا ہے۔ دلہن کی رخصتی کے وقت اس کی کمر سے ایک سفید چادر باندھ دی جاتی ہے جسے شب عروسی میں اس کا خاوند کھولتا ہے اور شبِ زفاف کے بعد اس چادر کو خون آلود حالت میں اگلی صبح خاندان کی قریبی عورتوں کو دکھایا جاتا ہے۔ اگر چادر خون آلود نہ ہو تو عورت کو بدکردار سمجھا جاتا ہے۔ اسے خاوند یا اس کا باپ قتل کر دیتا ہے مگر قتل کرنے سے پہلے اس سے اس شخص کا نام پوچھا جاتا ہے جس نے خیانت کی تھی اور اس شخص کو بھی قتل کرنا لازم ہوتا ہے کہ یہ غیرت کا مسئلہ ہے۔ طاہر محمد خان کے دو مختلف افسانے ''زود پشیماں'' اور ''سالمی'' اس موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ ان دونوں افسانوں میں اس قبیح رواج کے دو مختلف بلکہ متضاد پہلو دکھائے گئے ہیں۔ افسانہ ''زود پشیماں'' میں اس کے مرکزی کردار چودہ پندرہ سالہ گل پری کو کنوار پن کھونے کے جرم میں اس کا باپ اپنے ہاتھوں سے ذبح کرتا ہے کہ اس نے سارے خاندان کی عزت ڈبوئی ہوتی ہے۔ اس میں حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ قتل سے پہلے جب وہ ایک الگ خیمے میں قید ہوتی ہے تب اس کی ماں بھی اس کی بات سننے یا اس سے ملنے کی روادار نہیں ہوتی ہے۔ خود ایک عورت اور ماں ہونے کے باوجود اس کی نظر میں گل پری کا جرم ناقابل معافی ہوتا ہے لہٰذا وہ کسی رحم کے قابل نہیں ہوتی۔ بلوچستان کی قبائلی عورت مردانہ معاشرت کے باعث جس تصورِ زندگی سے آشنا ہوتی ہے اور اس پر بلا چوں وچرا اپنے مردوں کی خواہش کے مطابق عمل پیرا ہوتی ہے وہ بذات خود ہولناک اور تعجب انگیز ہے۔ افسانہ ''زود پشیماں'' کی گل پری تو کنوار پن کھونے کے بعد اپنے باپ کی نظر میں بھی کسی نرم سلوک کی مستحق نہیں رہتی اور وہ خود اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کرتا ہے۔ افسانے ''سالمی'' میں بھی لڑکی شادی سے قبل کنوار پن گنوا چکی ہوتی ہے مگر اس کا دولہا چونکہ کراچی میں رہ کر تعلیم پا چکا ہوتا ہے۔ وہ اسے اس کے بچپن یا نوجوانی میں کیے گئے گناہ کی سزا نہیں دیتا اور سہاگ رات گزرنے پر

خون آلودہ چادر نہ دکھانے پر اپنے اوپر ''بند'' ہونے کا الزام لے لیتا ہے۔ بلوچستان میں اگر شب زفاف دولہا کارکردگی نہ دکھا سکے تو ضعیف الاعتقادی کی بدولت یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس مرد پر کسی نے تعویز گنڈا کر کے اسے ''بند'' کر دیا ہے۔ اس کا علاج بھی تعویز وغیرہ سے کیا جاتا ہے۔

افسانے ''سالمی'' میں دولہا ''بند'' ہونے کا کہہ کر اپنی بیوی کی عزت اور زندگی دونوں بچا لیتا ہے۔ اس افسانے میں طاہر محمد خان نے انسانیت کا جوہر نہایت خوبی سے اجاگر کیا ہے اور اس کا باعث انھوں نے تعلیم کو بتایا ہے۔ اس کے علاوہ بلوچستان کے دیہات میں خانہ بدوش لوگوں کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی زندگی کس قسم کی مشکلات سے دوچار ہوتی ہے۔ قصبوں اور شہروں سے دور پہاڑوں اور صحراؤں میں جہاں بعض اوقات صاف پانی کا حصول بھی آسان نہیں ہوتا، بیماریوں اور زچگی کے دوران مرد وخواتین کن صبر آزما مراحل سے گزرتے ہیں اور ان کے عزم اور حوصلے کتنے پختہ اور بلند ہوتے ہیں۔ طاہر محمد خان اپنے مختلف افسانوں میں ان موضوعات کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کرتے ہیں۔ بلوچستان کے وہ افسانہ نگار جو دیہاتی پس منظر رکھتے ہیں اور حصول تعلیم کے بعد بڑے شہروں میں مقیم ہوئے مگر یہ لوگ اپنے سماج اور دیہات سے تعلق برقرار رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ عام آدمی کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ان کی قوتِ مشاہدہ تیز اور دل حساس ہوتو وہ زیادہ بہتر فن پارے تخلیق کر سکتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ طاہر محمد خان کے افسانوں میں ایک قوی رجحان کے طور پر ہوتا ہے۔ وہ قبائلی میاں بیوی کے تعلقات اور ان کی ایک دوسرے سے بے تکلفی بھی بالکل فطری انداز میں اس طور دکھاتے ہیں کہ یہ کسی افسانے کا بیانیہ نہیں لگتا بلکہ یوں لگتا ہے جیسے زندگی اپنے حقیقی رنگوں میں جلوہ گر ہو اور قاری افسانہ پڑھتے ہوئے خود کو ان کرداروں کے درمیان موجود پاتا ہے۔ طاہر محمد خان کے افسانے نہ صرف بلوچستان کے معاشرتی ماحول، یہاں کے ثقافتی خدوخال اور رسم ورواج سے مملو ہیں بلکہ یہ کرداروں کے باطن میں اتر کر اہل بلوچستان کی باطنی شخصیت کے اہم عناصر سے روشناس کراتے ہوئے قاری کو بلوچستان شناسی میں مدد دیتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ لکھنے والے کی جڑیں اپنی زمین میں پیوست ہیں اور وہ کہانی کے پردے میں اہل زمین کے غم والم کو بیان کرنے کا ملکہ اور قدرت رکھتا ہے۔

بلوچستان کے افسانہ نگار اپنی تحریروں میں صرف بلوچستان کے سماج وثقافت کی عکاسی ہی نہیں کرتے بلکہ انسانی زندگی کے گوناگوں مسائل اور جدید زمانے کے آدمی کے اپنی دھرتی سے کٹتے ہوئے رشتوں سمیت مختلف

النوع موضوعات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس سے جہاں انکے جدید طرز فکر و احساس سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے وہاں اس سے ان کی جدید افسانے کے بدلتے ہوئے تناظر سے آگہی اور اس میں اپنے لیے گنجائش نکالنے کی کاوش بھی سامنے آتی ہے۔عرفان احمد بیگ کا شمار بلوچستان کے ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔اس کے افسانوں میں شہری زندگی کے مسائل، جدید انسان کی اداسی، جنسی بے اطمینانی و کجروی، عالمی گاؤں کے محصور انسان کے المیے، دنیا کے جنگی ماحول میں انسان کی بے توقیری وغیرہ کہانی کے روپ میں نظر آتے ہیں یا وہ ان موضوعات کو افسانے میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ اپنی کاوش میں کسی حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔یہ ایک قابل بحث موضوع ہے۔افسانہ اور فکشن لکھنا گزرے حقیقی واقعات کا من وعن بیان نہیں نہ ہی بعض حقیقی انسانوں کی تصویر کشی فکشن کہلاتا ہے۔عرفان احمد بیگ کے افسانوں میں ''مشرق''، ''گتے کے پہلوان''، ''سیڑھی پر رکھی آنکھ'' وغیرہ شہری زندگی کے مسائل پر لکھے گئے ہیں۔ان کے عنوانات سے بھی اندازہ ہوتا ہے۔مثلاً ''مشرق'' کا عنوان یہ بتاتا ہے کہ یہ افسانہ مشرقی شرم وحیا، رسم ورواج اور مشرقی اقدار کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔اس میں میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات زیر بحث لاتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ مشرق کے روایتی نظامِ فکر میں میاں بیوی ازدواجی تعلقات کے باوجود شرم وحیا کے جو تصورات رکھتے ہیں ان میں ان کے لیے روشنی میں ایک دوسرے کے جسم کو عریاں حالت میں دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔یعنی وہ ایک دوسرے کے جسمانی خدوخال نہیں دیکھ پاتے۔یہ افسانہ ایک ایسی عورت کا المیہ ہے جو چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اس کا جسم دیکھے اور اس سے لطف اندوز ہو اور اس کی خوبصورتی کو سراہے۔ وہ شادی سے قبل آئینے میں اپنا جسم دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہے لہٰذا فطری بات ہے کہ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ اس کے خوبصورت بدن کو دیکھتے ہوئے سراہے گا مگر اس کا شوہر رات کے اندھیرے میں اس کے قریب آتا ہے اور دن میں اس سے ایک طرح سے لاتعلق رہتا ہے۔آخر بیس سال بعد جب ان کے بچے جوان ہوتے ہیں اور اس کے شوہر پر فالج ہو جاتا ہے تب وہ بھی اپنے شوہر کا جسم دیکھتی ہے۔افسانہ نگار نے یہاں یہ نکتہ ابھارا ہے کہ میاں بیوی ہونے کے باوجود مشرق میں بسنے والے انسان ایک دوسرے کے جسم سے لطف اندوز نہیں ہوتے اور ایک دوسرے کے حسن سے حقیقتاً لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔افسانہ ''گتے کے پہلوان'' عالمی گاؤں کے ملکوں کی کہانی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جتنے ملک ایک دوسرے کے ساتھ باہم دست وگریباں ہیں۔ وہ دنیا کے سرمایہ دار اور طاقتور ترین ملک کے باعث ہیں۔امیر ملکوں کے ہاتھ میں غریب اور پسماندہ ملکوں کی ڈوریاں ہیں وہ جب اور جیسے چاہتے ہیں غریب ملکوں کو آپس میں لڑانا شروع کر دیتے ہیں۔افسانے میں دو بچوں

کے ہاتھ میں ''گتے کے پہلوان'' ہوتے ہیں اور وہ انھیں آپس میں لڑاتے ہیں۔ اگر چہ یہ اچھا موضوع ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ عرفان احمد بیگ سے افسانہ بن نہیں سکا۔ افسانہ ''سیڑھی پر رکھی آنکھ'' ایک ایسی پاگل عورت کا قصہ ہے جسے شہر کے لوگ عموماً دھتکارتے رہتے ہیں۔ پھر ایک دن سکول کی چھٹی کے موقع پر جب ایک پاگل کتا بچوں پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ پاگل عورت بچوں کو کتے سے بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتی ہے۔ وہ عورت جسے پاگل کہا جاتا ہے انسانی بچوں کو بچاتے بچاتے خود ہلاک ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ پاگل کون ہوتا ہے وہ عورت جسے پاگل کہا جاتا ہے یا معاشرہ جو اسے پاگل کہتا ہے۔ اسے پاگل بنانے میں بھی تو معاشرے کا کردار ہوتا ہے۔ آخر میں وہ اپنی قربانی دے کر یہ ثابت کر جاتی ہے کہ وہ ہرگز پاگل نہ تھی بلکہ اس میں انسانیت رحم دلی اور محبت کی لہریں دوڑ رہی تھیں مگر معاشرہ اسے سمجھ نہیں پایا۔ عرفان احمد بیگ نے اپنے افسانہ ''ذرا سی بات'' میں تقسیم ہند سے پہلے کا زمانہ دکھاتے ہوئے انگریز حاکموں کے رویے کو موضوع بنایا ہے۔

اس میں ایک انگریز آفیسر کی بیوی کا نیکلس گم ہو جاتا ہے جس کی تلاش میں سارے شہر کو ایک طرح سے ادھیڑ دیا جاتا ہے۔ انگریز جس رعب اور دبدبے کے ساتھ ہندوستان میں حاکم رہے وہ اب تاریخ کا حصّہ ہے۔ انھوں نے شاید ہی دنیا کے کسی حصّے پر اس طور حکمرانی سے لطف اٹھایا ہو جیسا کہ ہندوستان میں انھیں موقع ملا۔ ہندوستان نہ صرف اجناس اور قیمتی اشیاء سے پر تھا بلکہ ایک سرسبز و شاداب خطہ بھی۔ پھر یہاں دولت کے انبار تھے۔ مغل حکمران ہوں یا مختلف ریاستوں کے نواب اور شہزادے یہ لوگ سونے اور ہیرے جواہرات سے مالا مال تھے۔ انگریز نے نہ صرف ان کا علاقہ ان سے چھینا بلکہ ان کی دولت اور ملک کی دولت پر بھی آسانی سے ہاتھ صاف کیا اور خود تعیش کی زندگی بسر کی۔ انگریز انگلستان سے روزگار کی خاطر ہندوستان آتے اور یہاں حکومتی مشینری کا حصّہ بنتے ہی ان کی چال ڈھال اور طرز زندگی مکمل طور پر بدل جاتا۔ وہ خود اعلیٰ لباس زیب تن کرتے اور بہترین بنگلوں میں مقیم ہوتے۔ ان کی بیویاں بھی سرخ و سپید رنگت ہونے کی وجہ سے اکثر بے انتہا خوبصورت ہوتی تھیں۔ اپنے شوہروں سے لاڈ پیار کر کے ہر طرح کی سہولیات اور زیورات حاصل کرتیں اور زندگی سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ نیکلس انگریزی زیورات کی ایک خاص قسم ہے جس میں ایک لمبی چین ہوتی ہے اور اس کے درمیان ایک بڑا موتی یا ہیرا جڑا ہوتا ہے جو یہ نیکلس پہننے والی خاتون کے سینے پر آویزاں ہوتا ہے۔ یہ زیور بے انتہا امیر اور دولت مند یا پھر حاکم طبقے کی خواتین استعمال کرتی تھیں جن سے دیکھنے والوں کو فوراً پتہ چل جاتا کہ اس خاتون کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہے اور یہ زیورات کا نفیس ذوق رکھتی ہے۔ گویا نیکلس صرف زیور ہی نہیں تھا بلکہ یہ ایک اعلیٰ طبقے اور اس کے طرز زندگی کی

علامت تھا۔ افسانے میں نیکلس گم ہونا بتایا جاتا ہے جس سے سارے شہر پر ایک طرح سے بھونچال آ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکلس صرف ایک ہیرا یا قیمتی پتھر نہیں تھا بلکہ یہ اعلیٰ حاکم طبقے کے اقتدار اور اثر و رسوخ کا گم ہونا تھا۔ اس لیے انگریز افسر باقی تمام کام چھوڑ کر اپنی بیوی کے نیکلس کی تلاش کے لیے نکل پڑتا ہے۔ اسے شاید یہ خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں دیسی لوگ اب اس قدر جرأت مند تو نہیں ہو گئے کہ وہ انگریزوں کے پر تعیش ساز و سامان پر نگاہِ غلط انداز ڈالیں۔ ایسی صورت انھیں کس طرح قبول ہو سکتی تھی۔ اس لیے جب تک نیکلس مل نہیں جاتا وہ چین سے نہیں بیٹھتا اور نیکلس اس افسر کی بیوی کے لباس میں ہی ہوتا ہے۔ انگریزی لباس بھی کر وفر کی علامت ہوتا ہے۔ کسی دیسی آدمی کا اُسے چھونا بھی انگریز حاکموں کے عتاب کو دعوت دینا تھا۔ اس کے دیسی ملازموں کو یہ جرأت بھلا کب ہو سکتی تھی۔ افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک غلط فہمی کی بناء پر بھی انگریز سارے شہر پر عذاب کی صورت حال مسلط کر دیتے تھے اور ایک چھوٹی سی چیز جو کہ انھوں نے ہندوستانیوں کے استحصال کر کے بنائی تھی کی گمشدگی شہر کے تمام لوگوں کے لیے اذیت بن جاتی تھی۔ افسانے میں تقسیم ہند سے پہلے کے زمانے میں ہندوستانی شہریوں پر انگریزی حکومت اور ان کے رویے کو خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

بلوچستان کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کل پاکستان کے سینتالیس فیصد حصّے پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود یہاں زیادہ تعداد میں بڑے شہر نہیں ملتے۔ لے دے کر ایک کوئٹہ ہے جو صوبے کا دارالخلافہ بھی ہے اور سب سے بڑا شہر بھی کوئٹہ پاکستان کے بڑے شہروں یعنی لاہور، کراچی اور راولپنڈی تو ایک طرف رہے، پشاور اور فیصل آباد وغیرہ سے بڑا بلکہ ان کے برابر کا بھی نہیں ہے۔ کوئٹہ کے علاوہ جو باقی شہر ہیں یعنی ژوب، لورالائی، چمن، خضدار، پنجگور اور تربت وغیرہ انھیں قصبے یا قصباتی شہر کہنا مناسب ہوگا۔ ان کے علاوہ بلوچستان کا بھی نوے فیصد علاقہ چھوٹی چھوٹی بستوں اور دیہات پر مشتمل ہے جو طویل خشک پہاڑی سلسلوں اور صحراؤں میں گھرے ہوئے ہیں جہاں کہیں کہیں قدرتی چشمے، چھوٹے دریا، برساتی نالے ہیں جن کے کناروں پر آبادی کے نشان ملتے ہیں یا چھوٹے چھوٹے باغات ہیں۔ بلوچستان کی تقریباً ستر فیصد آبادی بھی ان دیہات اور چھوٹی بڑی بستیوں میں مقیم ہے۔ ان علاقوں میں آج بھی زندگی کی بنیادی سہولیات نہیں ملتیں یعنی پینے کا صاف پانی، دوا، علاج، تعلیم کے لیے مناسب سکول و کالج، بجلی بھی محض دو چار گھنٹے کے لیے مہیا ہوتی ہے۔ ایسے دیہی علاقوں میں رہنے والے لوگ مذہبی طور پر راسخ العقیدہ اپنے قبائلی رواج پر کاربند اور جہالت کے باعث کئی قسم کے توہمات کے شکار ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے ذاتی، قبائلی اور معاشرتی مسائل ہوتے ہیں اور وہ صدیوں سے ان

مسائل کا شکار چلے آتے ہیں۔ بلوچستان کے ان دیہات کی فضا ان میں بستے ہوئے کردار اور ان کے مسائل عکس یعقوب شاہ غرشین کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ غرشین نے اپنے فن کی بنیاد دیہی پس منظر کے حامل مسائل کے بیان پر رکھی ہے۔ وہ خود بھی چونکہ دیہی پس منظر رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ان علاقوں کے مسائل اور یہاں کی ثقافتی روح سے گہری شناسائی رکھتا ہے۔ اس لیے جب وہ افسانہ لکھتا ہے تو ان علاقوں میں بستے ہوئے لوگوں کی عکاسی نہایت باریک بینی سے کرتا ہے مثلاً اس کا افسانہ ''آخری آنسو'' بلوچستان میں گزشتہ کئی دہائیوں سے جاری خشک سالی کی اندوہناک حالت کو نمایاں کرتا ہے۔ کس طرح بستے ہوئے گھر، بستیاں خشک سالی کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ قدرتی چشمے خشک ہونے پر کیسے کیسے شاداب اور سرسبز باغ ویرانے بن گئے اور لوگ کن اذیتوں کا شکار ہو گئے۔ یہ سب غرشین کا اثر انگیز قلم نہایت بے باکی مگر ہنرمندی سے بیان کرتا ہے۔ ''آخری آنسو'' میں خشک سالی کے باعث گھرانے کے سب افراد ایک ایک کر کے ہلاک ہو جاتے ہیں آخر میں ماں اور اس کا شیر خوار بچہ تنہا رہ جاتے ہیں۔ ان کا پانی بھی ختم ہو جاتا ہے تو ماں اپنے بیٹے کو لے کر پیدل چل پڑتی ہے۔ دور دور تک آبادی کا نشان ہوتا ہے نہ کہیں پانی ملتا ہے۔ ماں ممتا سے مجبور ہو کر رونا چاہتی ہے تو اس کی آنکھیں خشک اور ویران ہوتی ہیں اور ان میں ایک آنسو تک نہیں ہوتا۔ وہ بڑی کوشش سے اپنی آنکھوں کا آخری آنسو جب بچے کے حلق میں ٹپکاتی ہے تو اس وقت بچہ راستے میں پیاس سے ہلکان ہو کر دم توڑ دیتا ہے۔ یوں یہ افسانہ ایک خاص علاقے میں قدرت کی بے رحمی اور انسان کی بے چارگی کی داستان عمدگی سے بیان کرتا ہے۔

یعقوب شاہ اپنے افسانے ''بڑھاپا'' میں ایک نہایت دلچسپ مقامی کردار تخلیق کرنے میں مامیاب ہوا ہے۔ اس افسانے کو کرداری افسانہ کہنا مناسب ہوگا۔ یہ کردار ایک بوڑھے آدمی ''دادا جان'' کا ہے جو اپنے خاندان میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور گھر کے تمام فیصلے وہ ہی صادر کرتا ہے۔ یہ دادا جان اپنے ایک مقروض سے تین سو روپے لینے کی خاطر ایک حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اور اس پر لاکھ روپے کا خرچ اٹھ جاتا ہے مگر روبصحت ہونے پر وہ دوبارہ اپنا قرض لینے مقروض کی طرف جانا چاہتا ہے اس کے بیٹے بڑی مشکل سے ڈاک خانے والوں سے ملی بھگت کر کے اپنے دادا جان کو اس مقروض کی طرف سے اس کے تین سو روپے لٹانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ جب وہ تین سو روپے وصول کرتا ہے تو اسے چین آتا ہے۔ بلوچستان کے ایسے بوڑھے اپنی حقیقی زندگی میں چھوٹی چھوٹی اشیا اور رقم کو نہایت عزیز رکھتے ہیں۔ وہ ایک خاص طرح کی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور ضدی بھی۔ اپنی ہٹ دھرمی کے باعث وہ کئی غلط فیصلے بھی کرتے ہیں مگر بلوچستان کے روایتی معاشرے میں گھر کے بڑے سے اختلاف نہیں کیا جاتا

جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ لوگ ہر وقت اپنی من مانی کرتے ہیں۔غرشین نے اس افسانے میں یہ مقامی کردار تخلیق کر کے ایسے لوگوں کی خوب تصویر کشی کی ہے۔اس کا یہ کردار مقامیت سے منصف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت میں ایسے پہلو بھی رکھتا ہے جو کہیں بھی ہو سکتے ہیں یا کسی بھی علاقے کے بوڑھے شخص میں ہو سکتے ہیں۔ بلوچستان کے افسانہ نگار اس طرح اپنی دھرتی ،ثقافت اور مزاج کے مختلف لوگوں کو اپنی تحریروں میں نمایاں کرتے ہوئے دوسرے علاقوں سے اپنی تخلیقات میں ایک جداگانہ تشخص قائم کرتے ہیں جو صرف انہی سے منسوب ہے۔

بلوچستان کے جن افسانہ نگاروں کے ہاں یہاں کے ثقافتی اور جغرافیائی خدوخال نہیں ملتے اور وہ شہری معاشرے کے مسائل کو اپنے افسانوں میں نمایاں کرتے ہیں۔ایسے لوگوں میں عارف ضیا اور ہاشم ندیم کے نام آتے ہیں۔ یہ لوگ شہری زندگی کے مختلف مسائل اور رنگوں کو اپنی تحریروں میں اُجاگر کرتے ہیں مثلاً غربت، استحصال، جنسی بے راہ روی، جہالت اور نفسیاتی مسائل وغیرہ۔ان کے افسانے پڑھتے ہوئے احساس نہیں ہوتا کہ یہ بلوچستان میں تخلیق ہونے والا ادب ہے یا ملک کے کسی دوسرے حصّے کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلوب اور مواد کی سطح پر یہ اردو افسانے اور ان کے کردار عمومیت رکھتے ہیں۔ان کے کردار بھی شہری ہیں اور ان کے اردگرد کا ماحول بھی چند افسانوں میں تو لاہور اور کراچی کے بعض علاقوں کا تذکرہ بھی آتا ہے۔آدمی پسماندگی سے اٹھ کر کے خوشحالی کا سفر طے کرتا ہے اور پھر حالات اُسے کیسے واپس افلاس کی طرف لے جاتے ہیں۔اس نوع کی کہانیاں ان افسانہ نگاروں کے ہاں ملتی ہیں یا پھر ادیبوں کی باہمی چپقلش کیا گل کھلاتی ہے یا ایک نئے ابھرتے ہوئے قلم کار یا افسانہ نگار کو سینئر لکھنے والوں سے کس طرح کے سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ذاتی محرومیاں لوگوں کو کس طرح غلط راہوں پر چلنے پر مجبور کرتی ہیں۔ان سب عناصر کی عکاسی ان افسانہ نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔اگر ان کے ہاں کچھ نہیں ملتا تو وہ بلوچستان اور اس کے ثقافتی رنگوں کی دھنک۔

بلوچستان کا مسئلہ کیا ہے اور کیا اس کا بلوچستان فکشن میں ظہور ہوا ہے۔اس سوال پر تفصیلی نظر ڈالنا ضروری ہے جیسا کہ اس مقالے کے باب اوّل میں تفصیل سے بتایا گیا ہے بلوچستان کی قدیم تاریخ بہت پرانی ہے۔ ریاست قلات میں ایک نیم خودمختار ریاست کی صورت میں ساڑھے تین سو سال سے زائد تک قائم رہی ہے۔اس ریاست میں ترقی کا دور اس وقت شروع ہوا جب انگریز یہاں انیسویں صدی کے آخر میں آئے اور انھوں نے یہاں نئے شہر بسائے ، دفاتر اور تعلیمی ادارے تشکیل دیے۔انہی تعلیمی اداروں کے طفیل بیسویں صدی کے اوائل میں

بلوچستان کی پہلی تعلیم یافتہ نسل نمودار ہوئی۔ جدید تعلیم سے بہرہ ور اس نئی نسل کو اپنے وطن پر غیروں یعنی انگریزوں کا اقتدار ناپسند تھا۔ وہ ریاست قلات کے خان کی طرزِ حکمرانی سے بھی مطمئن نہیں تھی۔ اس نسل میں شامل نوجوانوں نے یہاں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ان لوگوں میں یوسف عزیز مگسی، عبدالعزیز کرد، فیض محمد یوسفزئی، عبدالصمد خان اچکزئی اور دوسرے کئی لوگ شامل تھے۔ ان لوگوں کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ بلوچستان کے لوگوں کو سیاسی اور سماجی حقوق دیے جائیں اور بلوچستان کو صوبے کا درجہ دیا جائے۔ یہاں شخصی حکمرانی کا رواج ختم کیا جائے اور جمہوریت لائی جائے۔ اس دوران ہندوستان بھر میں مسلم لیگ کے تحت قیام پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ بلوچستان میں بھی لوگ دو دھڑوں میں تقسیم تھے۔ یہاں مسلم لیگ کے قیام کے بعد جو مقامی مسلم لیگی راہنما تھے وہ بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کے حامی تھے۔ ان کے برعکس کانگریس میں شامل لوگ بلوچستان کو بھارت میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ بالآخر بلوچستان کے شاہی جرگے نے بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کے حق میں فیصلہ دیا اور بلوچستان پاکستان کا حصّہ بن گیا۔ اس میں برٹش بلوچستان کا علاقہ شامل تھا اور ریاست قلات جو چار ذیلی ریاستوں پر مشتمل تھی ضم ہو کر ایک خطہ کی صورت سامنے آیا۔ اس علاقے کو ۱۹۷۳ء میں صوبے کا درجہ دے دیا گیا۔ بلوچستان کو صوبے کا درجہ ملنے کے باوجود یہاں پسماندگی بہت زیادہ تھی مگر یہ معدنیات سے مالا مال تھا کچھ معدنیات نکالی جانے لگیں جیسے سوئی گیس وغیرہ۔ بلوچستان سے سوئی گیس نکلنے کے بعد یہ کراچی، لاہور، اسلام آباد اور ملک کے دیگر دور دراز علاقوں کو مہیا کی گئی مگر کوئٹہ سمیت بلوچستان کے ہر علاقے کو اس سے محروم رکھا گیا۔ اس طرح کے بعض دیگر اقدامات کے باعث بلوچستان کے لوگوں میں احساسِ محرومی پیدا ہوا۔ اس وجہ سے یہاں قوم پرست پارٹیوں کو عوام میں پذیرائی ملی اور ان کا صوبائی حقوق کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ وفاق کی طرف سے صوبائی حقوق کے مطالبے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا جس کے باعث وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے قوم پرست سیاسی راہنماؤں کے مزاج میں درشتی کا عنصر بڑھنے لگا اور وہ اپنے زیرِ اثر لوگوں کو یہ بتانے لگے کہ وفاق کا رویہ ہمارے صوبے کے ساتھ دشمن کا ہے۔ اسی وجہ سے وفاق اور دوسرے صوبوں بالخصوص پنجاب کو دشمن قرار دیا جانے لگا۔ یہی وہ نفرت تھی جو سینوں میں پکتے پکتے اکیسویں صدی کے آغاز میں ایک لاوے کی طرح پھٹ پڑی۔ پاکستان کے دشمن ملک تو جیسے اس موقع کے انتظار میں تھے۔ انھوں نے بلوچستان میں انتشار اور بدامنی کو ہوا دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک زمانے میں مثالی امن کا حامل یہ صوبہ آج بدامنی کی لپیٹ میں ہے۔ سن مسئلہ بلوچستان کے تناظر میں صوبے میں موجود بے چینی اور معاصر صورت حال کو آغا گل، عابد میر اور آج کے بعض نئے لکھنے والوں نے اپنے افسانوں اور

کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ عابد میر کی پہلی کتاب اگر چہ یونیورسٹی میں ہونے والی ناکام محبت کی روداد پر مشتمل ہے مگر اس کے بعد کے دو مختصر افسانوی مجموعے جنگ محبت اور کہانی اور سرخ حاشیے بلوچستان کے سیاسی وسماجی انتشار، بدامنی اور وہاں ہونے والی مسلح بغاوت کو موضوع بناتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں شامل افسانے مختصر اور مختصر ترین افسانے ہیں۔ ان کی قرأت سے بلوچستان کے حساس نوجوانوں کے جذبات اور برسرزمین رونما ہونے والے المیوں سے براہ راست آگاہی ہوتی ہے۔ بعض کہانیوں کے پس منظر میں سچے واقعات کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کہانیاں حقیقت نگاری کے رجحان کی عکاسی کرتی ہیں۔ عابد نے معاشرتی حقائق کے بیان میں اپنے اسلوب کو مقامیت آشنا کرتے ہوئے ایک خاص طرح کی انفرادیت اجاگر کی ہے۔ مثلاً وہ ایک دوسطری افسانے میں لکھتا ہے:

بلوچ اتنے شر پسند کیوں ہیں؟

کیوں کہ بلوچ کے لیے ''شر'' اچھا ہے اس لیے وہ شر کو پسند کرتا ہے۔ ۷۷

یعنی بلوچی زبان میں لفظ ''شر'' کے معنی ''اچھا'' کے ہیں۔ اس طرح عابد بلوچی کے یک لفظی استعمال سے اپنے اردو افسانے میں نئے معنی پیدا کرتا ہے۔ آج کے حالات کے تناظر میں بلوچستان کے قریباً ہر شہری کو ریاستی اداروں کے اہلکار شکوک اور اجنبی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بلوچستان کے لوگ صدیوں سے نسل بہ نسل اپنی زمین اور اپنے علاقے سے گہری وابستگی اور انس رکھتے ہیں۔ ان کے لیے اس قسم کے حالات ناقابل برداشت ہیں۔ اس تمام منظرنامے میں عابد کا ذومعنی جملہ ''ہر بلوچ شر پسند ہے'' ایک پوری حکایت کو بیان کرتا ہے اور خوبصورت انداز میں برسرزمین حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ نہ صرف قرات کا لطف دوبالا کرتا ہے بلکہ اس کی تہہ میں جو رمز پوشیدہ ہے وہ غور وفکر کا کافی سامان مہیا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے جملے بلوچستان کے اردو فکشن میں بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بلوچستان میں لکھے گئے اردو فکشن کے تنقیدی مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے تخلیق کار جدید افسانہ نگاری کے فن سے زیادہ واقف نہیں۔ وہ آرٹ اور کرافٹ پر توجہ نہیں دیتے۔ سیدھے سبھاؤ میں کہانی لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی کہانی کار اگر فطری ملکہ سے متصف ہے تو اس کے ہاں بے عیب اور تخلیقی اپج کے حامل جملے مل جاتے ہیں۔ عابد کے ایک اور ہمعصر اسرار احمد شاکر کے ہاں کسے کسائے جملے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسرار شاکر کے موضوعات جاگیردارانہ سماج میں ہونے والے طبقاتی مسائل، غربت اور استحصال وغیرہ ہیں۔ اس کے افسانوں

کے کردار بھی دیہی معاشرت کے ہیں۔اس کے افسانے بلوچستان کے دیہات کی فضا سے لیے ہوئے ہیں۔البتہ اس کے افسانوں میں پیش کردہ منظر نامہ پنجاب کے دیہات سے بہت مختلف ہے اور اس کے اپنے مسائل ہیں۔ان مسائل کے بیان میں اسرار احمد شاکر کا انداز بھی اپنا ہے۔وہ اپنے جملوں میں مقامی زبانوں کی لفظیات سے ایک نئے آہنگ کی تشکیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔کہیں تو وہ اس میں کامیاب ہوتا نظر آتا ہے مگر کہیں کہیں یہ مقامی لفظیات عبارت میں اچھی طرح رچ بس کر سامنے نہیں آتی ہیں۔اس وجہ سے اس کی تحریر میں بعض جگہ کمزوری کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے بعض افسانے بہت اچھے تو بعض خاصے کمزور ہیں۔مقامیت کا عنصر نسیم جاوید کے افسانوں میں حاوی رجحان کے طور پر نظر آتا ہے۔اس کے نہ صرف موضوعات مقامی ماحول اور سماج سے متعلق ہیں بلکہ اس کے کرداروں کی اٹھان اور تشکیل میں بھی مقامی رنگ بہت نمایاں ہیں۔افغانستان میں ہونے والے جہاد کے نتیجے میں افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کوئٹہ اور مضافات میں آباد ہوئی۔ان مہاجرین کی آمد سے بلوچستان کے سماج پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔اس کا عکس نسیم جاوید کے افسانے ''برادر مسلمان'' میں بخوبی نظر آتا ہے۔نسیم جاوید کے دیگر افسانے غربت، معاشی استحصال اور صوبے میں موجود بدامنی کو بہ طور خاص موضوع بنایا ہے۔نسیم جاوید کی زندگی پر گہری نظر ہے اور اُسے کہانی بیان کرنے کا قرینہ بھی آتا ہے۔اس لیے اس کے افسانے قاری پر ایک گہرا تاثر ڈالتے ہیں۔وہ شستہ اور بامحاورہ زبان لکھتا ہے اس کی تحریر اپنے اسلوب میں سادہ ضرور ہے مگر یہ نثر کافی جاندار ہے۔بعض اوقات مقامی الفاظ اور لہجے کے استعمال سے وہ اپنے افسانوں کے لسانی ڈھانچے کی تعمیر کرتا ہے۔نسیم جاوید کے مقابل اس کا ایک اور ہمعصر کہانی کار مصطفیٰ شاہد اپنے افسانوں میں عالمی موضوعات بھی زیر بحث لاتا ہے۔یوں دیکھا جائے تو بلوچستان کا افسانہ نگار مقامی موضوعات کے ساتھ ساتھ عالمی مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کرتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ افسانہ ''انصاف'' ،ہفت روزہ پاسبان،کوئٹہ، ۲۸ نومبر ۱۹۳۹ء ص ندارد

۲۔ افسانہ ''مہاجن'' ، ایضاً، ۱۲ فروری ۱۹۴۰ء ص ندارد

۳۔ مبارکہ حمید، بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ،نوید پبلشرز،کوئٹہ،۲۰۰۱ء، ص ۴۴

۴۔ ایضاً،ص ۴۵

۵۔ انور رومان،رومانیے ،سیرت اکادمی بلوچستان،کوئٹہ،۲۰۰۱ء،ص ۲۸۹

۶۔ ایضاً،ص ۲۹۳-۲۹۴

۷۔ ایضاً،قمقمے ،قلات پبلشرز،۱۹۷۷ء،پس سرورق

۸۔ ایضاً،ص ۳۰

۹۔ ایضاً،ص ۳۳

۱۰۔ اختر واحد قاضی،مرتب: وادیء بولان میں ،جے.جی اسٹیشنرز،کوئٹہ،۱۹۵۵ء ص ۳

۱۱۔ خلیل احمد،سید،خمار زہر آلود قلات پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۶۸ء ص ۵۴

۱۲۔ ایضاً،ص ۱۱

۱۳۔ رفعت زیبا،چاند کا زہر،قلات پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۷۳ء،ص ۸۸

۱۴۔ ایضاً،ص ۸۹

۱۵۔ ایضاً،ص ۹۲

۱۶۔ ایضاً،میرے زخم بکتے ہیں پائلٹ ایجوکیشنل پراڈکٹس،لاہور،۲۰۰۳،۶۹

۱۷۔ مبارکہ حمید،ص ۱۲۶

۱۸۔ بخاری،شاہین روحی، کاغذ کا بدن قلات پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۸۱ء ص ۹۳

۱۹۔ مبارکہ،ص ۱۳۷،۱۳۸

۲۰۔ فاروق احمد،ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو زبان وادب،بولان اکیڈمی،لاہور،۱۹۹۸ء،ص ۱۸۵

۲۱۔ بخاری، شاہین روحی، ص ۸، ۹

۲۲۔ معین الحق، تاریکیاں، محمدی پبلشنگ کمپنی، کوئٹہ، ۱۹۸۲ء، ص ۳۳

۲۳۔ مبارکہ حمید، ص ۱۱۸

۲۴۔ معین الحق، تاریکیاں، ص ندارد۔ یہ بات محمد صدیق نے اپنے دیباچے میں لکھی ہے، جس پر صفحہ نمبر درج نہیں۔

۲۵۔ خادم مرزا، سات رنگ اور ایک گیان ناشاد پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۹۷ ص ۳۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۷۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۷۶

۲۸۔ ایضاً، ص ۷۳

۲۹۔ فاروق احمد، ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو زبان و ادب بولان اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۸ ص ۱۹۵س

۳۰۔ خواجہ محمد ذکریا (مرتب)، کلیاتِ مجید امجد الحمد پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ ص ۸۹

۳۱۔ آغا گل، گوریچ، دی ٹائمز پریس، کراچی، ۱۹۹۴ ص ۱۹

۳۲۔ طفیل اختر، اب تک، پرائم ٹائم پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۲۱

۳۳۔ ایضاً، ص ۶۸

۳۴۔ ایضاً، راسکوہ مکتبہ الحمرا، لاہور ۲۰۰۲ ص ۹۷

۳۵۔ طفیل اختر، ص ۶۹

۳۶۔ ایضاً، ص ۷۱

۳۷۔ قاضی، فردوس انور، ڈاکٹر، آخری ٹرین ابلاغ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ ص ۲۵۴

۳۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ؛ ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ ص ۶۲۲

۳۹۔ قاضی، فردوس انور، ص ۲۹۲

۴۰۔ خان، طاہر محمد، زود پشیماں قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۰۴ ص ۳۱

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۰، ۱۱

۴۲۔ ایضاً،ص۱۴

۴۳۔ ایضاً،ص۹۳

۴۴۔ جمیل زبیری،زرد پتے ،مکتبہ ارباب قلم،کراچی،۱۹۷۸ء،ص۵

۴۵۔ محسن سلطان، خود سے چھپا اداس آدمی ،ناشاد پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۹۳ء،ص۱۶

۴۶۔ ایضاً،ص۶

۴۷۔ فاروق احمد،ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو زبان و ادب قلات پریس،کوئٹہ،۱۹۹۸ءص۲۱۴

۴۸۔ بیگ،عرفان احمد، گتے کے پہلوان ،الحمد پبلشرز،لاہور،ص۱۴

۴۹۔ ایضاً،ص۱۷

۵۰۔ غرشین،یعقوب شاہ،آخری آنسو،قلات پبلشرز،کوئٹہ،۲۰۰۳ص

۵۱۔ حمید شاہد،محمد،اردو فکشن ؛ نئے مباحث،مثال پبلشرز،فیصل آباد،۲۰۱۶ءص۳۵۴

۵۲۔ عارف ضیاء،اندر کا آدمی ،کوثر بک ڈپو،کوئٹہ،۲۰۱۰،ص۱۵

۵۳۔ ایضاً،ص۱۹

۵۴۔ ایضاً،ص۲۵

۵۵۔ ایضاً،ص۲۹،۳۰

۵۶۔ ہاشم ندیم،صلیبِ عشق ،علم وعرفان پبلشرز،لاہور،۲۰۱۱،ص۱۷

۵۷۔ عابد میر،جنگ ، محبت اور کہانی ،مہردر،کوئٹہ،۲۰۱۱ص۸

۵۸۔ ایضاً،ص۱۰۴

۵۹۔ ایضاً،سرخ حاشیے ،مہردر،کوئٹہ،۲۰۱۳پس ورق

۶۰۔ ایضاً،ص۸۳

۶۱۔ شاکر،اسرار احمد، میرے بھی کچھ افسانے ،مہردر،کوئٹہ،۲۰۱۵ص۶

۶۲۔ ایضاً،ص۲۴

۶۳۔ ایضاً،ص۱۳

۶۴۔ نسیم جاوید، واپسی کا سفر، بزم خسرو پاکستان، کوئٹہ، ۲۰۱۵ء، ص۵۹

۶۵۔ حمید شاہد، محمد، ص۳۵۵

۶۶۔ مصطفےٰ شاہد، آخری صفحہ، ہزارگی اکیڈمی، کوئٹہ، ۲۰۰۹ء، ص۲۴

۶۷۔ ایضاً، ص۳

۶۸۔ زیب لونی، جلتے خواب، العارف پرنٹنگ پریس، کوئٹہ، ۲۰۱۶ء، ص۱۶

۶۹۔ ایضاً، ص۱۱۱

۷۰۔ آغا گل، ''ڈوبتے جہاز میں کھڑا آخری لشکری''، مشمولہ، تھوڑا سا پانی، ص۱۱

۷۱۔ محمد حمید شاہد، ''انجیر کے پھول''، مشمولہ، انجیر کے پھول، ص۵

۷۲۔ آصف فرخی، ''مزاحمت کی درسیات؛ بلوچستان کے افسانے کا ایک مطالعاتی تناظر''، مشمولہ، انجیر کے پھول، ص۱۷۸، ۱۷۹

۷۳۔ ادارے کی یاداشت، مشمولہ، ہماری کی بیٹی، ص۵

۷۴۔ خلیل صدیقی، قمقمے، انور رومان، قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۷۷ء، پس ورق

۷۵۔ خادم مرزا، سات رنگ اور ایک گیان، ص۳۱

۷۶۔ ایضاً، ص۷۶

۷۷۔ عابد میر، سرخ حاشیے، ص۴۲

باب چہارم:

بلوچستان میں اُردو ناول

(قیامِ پاکستان کے بعد)

ناول کی ابتداء:

کہانی اور قصے کی شروعات اس وقت ہوئیں، جب انسان نے ارتقاء اور شعور کی ابتدائی منزلوں سے گزرتے ہوئے معاشرتی زندگی تشکیل دی۔ مصروف دن کی تھکان اتارنے کے لیے جب وہ شام کو کسی الاؤ کے گرد ایک گروہ کی شکل میں بیٹھتا، تو دن بھر کا احوال پہلے پہل سادہ انداز میں اور پھر رفتہ رفتہ مناسب رنگ آمیزی سے اپنے ہمجولیوں کو سناتا۔ روزمرہ کی اس داستان گوئی نے اس کے تخئیل کو مہمیز دی اور اس نے واقعات کے بیان میں مبالغے سے کام لینا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ زبان پر مہارت حاصل کرتے ہوئے اس نے اپنی گفتگو میں تشبیہ اور استعارے کو چلن دیا، اور عام کرداروں کے ساتھ ساتھ مافوق الفطرت عناصر بھی تخلیق کیے۔ ہر زبان میں ایسی پرانی کہانیوں کا ذخیرہ لوک ادب اور مذہبی روایات کی شکل میں آج بھی موجود ہے، جو قصے کے ارتقاء کے اولین باب کی کہانی سناتا ہے۔ لوک ادب اور مذہبی روایات نے ہی طویل داستانوں کو رواج دیا اور یہیں سے داستان گوئی کا فن پیدا ہوا، جو ترقی کرتے کرتے ناول پر منتج ہوا۔ جس طرح جدید معاشرے اور ترقی یافتہ صنعتوں کی ابتداء مغرب سے ہوئی، بالکل اسی طرح جدید کہانی ناول کے روپ میں مغرب میں ہی سامنے آئی۔ شروع میں اسپینش اور اطالوی زبانوں میں ناول لکھے گئے اور ان کے تراجم انگریزی میں ہوئے، جن سے متاثر ہو کر انگریزی میں بھی ناول کے فن کی ابتداء ہوئی۔ اٹھارویں صدی کی ابتداء میں لکھے گئے ڈینیل ڈیفو کا رابنسن کروسو، جوناتھن سوفٹ کا گلیور کا سفرنامہ اور رچرڈسن کا پامیلا انگریزی کے اولین ناول کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی میں اچھے اور عمدہ ناولوں اور ناول نگاروں کی ایک کھیپ سامنے آئی، ان سب کا تذکرہ یہاں ضروری اور ممکن نہیں ہے۔ انگریزی ناول کے چند اہم ناموں میں جین آسٹن، چارلس ڈکنز، ٹامس ہارڈی، ڈی، ایچ لارنس اور جیمس جوائس وغیرہ شامل ہیں۔

ناول کے عناصر ترکیبی:

پلاٹ، کردار، مکالمہ اور منظر نگاری ناول کے بنیادی عناصر کہلاتے ہیں۔ جدید ناول میں اگر چہ ان عناصر یا ان میں سے کسی کی موجودگی لازمی نہیں سمجھی جاتی، تاہم یہ سب یا ان میں سے کوئی عنصر ہر ناول میں لازمی طور پر موجود ہوتا ہے۔

ا۔ پلاٹ

ایک ناول نگار اپنے ناول میں پیش آمدہ واقعات کو جس ترتیب سے پیش کرتا ہے، اسے پلاٹ کہتے ہیں۔ ایک زمانے تک اچھے پلاٹ کو ہر ناول کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔ جدید ناول میں البتہ پلاٹ کی سطح پر بھی مختلف تجربے کیے جاتے ہیں اور واقعات کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ پلاٹ سادہ ہو یا پیچیدہ، ہر ناول میں موجود ہوتا ہے، بغیر پلاٹ کے بے ترتیب ناول میں بھی پلاٹ کسی نہ کسی صورت ہوتا ہے۔

ب۔ کردار

ناول میں پیش آمدہ واقعات جن انسانوں یا اشیاء کے گرد گھومتے ہیں، انھیں کردار کہا جاتا ہے۔ ناول کے یہی کردار ہی ناول کی بنت میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں کہ انہی کے طفیل قصہ بیان ہوتا ہے۔ کردار جاندار اور دلچسپ ہو تو ناول بھی دلچسپ ہوتا ہے، بہ صورت دیگر قصہ غیر دلچسپ اور بے جان ثابت ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو متاثر نہیں کر پاتا۔

ج۔ مکالمہ

کرداروں کی باہمی گفتگو یا مکالمے میں مصنف موضوع اور موقع کی مناسبت سے دراصل اپنا مطمع نظر بیان کرتا ہے۔ پر اثر مکالمہ ناول کی شان بڑھا دیتا ہے، جبکہ عامیانہ اور بے جا طویل مکالمے ناول کو لے ڈوبتے ہیں۔ اگر چہ کم و بیش ہر ناول میں مکالمہ پایا جاتا ہے مگر جدید ناول میں مکالمہ اس کا لازمی عنصر تصور نہیں ہوتا۔

د۔ منظر نگاری

اس میں کمروں، گھروں، شہروں اور قصبوں کے نقشے اور جزئیات سمیت پیش کیے جاتے ہیں، اور کرداروں کے سیرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ ناول میں پیش کردہ منظر جس قدر حقیقی اور تصنع سے پاک ہو، اتنا ہی زندگی کے

قریب ہوتا ہے، اور ناول کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔

اردو میں ناول کا ارتقاء:

اردو میں ناول کی ابتداء جدید تعلیم اور انگریزی ناول کے زیر اثر انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی۔ عام طور پر ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار مانا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں میں مـراۃ العـروس ،بـنـات النعش ،تـوبته النصوح اور ابن الوقت وغیرہ ہیں۔ ان میں سے ابن الوقت اہم ترین ناول ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی زیادہ تر اہمیت تاریخی حوالے سے ہے۔ اردو میں ناول کے فن پر ہر حوالے سے پورا اترنے والا پہلا جدید ناول مرزا ہادی رسوا کا امـراؤ جان ادا ہے۔ اس میں مرکزی کردار امراؤ نامی طوائف کا ہے، جس کے گرد سارا قصہ گھومتا ہے۔ مرزا رسوا نے امراؤ کے روپ میں ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ایسے دلچسپ انداز میں سنایا ہے کہ قصے کی بجائے اس پر کسی حقیقی واقعے کے بیان کا شبہ ہوتا ہے۔ ناول امـراؤ جـان ادا کے روپ میں نہ صرف اردو زبان کو پہلا مکمل ناول ملا ہے، بلکہ زندگی سے بھرپور اور حقیقت کے قریب تر اولین ناولائی کردار بھی سامنے آیا ہے۔ یہ ناول انیسویں صدی کے بالکل اختتام پر لکھا گیا [اس کی تفصیل دوسرے باب میں دی جا چکی ہے]۔ بیسویں صدی میں کئی اہم ناول نگار سامنے آئے، اسی دور میں اردو ناول کئی رجحانات سے بھی آشنا ہوا۔ عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی نے تاریخی ناول نگاری میں نام پیدا کیا، جبکہ پریم چند، کرشن چندر، عزیز احمد وغیرہ نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اپنے ناولوں میں سماجی حقیقت نگاری کی؛ ان ناول نگاروں نے عام آدمی کی زندگی اور اس کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے ادبی حسن اور لطف کو ملحوظ رکھا۔

قیام پاکستان کے بعد اور بیسویں صدی کے نصفِ آخر میں سامنے آنے والے اہم ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، شوکت صدیقی، انتظار حسین، بانو قدسیہ، انیس ناگی، محمد خالد اختر، انور سجاد اور دوسرے بہت سے نام ہیں۔ ان سب ناول نگاروں کے نہ صرف رجحانات اور موضوعات ایک دوسرے سے مختلف اور متنوع ہیں، بلکہ اسلوب اور ہیئت کے حوالے سے بھی ان کے ناول مختلف اور متضاد، رنگ اور روپ رکھتے ہیں۔ ان لکھنے والوں کے ہاں ناول کا فن زیادہ نکھری ہوئی اور ترقی یافتہ صورت میں ملتا ہے۔ ان سب کی ناول نگاری کے مختصر خصائص بھی ایسی تفصیل کا تقاضا کرتے ہیں، جن کا بیان اس مقالے کی تحدید کے باعث یہاں ممکن نہیں۔[۱]

اسی دور میں اردو کے اہم ترین ناول آگ کا دریا،اداس نسلیں ،خدا کی بستی ،راجہ گدھ ،اور بستی وغیرہ سامنے آئے۔ یہ تمام اردو کے معروف ناول ہیں ،اردو ادب کا ایک عام قاری بھی ان ناولوں اور ان کے مصنفین کے ناموں سے خوب واقف ہے۔

اس وقت، یعنی جب اکیسویں صدی کا دوسرا دہا اختتام کے قریب ہے، کئی نئے اور اہم ناول نگار سامنے آئے ہیں؛ ان میں مستنصر حسین تارڑ،شمس الرحمان فاروقی ،مرزا اطہر بیگ اور حسن منظر کے نام سرفہرست ہیں۔ان لکھنے والوں کے ہاں بالکل نئے اور منفرد رجحان ملتے ہیں،ان کے ناولوں میں ہئیت کے تجربے،منفرد اسلوب اور مکمل بیانیہ اردو ناول کو عالمی سطح کے ناول ثابت کرتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ کا ناول بہاؤ ایک ایسی ہی عمدہ مثال ہے،اس میں ایک قدیم اور مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ پیش کیا گیا ہے؛ اس کے کردار بڑے جاندار اور اسلوب بہت مختلف ہے۔اسی طرح شمس الرحمان فاروقی کا ناول کئی چاند تھے سرِ آسماں ہے،یہ انیسویں صدی کے ہندوستان اور اس کی بعض اہم ادبی اور سماجی شخصیات کی تصویر گری کرتا ہے۔اگر چہ یہ تاریخی رجحان کا ناول ہے،مگر قصے کی بنت، پیش کش اور اسلوب میں بہت مختلف اور منفرد ناول ہے۔حال ہی میں جو دیگر نئے اور اہم ناول سامنے آئے ہیں ان میں علی اکبر ناطق کا نولکھی کوٹھی ،اختر رضا سلیمی کے دو ناول جاگے ہیں خواب میں اور جندر ،سید کاشف رضا کا چار درویش اور ایک کچھوا اور رحمان عباس کا رو حزن وغیرہ ہیں۔پاکستان اور ہندوستان میں ناول کی صنف کو جس طرح کئی نئے اور باصلاحیت لکھنے والے اختیار کر رہے ہیں؛ اس سے اردو ناول کا مستقبل مزید درخشاں نظر آتا ہے۔ جہاں تک بلوچستان میں اردو ناول کا تعلق ہے،تو اس بارے حقیقت یہ ہے کہ یہاں لکھا جانے والا زیادہ تر فکشن بالخصوص ناول، خالصتاً ادبی ناول کے زمرے میں نہیں آتا۔چند ہی ناول ایسے ہوں گے، جو سنجیدہ ادب میں شمار ہوں گے؛ باقی تمام ناول مقبول عام ادب یا پاپولر لٹریچر کے دائرے میں آتے ہیں۔اس لیے یہاں مقبول عام ادب یا پاپولر لٹریچر کی روایت کا اجمالی جائزہ لینا مناسب ہوگا۔

اردو میں مقبول عام ادب [پاپولر لٹریچر] کی روایت:

مغرب کی مختلف زبانوں کی طرح اردو میں بھی سنجیدہ ادب کے پہلو بہ پہلو مقبول عام یا پاپولر ادب کی روایت موجود ہے۔انگریزی میں اس کی ابتداء جاسوسی کہانیوں سے ہوئی اور پھر سائنس فکشن بھی اس کا حصہ بنا۔اردو میں پاپولر لٹریچر کا بڑا حصہ تاریخی، جاسوسی اور رومانی کہانیوں اور ناولوں پر مشتمل ہے۔ابن صفی، گلشن نندہ اور نسیم

حجازی اس کی اہم مثالیں ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی، سماجی اور رومانی کہانیوں کا چلن پڑا، اور مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین ناول نگاروں کی ایک کھیپ سامنے آئی۔مرد لکھنے والوں میں جہاں ایم اسلم، الیاس سیتاپوری، محی الدین نواب، ایم اے راحت، اور اسلم راہی وغیرہ بہت مقبول ہوئے ، وہاں خواتین ناول نگاروں میں اے۔آر۔ خاتون، بشریٰ رحمان، رضیہ بٹ، بینا ناز، نادرہ خاتون اور آمنہ اقبال سمیت دوسری بہت ساری خواتین نے پاپولر ناول لکھے، اور آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔اب سوال اٹھتا ہے کہ آخر پاپولر ادب کیا ہے؟ یا کس ادب کو پاپولر ادب کہا جائے گا اور کیوں؟ پاپولر ادب عام زبان اور سادہ انداز میں لکھی گئی کہانی ہوتی ہے، اس میں اسلوب اور ہئیت کی سطح پر کوئی پیچیدگی اور گہرائی و گیرائی نہیں ہوتی۔اس کا موضوع چاہے رومانی ہو یا اخلاقی، واقعات ایک بہاؤ میں چلتے ہیں، اور پڑھنے والے کو فوراً سمجھ آ جاتے ہیں۔پاپولر ادب کی تعریف کرتے ہوئے ابوذر ہاشمی لکھتے ہیں:

ہر وہ ادب جو عشق و عاشقی کا ترجمان، معاشرتی اور سماجی عوامل کا طرفدار، غیر متنازعہ عقائد پر مبنی، عوامی افکار وخیالات اور جمالیات کا عکاس، جذباتی عمل اور ردعمل کا مظہر، تجسس کو ہوا دینے ولا، سریع الفہم اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تفریح اور مسرت و شادمانی کا سامان بہم پہنچانے کی صلاحیت رکھنے والا ہو، پاپولر ادب ہوگا۔۲

شاید یہی وجہ ہے کہ عموماً کم تعلیم یافتہ لوگ بالخصوص خواتین ہی زیادہ تر پاپولر ادب پڑھنے کی طرف جلد راغب ہوتی ہیں۔یہ بھی حقیقت ہے کہ شروع میں ہر پڑھنے والا پاپولر ادب سے ہی مطالعے کا آغاز کرتا ہے اور پھر وہ ادب عالیہ اور فلسفیانہ موضوعات کی طرف آتا ہے۔یوں دیکھا جائے تو پاپولر ادب پڑھنے والوں کو نہ صرف مطالعے کا عادی بناتا ہے بلکہ یہ لفظ اور تحریر کی طاقت کا ثبوت بھی مہیا کرتا ہے کہ اس کی روایت سے آشنا ہونے کے بعد ہی کئی لوگ سنجیدہ ادب کا رخ کرتے ہیں اور کئی اس میں اپنا نام بھی پیدا کرتے ہیں؛ اس سے پاپولر ادب کی افادیت اور اہمیت ثابت ہوتی ہے۔اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پاپولر ادب نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔بلوچستان میں لکھے گئے فکشن بالخصوص ناول کا غالب رجحان پاپولر ادب کا اس لیے ہے کہ ایک تو یہ ابتداء میں زیادہ تر خواتین نے لکھا۔ظاہر ہے کہ ان خواتین کے لیے گھر اور خاندان کے گرد گھومنے والی اخلاقی اور عشقیہ کہانیوں کو سادہ انداز میں پیش کرنے میں آسانی تھی۔اس کے لیے زیادہ غور وفکر اور مغزماری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان خواتین کی اپنی تعلیم بھی واجبی سی تھی، دوسرے، جس وقت یہ لکھا گیا، پبلشرز اسے نہ صرف چھاپنے پر تیار ہوتے بلکہ لکھاری کو اس کا معاوضہ بھی ملتا۔اس باعث انھوں نے پاپولر ادب لکھنے پر خود کو مائل پایا۔ہر زبان میں پاپولر ادب

کی ایک اپنی اہمیت ہے۔ بلوچستان کے پاپولر ادیبوں نے ایک ایسے دور افتادہ علاقے میں اردو زبان و ادب بالخصوص اردو نثر کی روایت کو پروان چڑھایا، جہاں پہلے کسی بھی زبان کی کوئی ثروت مند ادبی یا علمی روایت موجود نہ تھی، نہ ہی عام لوگوں میں ادب کے مطالعے کا شوق یا رجحان پایا جاتا تھا۔ اس لیے ان لکھنے والوں کا تخلیقی کام پاک و ہند کے دوسرے علاقوں کی نسبت نیا اور مشکل تھا؛ ان ادیبوں نے اپنے حصے کا کام کرتے ہوئے ایک تاریک علاقے میں ادب اور شعور کی جو شمعیں جلائی ہیں، ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

بلوچستان میں اردو ناول:

قیام پاکستان سے قبل بلوچستان میں اُردو ناول کے ارتقاء کے بارے میں مختلف اور متضاد دعوے کیے جاتے رہے ہیں۔ ان سب آراء کا تجزیاتی جائزہ بہ تفصیل دوسرے باب میں پیش یا جا چکا ہے۔ پیش نظر باب میں قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں اولین اردو ناول کے تعین کے ساتھ ساتھ زمانہء حال تک لکھے جانے والے ناول کا ارتقائی مطالعہ پیش کیا جائے گا تا کہ اس حوالے سے صحیح صورتحال واضح ہو سکے۔ بلوچستان میں اردو ادب کے تنقیدی مطالعات کا احاطہ کرتی کتب میں آزادی کے بعد اولین اردو ناول کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ اس موضوع پر تحقیق اور تفتیش تو رہی ایک طرف کسی ناقد یا محقق نے اس بارے سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ قیام پاکستان کے بعد یہاں پہلا ناول کس نے لکھا اور اس کا عنوان یا موضوع کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ کسی مضمون یا کتاب میں اس حوالے سے کوئی رہنما اشارہ نہیں ملتا۔

بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول نگار؛ مولا بخش محمد شہی

اس مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں لکھا جانے والا اردو کا پہلا باقاعدہ ناول بندھن ہے۔ اور اس کا مصنف مولا بخش محمد شہی ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ اردو کا پہلا مکمل ناول ہے جسے کسی بلوچ مصنف نے لکھا ہے یعنی مولا بخش محمد شہی اردو کا پہلا بلوچ ناول نگار ہے۔ ذیل میں اس ناول کا پہلی بار تفصیلی تعارف اور تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

بندھن

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ ناول مولا بخش محمد شہی کی تخلیق ہے۔ یہ ناول چھوٹے سائز کے ایک سو

چوالیس (۱۴۴) صفحات پر مشتمل ہے اس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔اسے اسلامیہ پریس کوئٹہ نے شائع کیا ہے۔اس کا زمانہ تصنیف قیاساً متعین کیا جاتا ہے۔ناول کے متن کا بہ غور مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ ناول قیام پاکستان کے فوراً بعد کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔اس ناول میں پیش کردہ ماحول، ہندو، مسلم اور سکھ کرداروں کی بہ کثرت موجودگی اور ان کی آپس میں بے تکلفی، کراچی اور کوئٹہ میں شراب خانوں اور چنڈو خانوں کی کھلے عام موجودگی ناول کے بعض کرداروں کا طوائفوں سے آزادانہ میل جول، بمبئی کا ذکر، فسادات کا تذکرہ اور بلوچستان کے بعض علاقوں کے پرانے ناموں کی موجودگی کی بناء پر قیاس ہے کہ یہ ناول پچاس کی دہائی کے نصف یا آخر میں لکھا گیا اور شائع ہوا۔اس ناول کا پرانا کاغذ اور اس کی حالت بھی اس قیاس کو تقویت دیتی ہے۔[۳]

اس ناول کا آغاز ہی کوئٹہ کے ایک معروف بازار میں کرداروں کی موجودگی سے ہوتا ہے۔اس ناول میں جو زمانہ دکھایا گیا ہے وہ نصف قیام پاکستان سے قبل اور نصف بعد کا ہے۔کوئٹہ کے علاوہ اس میں بلوچستان کے جن دوسرے علاقوں کا ذکر ملتا ہے ان میں ہندو باغ [اب مسلم باغ]، فورٹ سنڈیمن [اب ژوب]، خانوزئی اور مستونگ وغیرہ شامل ہیں۔اس کے کردار مقامی ہیں مگر اہم بات یہ ہے کہ ان میں مسلم کرداروں کے ساتھ ساتھ بالا دیوی، ستیش کمار اور پریتم سنگھ جیسے بعض ہندو اور سکھ کردار بھی ملتے ہیں۔ناول میں پیش کی گئی رومانوی کہانی کا تسلسل تین نسلوں تک چلتا ہے۔سعید اللہ قدرت اللہ اور شفقت اللہ تین گہرے دوست ہوتے ہیں۔شفقت اللہ بیمار ہو کے وفات پا جاتا ہے تو باقی دونوں دوست اس کی اولاد اور جائیداد کا خیال رکھتے ہیں۔سعید اللہ اپنے دوست کے بیٹے امجد سے اپنی بیٹی عصمت زہرا کا رشتہ کر دیتا ہے مگر یہاں مالا دیوی ستیش اور پریتم ان کے راستے کی دیوار بننے کی کوشش کرتے ہیں۔تاہم وہ اپنی مذموم کوشش میں کامیاب نہیں ہوتے۔پھر اس کے بعد ناول کے کردار ایک دم بمبئی میں نظر آتے ہیں اور قیام پاکستان کے باعث مشکل حالات سے دوچار ہوتے ہوئے امجد اور عصمت زہرا لاہور میں ملتے ہیں اور شادی کرتے ہیں۔آخر میں ان کی بیٹی شمیم آرا کی خانوزئی کے ملک ہاشم جان کے بیٹے رحمت اللہ سے شادی ہو جاتی ہے اور وہ اس بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ناول قیام پاکستان سے قبل کے معاشرے کی تصویر دکھاتا ہے جب کوئٹہ اور کراچی میں بالا خانے اور چنڈو خانے یا بار روم موجود تھے۔جہاں لوگ کھلے عام جا کر شراب پیتے یا مختلف نشہ کرتے ہیں اور طوائفوں کو داد عیش دیتے تھے۔ناول کے بعض کردار ٹیلیفون کا استعمال بھی کرتے ہیں حامد اور رحمت اللہ چکلے سے وابستہ ثریا اور مراد کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ دونوں اپنا دھندہ چھوڑ کر شریفانہ طور پر زندگی بسر کرنا شروع کرتے ہیں۔اس طرح دیکھا جائے تو یہ ایک اصلاحی اور اخلاقی رجحان کا ناول

ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ ایک بیانیہ قصے کے طور پر ناول بندھن ایک بلوچ لکھاری کی بہت اچھی کوشش ہے۔

اسلوب

مولا بخش محمد شہی کا اسلوب پختہ، سادہ اور رواں ہے، ان کی تحریر میں کئی جگہ جملوں کی ساخت میں ادبی چاشنی ملتی ہے۔ وہ اردو روزمرہ اور محاورے کا استعمال بھی کرتے ہیں اور کہیں کہیں ان کی تحریر میں چند مقامی لفظ بھی ملتے ہیں ایک آدھ جگہ وہ نیم فلسفیانہ بیان بھی لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں ''زندگی ایک مسلسل سفر کا نام اور اس سفر میں ہر قسم کے نشیب و فراز ہیں۔''[۴]

رضیہ فصیح احمد

رضیہ فصیح احمد کی پیدائش اگرچہ مراد آباد انڈیا کی ہے مگر آزادی کے بعد وہ کراچی پاکستان آ گئی تھیں اور شادی کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے کوئٹہ میں قیام کیا تھا۔ اسی زمانہ قیام میں انھوں نے اپنا پہلا ناول آبلہ پا کوئٹہ میں ہی لکھا تھا۔[۵] وہ بعد میں ایک تواتر سے افسانے اور ناول لکھتی رہی ہیں۔ اب تک ان کی درجن سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا ناول آبلہ پا بلوچستان میں لکھا گیا تھا۔ ناول کے متن میں کوئٹہ اور اس کے نزدیکی پہاڑوں کا تذکرہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے بلوچستان میں اردو فکشن کی روایت میں شمار کیا جانا چاہیے۔ ذیل میں اس ناول کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

آبلہ پا

یہ ناول دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصّہ کہانی کے مرکزی کرداروں کے زمانہ حال سے تعلق رکھتا ہے جبکہ دوسرا حصّہ ان کے ماضی کی داستان اور ناول کے انجام پر مشتمل ہے صبا اور اسد اس کہانی کے مرکزی کردار ہیں جو کئی جگہ کہانی کو صیغہ واحد میں بیان کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ عامر، امجد اور صبا کی ایک سہیلی بھی کہانی جاری رکھتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک سماجی یا گھریلو کہانی پر مشتمل ناول ہے۔ صبا کوئٹہ کے ہوٹل چمنستان میں اسد اور اس کے ساتھ ایک لڑکے بوبی سے ملتی ہے۔ جب دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو اسد بتاتا ہے کہ بوبی کے ماں باپ وفات پا چکے ہیں اور اس نے اس بچے کو گود لیا ہے مگر بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کی امریکہ میں ایک لڑکی سے تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ شادی کے بعد اسد صبا کی دوست روبینہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور اس کی خاطر وہ صبا کو

طلاق دے دیتا ہے مگر روبینہ عامر نامی نوجوان سے شادی کر لیتی ہے۔اسد وہاں سے ناکام لوٹتا ہے تو امریکہ سے کیٹی اور ایک پادری کا خط ملتا ہے جس میں وہ اعتراف کرتی ہے کہ بوبی دراصل اسد کے دوست اصغر کا بیٹا ہے۔اسد اصغر سے رابطہ کرتا ہے تو وہ اس بات پر بے حسی کا مظاہرہ کرتا ہے اسد ہر طرف سے پریشانیوں میں گھر کر ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے اور گلہ گھونٹ کر بوبی کو قتل کر دیتا ہے اور خود سزا بھگتنے جیل چلا جاتا ہے۔

آبلہ پا کی کہانی کا لوکیل کوئٹہ شہر ہے مگر اس میں اٹک، پشاور، لاہور اور امریکہ وغیرہ میں بھی اس کہانی کا کچھ حصّہ بیان ہوتا ہے۔ابتدائی حصّے کے آغاز میں کوئٹہ کی منظر کشی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔اس میں چلتان رینج، کوہ مردار کے سلسلے اور سمنگلی ہوائی اڈے کی جھلک نظر آتی ہے۔[۶] رضیہ فصیح احمد ایک کہنہ مشق ادیبہ ہیں۔اس پہلے ناول میں بھی ان کی زبان صاف شستہ اور رواں ہے۔ان کی تحریر میں اُردو روزمرہ اور محاورے کا استعمال نظر آتا ہے۔بعض جگہ اقبال اور غالب کے اشعار بھی ملتے ہیں۔کہیں کہیں انگریزی محاورے اور پورے جملے بھی نظر آتے ہیں۔ممتاز احمد خان آبلہ پا کے بارے میں لکھتے ہیں۔''یہ ناول مادیت پرستی اور کھوکھلے اخلاقی رویوں کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتا ہے۔''[۷]

بلوچستان کی پہلی خاتون ناول نگار؛ رفعت زیبا

رفعت زیبا، بلوچستان کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں۔انھوں نے ایک افسانوی مجموعے [اس کا ذکر باب سوم میں ہو چکا ہے] کے علاوہ دو (۲) ناول لکھے ہیں، ان میں سے ایک ناسور اور دوسرا رواج ہیں۔یہ دونوں اگرچہ پاپولر ناول ہیں، تاہم ان کی اپنی ایک اہمیت بھی ہے، ان کا الگ الگ تجزیہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ناسور

رفعت زیبا کا یہ ناول قریباً سو دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس ناول کو معاشرتی گھریلو ناول قرار دیا گیا ہے۔ ناول کے ابتدائی صفحات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا شمار کمرشل ناول کے زمرے میں ہوتا ہے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ اس ناول پر کمرشل ناول کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔اسے کبھی سنجیدہ تنقیدی مطالعے کا موضوع نہیں بنایا گیا۔یہ بلوچستان میں اردو ناول کی روایت میں اہم ناول ہے جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا یہ صحیح ہے کہ یہ ایک پالولر ناول ہے، مگر اس میں موضوع، مواد اور اسلوب کے حوالے سے کئی ایسے نکتے پائے جاتے ہیں جو اسے ایک اہم ناول ثابت کرتے ہیں۔جن سے بلوچستان کی ادبی روایت کا تنقیدی مطالعہ کرنے والوں نے اغماض برتا ہے۔اس ناول

کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ عورت کی زندگی کو بہ طور فرداور نوع موضوع بحث بناتا ہے۔عورتوں سے مردانہ سماج میں کیا برتاؤ روا رکھا جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی میں کس المناک صورت حال سے دوچار ہوتی ہے۔ بیانیہ انداز میں لکھے گئے اس ناول میں دلچسپ انداز میں اس کو واضح کیا گیا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار شمع نامی لڑکی ہے مگر یہ صرف شمع کی کہانی نہیں۔ناول کے آخر میں پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک فرد کی بجائے عورت کا المیہ ہے۔اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ناول کا مرکزی کردار شمع کم عمری میں والدین کی وفات کے بعد اپنے چچا کے گھر رہنے لگتی ہے، جہاں اس کی دو چچازاد بہنیں سیما اور روش بھی ہوتی ہیں۔روایتی گھرانوں اور کمرشل ناول کی طرز پر شمع سے اس کی چچی ٹھیک برتاؤ نہیں کرتی وہ اس سے گھر کا سارا کام کاج کراتی ہے اور کوستی بھی رہتی ہے۔ وہ اسے سخت ناپسند کرتی ہے اور نحوست کی پوٹ قرار دیتی ہے۔اس سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ عورت اپنی ہی جنس سے کیسی نفرت روا رکھتی ہے۔ معاشرے میں عورت کے ابتر مقام یا صورت حال میں خود عورت کا کیا کردار ہے۔ایسی نوعیت کے سوال ابتدائی صفحات ہی میں سامنے آتے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مصنفہ نے شعوری طور پر صورتحال اجاگر کی ہو؛ یہ امر یوں بھی واضح ہوتا ہے، کہ آگے چل کر سیما کے والدین اس کا اور شمع کا رشتہ ایک ساتھ ہی طے کرتے ہیں، مگر وہ اپنی بیٹی کے لیے موزوں رشتہ دیکھتے ہیں۔اس کا ہونے والا شوہر سہیل خوبرو، تعلیم یافتہ اور کسٹم انسپکٹر ہوتا ہے جبکہ شمع کا شوہر ارشد جسمانی لحاظ سے کمزور، بداخلاق، شرابی اور سوروپے ماہوار تنخواہ لینے والا کلرک ہوتا ہے۔ان شادیوں کا احوال مصنفہ نے جس طور سے لکھا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے ہندوستانی ثقافت میں انجام پانے والی شادیوں کی باریکیوں سے بخوبی آگاہ ہے، جو کپڑوں، زیورات اور دیگر رسومات یعنی اُبٹن، مہندی، ڈھولک کے روایتی ٹپوں، آرسی مصحف اور جوتے چوری کی رسم کے بیان سے ہوتی ہے۔شادی کے دوران شمع اور سیما کی ایک طرح سے دوستی اور بے تکلفی دکھائی گئی ہے، جو پہلے نظر نہیں آتی۔اس میں ان دونوں کے درمیان جو مکالمہ ہوتا ہے وہ شادی میں عورت کی اضافتوں اور پسند پر مبنی ہوتا ہے جس میں وہ کہتی ہیں، کہ پچاس فیصد شادیاں اس لیے ناکام ہوجاتی ہیں کہ، میاں بیوی شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھتے یا جانتے نہیں اور عورت چاہے جتنی اچھی یا خوبصورت کیوں نہ ہو، بیوی بن کر مرد کی نظر میں اپنی حیثیت کھودیتی ہے۔شادی کے بعد شمع کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔اس کا شوہر ارشد اس میں دلچسپی نہیں لیتا ہے، نہ گھر میں بلکہ شراب نوشی کرنے لگتا ہے اور پھر بیٹے کے حصول کے لیے اُسے اپنا جسم بیچنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اسے اپنے ایک افسر کے گھر لے جاتا ہے اور خود اس سے پیسے لے کر رفو چکر ہوجاتا ہے۔اس سوز نامی یہ آفسر جب شمع کی عزت کے درپہ ہوتا ہے تو وہ اسے پیتل کے ایک گلدان سے زخمی کر کے بھاگنے میں کامیاب

ہو جاتی ہے۔ جہاں وہ سڑک پر ایک گاڑی سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اُسے ہسپتال میں ہوش آ تا ہے جہاں مس مارکر نامی خاتون اس کی تیمارداری کرتی ہے اور پھر اس کی کہانی سن کر اسے اپنے گھر لے جاتی ہے اور اسے بھی نرسنگ کے کورس میں داخلہ لے دیتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد نرسنگ سکول میں شمع ایک ڈرامے میں حصّہ لیتی ہے۔ اگلے دن کے اخبار میں رپورٹ کے ساتھ اس کی تصویر بھی شائع ہوتی ہے جسے دیکھ کر ارشد اُسے واپس لینے آ جاتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ وہ جانے سے انکار کر دیتی ہے مگر نرسنگ سکول کی سربراہ اب اُسے مزید ہاسٹل میں رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ اس سے دیگر لڑکیوں کو غلط پیغام ملنے کا اندیشہ ہوتا ہے یوں وہ بے گھر ہو کر مجبوری میں واپس ارشد کے پاس آ جاتی ہے اور اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر اس کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہے۔ اس عرصے میں اس کی ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے مگر وہ اس میں دلچسپی نہیں لیتی اور میک اپ کر کے اپنے خاوند کے دوستوں سے ملتی ہے۔ انھیں کمپنی دیتی ہے۔ وہ اس کے لیے تحفے اور کھانے پینے کی اشیاء لاتے ہیں۔ ارشد کا مطمع نظر بھی یہی ہوتا ہے۔ وہ پیسے کے لیے اپنی بیوی کو اپنے نام نہاد دوستوں کے آگے ایک خوبصورت کھلونا بنا کر پیش کرتا ہے۔ شمع نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب کر گزرتی ہے کہ اس دوران ارشد کے دوست اپنے ایک نئے دوست اکبر کو لے آتے ہیں جو ایک کم عمر مگر بہت مالدار اور ایک خاندانی نوجوان ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کی جاذبیت اور حسن سلوک شمع کو اس کا گرویدہ بنا دیتا ہے۔ وہ اسے اپنی نوجوانی کے دنوں میں دیکھے ہوئے خوابوں کا شہزادہ سمجھتی ہے۔ شمع اس قرب میں ہر شے بھول جاتی ہے۔ آخر وہ اسے خود کو اس عذاب سے بچانے اور شادی کرنے کا جب کہتی ہے تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے کہ وہ ایک باوقار خاندان کا مرد ہے کس طرح ایک گری ہوئی عورت سے شادی کر سکتا ہے۔ جس پر وہ غصے میں آ کر اُسے دھتکار دیتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد وہ خود کو گندی نالی کا کیڑا اور سماج کے ماتھے پر کلنک سمجھتی ہے۔ تب اس کی نظر اپنی بیٹی پر پڑتی ہے۔ تو وہ اسے بھی کمتر اور حقیر سمجھتی ہے کہ یہ معاشرہ اس کی بھی عزت نہیں کرے گا بلکہ قدم قدم پر اسے عذاب سے دوچار کرے گا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اپنے حواس کھو دیتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی کم عمر بچی کا گلہ گھونٹ دیتی ہے۔ تب وہ یکدم ہوش میں آنے پر خود کو خونی کہتے ہوئے اپنے کپڑے تار تار کر لیتی ہے اور اسی حالت میں باہر نکل جاتی ہے۔ اگر چہ ناول یہاں ختم ہو جاتا ہے مگر مصنفہ نے اس کے بعد بھی اگلے دو صفحوں پر شمع کو ایک پاگل عورت کے روپ میں دکھایا ہے۔ کوئی اس کی بات نہیں سنتا اور شہر کے لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر یہ دو صفحے نہ ہوتے تو ناول زیادہ پر اثر ہوتا۔

شمع اپنی بیٹی کو یکدم ہی نہیں مار دیتی بلکہ جس روز وہ پیدا ہوتی ہے۔ اسے ایک دھچکا لگتا ہے اور وہ سوچتی ہے

کہ آج کی یہ بچی کل کی مظلوم عورت ہوگی۔ وہ اسے پہلے دن سے ہی زمانے کے ستم کا شکار ہونے والی ایک عورت سمجھتی ہے۔ اسے زمانہ قدیم کے وہ عرب بدو یاد آتے ہیں جو پیدا ہوتے ہی اپنی بیٹیوں کا گلہ گھونٹ دیا کرتے تھے اور وہ سوچتی ہے کہ وہ لوگ کتنا اچھا کرتے تھے کہ اپنی بیٹی کو مار دیا کرتے تھے۔ گویا پہلے دن سے ہی یہ خیال اس کے ذہن میں پک رہا تھا۔ شمع ادبی ذوق بھی رکھتی ہے۔ وہ فیض اور غالب کے شعر اور مصرعے مختلف موقعوں پر اپنی گفتگو میں استعمال کرتی ہے۔ ایک کمرشل ناول ہونے کے باوجود اس میں کئی جگہ فلسفیانہ سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ مثلاً درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

> ماضی۔۔۔ حال۔۔۔ مستقبل وہ دل ہی دل میں ہنستی ہے۔۔۔ ماضی کیا تھا۔۔۔ حال کیا ہے۔۔۔ اور مستقبل کیا ہوگا۔۔۔ کچھ نہ تھا۔۔۔ اور کچھ نہ ہوگا۔ ماضی آرزوؤں اور تمناؤں کا مدفن تھا۔ جہاں ویرانی ہی ویرانی تھی اور مستقبل ایک ایسا لق و دق صحرا ہے جہاں دور تک منزل کا نشان نہیں ملتا۔۔۔ اور اس کا اپنا وجود صحراؤں میں چکراتے ہوئے بگولے کی مانند تھا۔۔۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے[۸]

محولا بالا اقتباس میں مصنفہ زندگی اور وقت کے بارے میں کیا کچھ کہہ گئی ہیں وہ بخوبی اُجاگر ہوتا ہے۔ رفعت زیبا کا قلم اپنی فکر اور اسلوب میں ایک اعلیٰ فن پارے کا عکس پیش کرتا ہے اور اسے پڑھتے ہوئے قراۃ العین حیدر کی یاد آ جاتی ہیں۔ اس سطح کے نہیں تو اس سے ملتے جلتے جملے اور مختصر اقتباس اس ناول میں کئی جگہ ملتے ہیں۔ اس ناول کی مصنفہ کو اردو زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ پڑھتے ہوئے کسی غلطی کا احساس نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں روزمرہ اور محاورے کا استعمال بھی ملتا ہے۔ مثلاً آنکھوں کا پانی مر جانا، لکیر کے فقیر ہونا، گھر کی مرغی دال برابر ہونا۔ رونگھٹے کھڑے ہونا، چیونٹی کے پر نکلنا، کان بھرنا، نظر لگنا اور کلنک کا ٹیکہ وغیرہ، روزمرہ اور محاورے کی مثالیں ہیں۔ ناول میں مکالمہ اور منظر نگاری بھی ملتی ہے۔ شمع کے بے حس ہو جانے والے دل میں جب اکبر کی محبت جاگتی ہے تو وہ اس محبت کی پھوٹنے کے عمل کی تشبیہ یوں لکھتی ہیں۔ ''جیسے کسی نے یخ بستہ برف کی سل پر انگارہ رکھ دیا ہو''۔[۹] رفعت زیبا کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مبارکہ حمید لکھتی ہیں:

> ان کے ناول ہوں یا افسانے، ان کا موضوع عورت اور مرد کے باہمی رشتوں، معاشرتی رابطوں اور رفاقتوں کی ناہمواری سے جنم لیتا ہے۔ ان کے یہاں مرد کی ہوس پرستی سے پیدا ہونے والے وہ مسائل زیادہ ہیں،

جن سے عورت کو گزرنا پڑتا ہے۔۱۰

لڑکیاں اور عورتیں ایک دوسرے کے بارے میں کیا سوچتی ہیں۔ شادی کے موقع پر رخصت کرتے وقت لڑکیوں کے والدین یا سرپرست انھیں کسی طرح شوہر کی تابعداری کا سبق دیتے ہیں۔ مشرقی لڑکیوں کو کسی طرح اپنے مستقبل یا شادی کا اختیار نہیں ہوتا اور کس طرح شوہر کو لڑکی کا مجازی خدا قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ایسے نکتے ہیں جو اس ناول کے تفصیلی تانیثی مطالعے کی دعوت دیتے اور اس کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

رواج

یہ رفعت زیبا کا دوسرا ناول ہے جو پٹھانوں کے ایک رواج ''ولور'' کو موضوع بناتا ہے۔ اسے بلوچی میں لب کہتے ہیں۔ ولور دراصل وہ خاص رقم ہوتی ہے جو شادی کے موقع پر لڑکے کی طرف سے دلہن کے باپ کو ادا کی جاتی ہے۔ اسے ایک طرح سے عورت کی قیمت گردانا جاتا ہے۔ اس لیے اس رواج کو مہذب معاشرے میں پسند نہیں کیا جاتا۔ ناول رواج کا لوکیل بلوچستان کا شہر زیارت ہے۔ اس کا ہیرو گلزار ایک معمولی کسان کا بیٹا ہوتا ہے جبکہ ہیروئن تاجور قبیلے کے سردار بہادر خان کی اکلوتی بیٹی ہوتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مگر گلزار کو شادی کے لیے ایک خاطر خواہ رقم ولور میں دینا ہوتی ہے تب ہی اس کی شادی تاجور سے ممکن ہوسکتی ہے۔ چنانچہ وہ پیسے کمانے کی خاطر کراچی جاتا ہے۔ جہاں وہ سمگلروں کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ مشکل حالات سے گزرنے کے بعد جب وہ مطلوبہ رقم لے کر گاؤں لوٹتا ہے اسی روز تاجور کی شادی ایک دوسرے گاؤں کے سردار کے بیٹے سے ہو رہی ہوتی ہے اور بارات بھی پہنچ چکی ہوتی ہے۔ مگر تاجور عین نکاح کے وقت گھر سے بھاگ کر اس چشمے کی طرف جاتی ہے جہاں گلزار بیٹھا ہوتا ہے۔ بات کھلنے پر تاجور کا باپ اس کا تعاقب کرتے ہوئے چشمے پر پہنچ جاتا ہے اور دونوں کو فائر کر کے ہلاک کر دیتا ہے کہ غیرت کا یہ معیار قبیلے کا دستور ہوتا ہے۔ اس طرح گویا ولور کے باعث انسانوں کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ یہ ناول اگرچہ پاپولر ادب کے زمرے میں آتا ہے۔ اس میں رومان بھی ہے اور وصال کے مناظر بھی۔ پانچ کے قریب مختصر ابواب پر مشتمل ناول کے ہر باب کا آغاز اشعار سے ہوتا ہے جو زیادہ تر فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی کے ہیں۔ کچھ اشعار دیگر شاعروں کے بھی ہیں۔ ان اشعار کے انتخاب اور موضوع کی بنا پر اس میں ترقی پسند اثرات بھی ملتے ہیں لیکن ناول رواج کا غالب رجحان اصلاحی ہے۔ خود مصنفہ کے پیش لفظ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ ولور کے حوالے سے لکھتی ہیں:

چونکہ مجھے ایسے قبائل میں رہنے کا اتفاق ہوا جہاں یہ رسم عام ہے۔ اس لیے مجھے احساس ہوا

کہ میں اس رسم بے راہ کی کسی نہ کسی شکل میں پردہ کشائی کروں تاکہ معاشرے کے باشعور حضرات اس پراگندہ رواج کی اصلاح کرسکیں۔"

مصنفہ کے محولہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ اس کا نقطہ نظر اصلاحی ہے۔ مصنفہ نے اپنے ناول میں چند ایسی باتیں تحریر کی ہیں جو بلوچستان میں نہیں ملتیں۔ مثلاً یہاں خٹک ناچ نہیں ہوتا بلکہ ''اتھنڑ'' [قبائلی رقص] ہوتا ہے جبکہ تاجور کی جس شخص سے شادی طے ہوتی ہے یعنی منصور وہ ولور کے علاوہ اپنی جائیداد کا چوتھا حصّہ بھی تاجور کے نام کرتا ہے۔ یہ بالکل حقائق کے برعکس ہے ایک تو باپ کے زندہ رہنے تک کوئی بیٹا اپنی وراثت کا حصّہ نہیں لے سکتا۔ دوسرا بلوچستان میں کسی بھی علاقے میں آج تک عورتوں کے نام پر جائیداد نہیں لکھ کردی جاتی۔ عورتوں کو وراثت میں بھی حصّہ نہیں دیا جاتا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو مصنفہ کی بلوچستان کے رواجوں سے سرسری شناسائی تھی اور یا پھر اس نے دانستہ طور پر دوسرے علاقوں کے بعض رواج ناول میں شامل کردیئے ہیں جو بلوچستان کے لوکیل میں غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال ولور کے حوالے سے بلوچستان میں رہتے ہوئے ایک ناول لکھنا بڑی بات ہے۔ بالخصوص اگر لکھنے والی ایک عورت ہو تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ولور ایسی سماجی برائی آج بھی بلوچستان بھر میں جوں کی توں برقرار ہے۔ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی جاتی۔

شاہین روحی بخاری

شاہین روحی بخاری بلوچستان کی پہلی باقاعدہ خاتون صحافی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ افسانہ و ناول نگار بھی ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ان کی کہانیاں اور فیچرز نشر ہوچکے ہیں۔ ان کے دو (۲) ناولوں کا تجزیہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔

آنیلے گگن تلے

یہ شاہین روحی بخاری کا ناول ہے جو ''ایس اے روحی'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس ناول کو کمرشل یا پاپولر ناول کے زمرے میں شامل کیا جانا چاہیے، کہ یہ کہانی، موضوع، کردار نگاری اور بنت کے حوالے سے ادبی ناول میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ۳۰۰ صفحات پر پھیلے ہوئے اس ناول کا موضوع محبت ہے۔ اس کے مرکزی کردار جاوید، نعیم اور نغمی [ہیروئن] کے ہیں۔ جاوید مختلف عورتوں سے محبت کرتا نظر آتا ہے مگر جب وہ نعیم سے ملتا ہے اور اس کی محفل میں اُٹھتا بیٹھتا ہے تو وہ جاوید میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ جاوید کی وجہ سے ایک لڑکی سیما خودکشی کرلیتی ہے، جبکہ آخر

کار وہ ایک دوسری لڑکی نزہت سے شادی کر لیتا ہے۔نعیم نغمی سے محبت کرتا ہے مگر اس کی شادی خاندان والے ایک اور جگہ اسلم نامی آدمی سے کر دیتے ہیں۔نعیم اس حادثے کو برداشت نہیں کر پاتا اور اسے یاد کرتے کرتے مر جاتا ہے۔نغمی کو جب اس کی موت کا پتہ چلتا ہے تو وہ بھی شادی شدہ ہونے کے باوجود خود کو اس قدر بیمار کر لیتی ہے کہ بالآخر مر جاتی ہے۔جاوید شادی کے بعد سدھر جاتا ہے اور ڈاکٹر بن جاتا ہے۔اس کی تعیناتی لاہور میں جس ہسپتال میں ہوتی ہے وہاں نغمی اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کرتی ہے اور جاوید کے سامنے موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔نعیم سے دوستی کے باعث جاوید اور نغمی کا رشتہ بہن بھائی کا ہوتا ہے۔نغمی مرنے سے پہلے اپنے شوہر کو نعیم سے محبت کا حال بتا دیتی ہے مگر اسے اپنی پارسائی کا بھی یقین دلاتی ہے۔ناول کا بیشتر حصّہ کراچی شہر کے گرد گھومتا ہے۔ساحل سمندر پر نعیم اور جاوید کی ملاقات ہوتی ہے اور جس انداز میں ان کی دوستی ہوتی ہے۔وہ سراسر بناوٹی محسوس ہوتا ہے۔جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ یہ ایک پاپولر ناول ہے۔اس لیے کردار نگاری میں کوئی گہرائی نظر نہیں آتی ہے۔نہ ہی ان کے درمیان ہونے والے مکالموں میں ادبی چاشنی ملتی ہے۔ناول کی زبان میں اردو روزمرہ اور محاورے کا استعمال بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ آنیلے گگن تلے اگرچہ ادبی ناول نہیں مگر یہ بلوچستان میں لکھے گئے اردو کے اولین کمرشل یا پاپولر ناولوں میں سے ہے۔بلوچستان کی خواتین کہانی نگار اس طرح کے ناول لکھ رہی تھیں یہ بذات خود بڑی بات ہے اسے اردو نثر کے ارتقا کی ایک کڑی ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔اس سے زیادہ اس ناول کی اہمیت پر گفتگو کرنا لا حاصل ہے۔

تیرے لیے

یہ شاہین روحی بخاری کا دوسرا ناول ہے۔اس رومانوی، معاشرتی ناول میں جدید طرز زندگی کے ساتھ ساتھ قدیم انداز کے بعض روایتی کردار اور معاشرت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ناول کا مرکزی کردار بینا نامی لڑکی ہے جس کے ماں باپ اس کے بچپن میں وفات پا جاتے ہیں۔وہ اپنی سخت گیر چچی کے پاس پرورش پاتی ہے جو اس سے نفرت کرنے کے ساتھ ساتھ سارا دن کسی ملازمہ کی طرح کام لیتی ہے۔اس کی چچی ماں ابی اس کے لیے سخت گیر مگر اپنے دو بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے نرم رویہ رکھتی ہے۔لہٰذا انھیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کے بچے بگڑ جاتے ہیں۔لڑکیاں نامناسب لباس پہنتی ہیں اور مردوں کے ساتھ میل جول رکھتی ہیں۔وہ سینما بھی جاتی ہیں اور کلب وغیرہ میں ڈانس پارٹیوں میں شرکت بھی کرتی ہیں۔تبھی شہزاد نامی نوجوان جو ایک ریاست کا ولی عہد ہوتا

ہےاس خاندان سے ملتا ہےمگر وہ اماں بی کی بیٹیوں ثمن اور نازی کی بجائے بینا میں دلچسپی لیتا ہے جو ایک کم گو اور سادہ لڑکی ہوتی ہے۔ اماں بی بینا سے چھٹکارا پانے کے لیے اس کی شادی ایک عمر رسیدہ شخص سے زبردستی کر دیتی ہیں۔ بینا اس المیے کا شکار ہونے کے بعد ہوش وحواس کھو دیتی ہے۔ شہزادا سے بے وفا سمجھنے لگتا ہے مگر وہ اماں بی کی بیٹیوں میں سے کسی سے بھی شادی نہیں کرتا۔ قسمت کے ظلم وستم کی شکار یہ بینا شہزاد کی والدہ کے محل میں ملازمہ ہو جاتی ہے جہاں شہزادا سے دیکھ کر پہلے طنز کرتا ہے مگر ساری حقیقت کھلنے کے بعد وہ اس سے اپنی والدہ کی رضامندی سے شادی کر لیتا ہے۔

یہ ناول چونکہ اکیسوی صدی کے پہلے دہے میں منظر عام پر آیا ہے اس لیے اس میں شہزاد کی نام نہاد ریاست اور اس کی اماں بی بیگم کے شاہی لوازمات کے ساتھ محل کا تذکرہ قاری پر گراں گزرتا ہے۔ بالخصوص اس وقت جبکہ ناول میں مختلف کرداروں کا جدید طرز زندگی مرد وزن کا آزادانہ میل جول اور بعض کرداروں کا لندن اور امریکہ آنے جانے کا بار بار ذکر ہوتا ہے۔ شاہین روحی بخاری سادہ رواں اور بامحاورہ نثر لکھتی ہیں۔ ان کی تحریر میں کم کم انگریزی الفاظ بھی اردو رسم الخط میں ملتے ہیں۔ ناول تیرے لیے میں منظر نگاری، مکالمہ اور کردار زندہ اور چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں مگر بینا کی حد سے زیادہ تابعداری اور ہر ظلم وستم کو چپ چاپ برداشت کرتے جانا بری طرح کھٹکتا ہے۔ شہزاد جب نازی کی بے وفائی پر اپنے دل میں سوچتا ہے کہ ''عورت کا وجود وہی بے وفائی کے خمیر سے بنا ہے''[۱۲] تو یہ جملہ عورت کے بارے میں مردوں کی مجموعی رائے کا پول کھولتا ہے اور اس سے مصنفہ کے تانیثی شعور کا ادراک ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کے جملے عورت کے بارے بحیثیت مجموعی مثبت کی بجائے منفی تاثر قائم کرتے ہیں۔ خلیل صدیقی ان کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شاہین نے اپنے فکشن میں جو مرکزی خیال پیش کیے ہیں، وہ مرکزی خیال زندگی سے ہی متعلق ہیں۔۔۔اس نے عام خواتین ناول نگاروں کی طرح جذباتیت سے کام نہیں لیا ہے۔ اس نے اپنی صنف کی نفسیات کے جذبات اور مسائل تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ ان مسائل کو بھی چھیڑا ہے، جن کا اثر سوسائٹی پر پڑتا ہے۔[۱۳]

محولہ بالا رائے سے لگتا ہے جیسے یا تو خلیل صدیقی نے شاہین کے ناول پڑھے نہیں اور یا پھر انھوں نے یہ تبصرہ جانبداری سے کام لیتے ہوئے محض ذاتی تعلقات کے بل پر دیا ہے، کیونکہ شاہین کے ہاں بھی وہی عامیانہ

جذباتیت ملتی ہے جو پاپولر ادب لکھنے والوں کے ہاں ملتا ہے۔

شاہدہ بخاری

ارمان جلے دل کے

شاہدہ بخاری کا رومانوی ناول ہے جو ۲۱۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے مگر اس عشقیہ کہانی میں سطحی جذباتیت کی فراوانی ملتی ہے۔ ناول میں کردار نگاری کے کم از کم تقاضے پورے کیے گئے نہ ہی دیگر فنی لوازمات کا خیال رکھا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ناول کو [ویسے اسے ناول کہنا بھی زیادتی ہے] پورے طور پر پڑھنا بھی ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ کمرشل ناول کے زمرے میں شامل اس ناول پر سال اشاعت درج نہیں ہے۔

اسے اصلاحی رومانی ناول کہا گیا ہے مگر اس میں صرف ایک رومانی کہانی ملتی ہے۔ فنی حوالے سے خاصا کمزور ناول ہونے کی وجہ سے اس کا شمار ادنیٰ کمرشل ناولوں میں ہوسکتا ہے۔ البتہ ایک ادھ جگہ ''شومارنا'' اور ''ملنگ آدمی'' جیسے الفاظ ملتے ہیں جو بلوچستان میں بولی جانے والی اردو میں مستعمل ہیں۔

عابد بخاری کا ناول

عابد بخاری ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھتا رہا ہے، اس نے ایک ناول لکھا، جس کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

مالا

عابد بخاری کا رومانوی ناول ہے۔ اس ناول کا ہیرو آبی صیغہ واحد متکلم میں اپنی کہانی سناتا ہے۔ وہ اپنی شادی والدہ کی مرضی سے کرتا ہے مگر شادی کے دوران ہی اُسے ایک خوبصورت رشتہ دار لڑکی مالا سے عشق ہو جاتا ہے۔ یہ ناول اسی عشق کی کہانی ہے۔ مالا بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ شاپنگ کرتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں۔ آبی مالا سے پوشیدہ طور پر شادی کرنا چاہتا ہے لیکن مالا کو یہ گوارہ نہیں۔ اسے اپنے خاندان اور سماج کا لحاظ ہے اور سب سے بڑی بات کہ وہ آبی کی بیوی رضیہ کا دل بطور ایک عورت کے نہیں توڑنا چاہتی۔ اس لیے دو چار سال آبی کی محبت میں گزارنے اور بہت سے رشتے ٹھکرانے کے بعد بالآخر وہ کسی دوسری جگہ شادی کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ آبی اس کے فراق میں شراب نوشی شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت مالا کی سہیلی رابعہ وقتی طور پر اس کی دل جوئی کرتی ہے۔ اصل میں آبی کی مالا کے لیے وارفتگی دیکھتے ہوئے اُسے بھی آبی سے

محبت ہو جاتی ہے۔آ بی اسے خود سے محبت سے منع تو کرتا ہے مگر اس کے وصال کا بھی متمنی ہوتا ہے۔ایک دن آ بی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مالا سے ملنے جہاز میں جاتا ہے اور جہاز راستے میں کریش ہو جاتا ہے۔یوں کہانی ختم ہو جاتی ہے۔آخر میں آ بی کی ڈائری میں لکھے ہوئے مالا کے نام خطوط بھی ناول میں شامل کیے گئے ہیں جن میں وہ مالا سے اپنی شدید محبت جتاتا نظر آتا ہے۔جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔مـــالا ایک رومانوی ناول ہے۔اس کا اسلوب بھی رومانیت کا حامل ہے۔عابد بخاری کو اردو زبان و بیان پر اعلیٰ درجے کا عبور حاصل ہے۔اس کا انداز تحریر کلاسیکی نثر کی خصوصیات رکھتا ہے۔وہ رواں اردو لکھتا ہے۔اس کے ہاں تراکیب کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔وہ اردو کے جدید اور کلاسیکی شعراء کے اشعار اور مصرعے ناول میں کثرت سے استعمال میں لاتا ہے۔بلکہ انھیں نثر کے روپ میں بھی لکھتے ہیں۔ان کی تحریر کے ذیل میں اقتباس سے ان کی نثر کی خوبیاں بخوبی اُجاگر ہوتی ہیں:

> یہ مجھے آج محسوس ہوا کہ حُسن خوابیدہ کسے کہتے ہیں نہ ہاتھ کی خبر پاؤں کو، نہ پاؤں کی خبر ہاتھ کو، سر کہیں، بازو کسی طرف اور آنکھیں محوِ خواب، چہرے پر کچھ ایسی معصومیت اور اس معصومیت کے ساتھ کچھ اس بلا کی تمکنت کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔میرا جی چاہتا تھا اسی حالت میں اسی عالم میں، اسی کیفیت میں ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھتا رہوں۔پلک جھپکنا بھی گراں گزرتا تھا۔نظارے کو جو جنبش مژگاں بھی بار ہے۔نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی۔وہ بے خبر سو رہی تھی اور اس بے خبری میں کیسا نشہ کیسا خمار اور جادو تھا اسے میں نے محسوس تو کر لیا لیکن بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔[۱۴]

محولہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ لکھنے والے کو رومانوی نثر لکھنے کی کس درجے کی مہارت حاصل ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ایسی جاندار اور خوبصورت نثر بلوچستان کی ادبی روایت میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

یاسمین صوفی (م۱۹۹۶ء) کی ناول نگاری

یاسمین صوفی نے کئی مقبول عام ناول لکھے ہیں، اس طرح انھوں نے رضیہ بٹ کی طرح بلوچستان میں پاپولر ادب کی روایت کو آگے بڑھایا۔ان کے ناولوں کا تفصیلی جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

چندا کا دل ٹوٹ گیا

یاسمین صوفی کا یہ ناول محبت کے موضوع پر ہے۔ چندا (ہیروئن) اور سیف (ہیرو) اس کے مرکزی کردار ہیں جن کے گرد قریباً سوا چار سو صفحات پر مشتمل اس ناول کی کہانی گھومتی ہے۔ چندا شادی شدہ ہونے کے باوجود ڈاکٹر سیف کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا خاوند تاج انتہائی معمولی شکل وصورت کا ہونے کے باوجود چندا پر رعب رکھتا ہے۔ جبکہ چندا خوبصورتی کا شاہکار ہوتی ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر سیف بھی دلکش خدوخال رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں باہمی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں کی محبت ناول کے آخر تک جسمانی تعلق کی بجائے روحانی وصال سے سرشار رہتی ہے مگر چندا اسے اپنی شادی شدہ ہونے کا نہیں بتاتی۔ دوسری طرف سیف بھی اُسے آخر تک کنوارا ہی سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر سیف کا اپنے گاؤں میں وٹہ سٹہ کا رشتہ اپنی چچازاد پلوشہ سے ہو چکا ہوتا ہے جس کے بھائی عمر گل سے سیف کی بہن زرینا کا رشتہ ہوتا ہے۔ پلوشہ بھی سیف کو بے طرح چاہتی ہے مگر جب سیف اُسے دبے لفظوں میں اپنی محبت کا حال بتاتا ہے تو وہ اگلے ہی دن سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے پہاڑ سے گر جاتی ہے اور شدید زخمی ہو کر ہوش وحواس کھو دیتی ہے۔ واقعات کے ایک طویل سلسلے کے بعد چندا کا انتقال ڈاکٹر سیف کے گاؤں میں ہوتا ہے اور وہیں اس کی تدفین بھی ہوتی ہے۔ دوسری طرف پلوشہ کی صحت مندی کے بعد عین شادی کے وقت یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سیف نے بچپن میں پلوشہ کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ اس طرح وہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہیں اور ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ آخر میں ناول کی کہانی میں ڈاکٹر سیف کا المیہ ابھر کر سامنے آتا ہے جو کہ وہ کئی بہت خوبصورت لڑکیوں کی چاہت کے باوجود ان سے شادی نہیں کر پاتا اور ان کے وصال سے محروم رہ جاتا ہے۔

اگرچہ یہ کمرشل ناول ہے مگر اس میں جا بجا ادبی اور سنجیدہ نوعیت کے مسائل پر اظہار خیال بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً جب چندا شادی شدہ ہونے کے باوجود اول اول سیف کی محبت میں مبتلا ہوتی ہے تو وہ ایک طویل مکالمے میں خود سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

> ایک شادی شدہ مرد کو دوسری عورت سے آنکھیں لڑانے کی اجازت معاشرہ دے سکتا ہے۔
> ایک شادی شدہ مرد کو دوسری شادی کرنے کی اجازت معاشرہ بخش سکتا ہے۔ مگر ایک شادی شدہ عورت کی نگاہوں پر پہرے۔۔۔ دل پر پہرے اور جسم پر تو شوہر کی سنگین وحریص

> نگاہوں کے پہرے۔۔۔ زچگی کی حدود سے لے کر قبر کی آخری رُت تک لگے رہتے ہیں ۔۔۔ ایک عورت۔۔۔ اور وہ بھی شادی شدہ کسی کو خاموشی سے چاہ لے۔ تو قیامتوں کے طوفان اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کشت وخون کے بازار گرم ہوجاتے ہیں۔ سوئی ہوئی غیرتیں جاگ اُٹھتی ہیں۔ [۱۵]

اگر چہ محولہ بالا اقتباس کچھ طویل ہو گیا ہے مگر اس کا حوالہ ناگزیر تھا۔ یہ ایسی عبارت ہے جس کی نسائی قرأت سے معاشرے میں عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والا صنفی امتیاز صاف نظر آتا ہے۔ اس طرح کی عبارت اور ناول کی ادبی زبان اسے ایک عام کمرشل یا پاپولر ناول کی سطح سے بلند کر دیتی ہے۔ ناول میں اردو محاورے اور روزمرہ کا وافر استعمال مصنفہ کی اردو زبان پر مہارت اور عبور کی دلیل ہے جبکہ کہیں کہیں تشبیہ، استعارے اور تلمیح بھی ملتی ہیں چند محاورات یوں ہیں۔ ہاتھوں ہاتھ بکنا، بلائیں لینا، گل کھلانا، اونے پونے بیچنا، عزت اچھالنا، ہاتھ کی لکیر ہونا، سانپ سونگھ جانا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونا، ترکی بہ ترکی جواب دینا، تلوے چاٹنا وغیرہ۔

اس ناول میں جا بجا سادہ لفظوں میں حکمت و دانش پر مبنی ایسے نکات ملتے ہیں جو قاری کو چونکا دیتے ہیں۔ مثلاً چند جملے ملاحظہ ہوں:

- ☆ عورت چاہے تو بہتے دریاؤں کا رُخ موڑ سکتی ہے۔
- ☆ غلط فہمی محبت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔
- ☆ مرد عورت کا زیور ہوتا ہے اور عورت مرد کا لباس۔
- ☆ عشق تو بھرے پیٹ کیا جاتا ہے۔
- ☆ دنیا میں دو ہستیوں سے پردہ نہیں ہوسکتا......ایک ڈاکٹر سے ......اور......دوسرا خواجہ سرا سے۔ [۱۶]

اس کے علاوہ ناول کے کرداروں سے لے کر گاؤں کی فضا پہاڑوں کا تذکرہ اور وہاں لکڑیاں چننے کا عمل مختلف پھلوں اور کھانوں کے نام، رسم و رواج اور کئی جگہ الفاظ اور جملوں کی بناوٹ سے صاف لگتا ہے کہ یہ ناول بلوچستان کے گردوپیش کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں کہیں کہیں اردو کے مقامی لہجے کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

عاطقہ

عاطقہ ایک معاشرتی گھریلو کہانی پر مبنی ناول ہے۔ قریباً پانچ سو صفحات پر پھیلے ہوئے اس ناول کی کہانی کچھ یوں ہے کہ رضوان محکمہ جنگلات کا ایک افسر ہوتا ہے اس کی شادی سعدیہ سے ہوتی ہے جسے وہ دل سے چاہتا ہے۔ ان کا ایک خوبصورت بیٹا پیدا ہوتا ہے جس کا نام عمران رکھا جاتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے عمران کو کوئی اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ دونوں میاں بیوی کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد خدا ان کو دوسرا بیٹا دیتا ہے جس کا نام کامران رکھا جاتا ہے مگر سعدیہ عمران کا غم نہیں بھولتی۔ سعدیہ کا بھائی آصف شہر کا امیر ترین آدمی ہوتا ہے۔ تقدیر عمران کو شہاب کے روپ میں آصف کے گھر لے آتی ہے جسے وہ ایک پہاڑی آدمی سے خرید لیتا ہے تاکہ وہ بچہ پڑھ لکھ کر اچھا انسان بن جائے۔ آصف کی اکلوتی بیٹی کا نام عاطقہ ہوتا ہے اور اسی کے نام پر ناول کا نام رکھا گیا ہے۔ شہاب اور عاطقہ ایک گھر میں رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف کامران بھی عاطقہ کو پسند کرتا ہے۔ آصف اپنی بہن سعدیہ کی خواہش پر عاطقہ کا رشتہ کامران سے طے کر دیتے ہیں۔ سعدیہ کا اس دوران انتقال ہو جاتا ہے۔ تب نہ چاہنے کے باوجود عاطقہ کی کامران سے شادی ہو جاتی ہے مگر وہ دونوں میاں بیوی نہیں بن سکتے بلکہ ایک دوسرے سے اجنبی ہی رہتے ہیں۔ یوں انسانوں کے تعلقات پر معاشرتی اور خاندانی جبر کھل کر سامنے آتا ہے۔ شہاب کی زندگی میں ایک اور پہاڑی لڑکی شیرین آتی ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ اس پٹھان کی بھتیجی ہوتی ہے۔ جس نے شہاب کو اغوا کیا ہوتا ہے اور آصف کے ہاتھ بیچنے سے قبل وہ اس کی منگنی بھی شیریں سے کر چکا ہوتا ہے۔ اس لیے شیرین اپنے منگیتر کی تلاش میں پھرتی ہے جو بالآخر اسے مل جاتا ہے۔ شہاب کو جنگل میں سانپ کاٹ لیتا ہے تو وہ زہر چوس کر اس کی جان بچاتی ہے مگر خود جانبر نہیں رہ پاتی اور مر جاتی ہے۔ شہاب گھر پہنچ کر ان تمام حالات سے بددل ہو کر خودکشی کر لیتا ہے۔ عاطقہ اور اس کے گھر والے جب اس سانحہ کی اطلاع پر آصف ولا آتے ہیں تو عاطقہ کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور وہ بھی مر جاتی ہے تب باقی سب گھر والوں پر کھلتا ہے کہ شہاب دراصل بچپن میں کھویا ہوا عمران ان کا اپنا بیٹا ہی تھا جسے بھیک منگوں کی اولاد سمجھ کر وہ اس سے عاطقہ کی شادی نہیں کرتے۔ تب رضوان کو سخت دکھ ہوتا ہے کہ وہ اتنا قریب رہنے کے باوجود شہاب یعنی عمران کو پہچان نہیں سکا۔ آخر میں ان تینوں یعنی شہاب، عاطقہ اور شیرین کو قریب قریب دفن کر دیا جاتا ہے۔ سعدیہ کی وفات کے بعد رضوان کی زندگی میں ایک اور عورت انجم آتی ہے جو ان کی دور کی رشتے دار اور نوجوانی میں بیوہ ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں مگر کھل کر اس کا اظہار نہیں کر پاتے اور ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے ہیں جو غیر فطری لگتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی ناول میں کئی جز وقتی کردار اور واقعات پیش آتے ہیں مگر ان کا تذکرہ ضروری نہیں۔ مصنفہ کی زبان اہم ہے۔ ایک کمرشل ناول کے طور پر سامنے آنے کے باوجود اس میں اردو زبان کے روزمرہ محاورے اور ضرب المثال کا استعمال ملتا ہے مثلاً لاج رکھنا، الابلا، بالائے طاق رکھنا، پھولے نہ سمانا، رونگھٹے کھڑے ہونا، قیامت ٹوٹ پڑنا، صبر کا دامن چھوٹنا، زمین نگل جانا، آسمان کھا گیا، چھاچھ پھونک پھونک کر پینا، شلجموں سے مٹی جھانا (پنجابی محاورہ)، سینے پر سے سل اٹھانا، گدڑی کا لعل، آگ بگولہ ہونا، بائیں ہاتھ کا کھیل، جنگل کی آگ کی طرح پھیلنا، ریت میں بیج بونا، آج مرے کل دوسرا دن ہونا، تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنا اور بوڑھی گھوڑی لال لگام وغیرہ ان میں سے چند ایک ہیں۔ یاسمین صوفی اپنی تحریر میں انگریزی کے عام الفاظ بے تکلف استعمال کرتی ہیں۔ مثلاً سلیپر، وارڈ روب، اٹیچی، آسٹرلک، فیڈل، نیپکن، واسکٹ، ناول، پیکٹ، ہینگر، باسکٹ، سوٹ، شاپنگ اور میچنگ وغیرہ اسی طرح بعض ہندی الفاظ مثلاً سہاگن، بھاگن اور دیپ بھی ملتے ہیں۔ ناول میں بعض جگہ مخصوص لہجے بھی ملتے ہیں مثلاً رضوان کی اماں کا بڑی بوڑھیوں کے انداز میں یہ کہنا ''خدایا اماں باوا کے زیر سایہ پروان چڑھایو''۔[۱۷] یا پٹھان اغوا کار کا کھردرا لہجہ جو ناول میں ایک جگہ یوں ملتا ہے:۔ ''ہاں ہم اس کا باپ ہے۔ مطلب کا بات کرو، سیٹھ بات چکانی ہے تو جلدی کرو، ہم کو اور بھی کام ہے۔''[۱۸]

ناول میں غالب اقبال سمیت مختلف شعراء کے اشعار اور مصرعے بھی ملتے ہیں اور جا بجا مختلف پرانے گیت جو نور جہاں اور رونا لیلیٰ نے گائے ہیں ان کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ اگر چہ یہ ادبی ناول کے زمرے میں نہیں آتا ہے مگر کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری، واقعات اور زبان و بیان کی جملہ خوبیوں سے متصف ہے۔

تلاش

یہ ایک گھریلو معاشرتی ناول ہے جو قریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے جس کا مرکزی کردار سعدیہ نامی لڑکی ہے۔ ایک بس حادثے میں سعدیہ کی واحد زندہ ہستی ماں بھی مرجاتی ہے اور وہ اتفاقیہ طور پر مدد کے لیے پہنچنے والے نوجوان خرم کے ذمے اپنی بیٹی کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ خرم بینک افسر ہوتا ہے۔ وہ کچھ دن سعدیہ کو اپنے پاس رکھتا ہے مگر پھر لوگوں کے خوف سے اُسے دوسرے شہر اپنے والدین کے پاس بھیج دیتا ہے جہاں سعدیہ بدترین حالات سے گزرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خرم کی ماں اُسے اپنے بیٹے کی بیوی بنتا نہیں دیکھنا چاہتی کہ وہ خرم کی شادی اپنی بھانجی سے کرنا چاہتی ہے۔ خرم کی ماں سعدیہ کا جینا دوبھر کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خرم کی نظروں سے گر جاتی

ہے۔آ خراُسے گھر سے دھتکار دیا جاتا ہے۔اسی اثنا میں خرم کا دوست ڈاکٹر جمشید جو سعدیہ کو پسند کرتا ہے اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ وہ اُس سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے مگر سعدیہ انکار کر دیتی ہے کہ وہ دل سے خرم کو چاہتی تھی مگر ان کے مابین پیار کے اظہار کی نوبت نہیں آ پاتی۔سعدیہ مشکل حالات میں نرس بننے کا فیصلہ کرتی ہے اور اپنی زندگی ہسپتالوں میں مریضوں کی تیمارداری میں بسر کرتی ہے۔وہ یہاں کچھ دوست بناتی ہے جن میں سے ایک روحی ہوتی ہے جس کی شادی تصور نامی آدمی سے ہوتی ہے۔دوسری طرف خرم کی شادی اپنی خالہ زادہ ناجیہ سے ہو جاتی ہے۔ناجیہ اور روحی ایک ہی وقت میں ہسپتال میں داخل ہوتی ہیں۔ جہاں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں۔روحی جانبر نہیں ہو پاتی اور بچے کی پیدائش کے بعد مر جاتی ہے۔سعدیہ موقع پا کر ان کے بچے تبدیل کر دیتی ہے۔خرم اور تصور کے بچے کو اپنے گھر لے جاتے ہیں اور تصور خرم کے بیٹے کو اپنے گھر لے آتا ہے جہاں روحی کی وفات کے بعد سعدیہ اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔تصور اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہے اور اس کی موت کے بعد نیم دیوانہ ہو جاتا ہے بالآخر اپنی ساری جائیداد بیٹے کے نام کر کے خودکشی کر لیتا ہے اور سعدیہ ان کے بیٹے کی (جو اصل میں خرم کا بیٹا ہوتا ہے) پرورش کرنے لگتی ہے۔ کچھ عرصے بعد خرم کو اپنے بیٹے کے چہرے میں روحی کے خدوخال نظر آتے ہیں تو وہ معاملہ سمجھ جاتا ہے۔ادھر تصور کے بیٹے کا نام سعدیہ خرم رکھتی ہے اور وہ ہو بہو اپنے اصل باپ یعنی خرم کی شکل وصورت کا ہوتا ہے۔دو چار سال بعد روحی کے ننھیال کے لوگ آ کر اس کے بیٹے خرم کو سعدیہ سے لے جاتے ہیں کہ وہ ان کی بیٹی کی واحد نشانی ہے۔سعدیہ اسے بادل ناخواستہ خود سے جدا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔پھر ایک دن خرم بیمار ہو کر سعدیہ کے ہسپتال میں داخل ہوتا ہے جہاں وہ اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔خرم کو اُس سے انس ہو جاتا ہے جو رفتہ رفتہ محبت میں بدل جاتی ہے۔سعدیہ کو اگرچہ یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے مگر وہ اس صورت حال کو ذہنی طور پر بظاہر قبول نہیں کرتی۔مگر جب نوجوان خرم اس سے اپنائیت کا دوٹوک اظہار کرتا ہے اور اس کے انکار پر خودکشی کا عملی اقدام اٹھاتا ہے تو وہ مجبور ہو جاتی ہے اور اس کی بات مان جاتی ہے۔اگرچہ کہانی میں کئی واقعات ایسے بیان ہوئے ہیں جو غیر منطقی ہیں مثلاً سعدیہ کا ایک طویل عرصہ تک پہلے خرم اور پھر ڈاکٹر جمشید سے کسی رشتے میں منسلک نہ ہونا نوجوان ہونے کے باوجود بہت زیادہ قنوطی ہونا اور پھر آخر میں خرم کے بیٹے سے محبت کا معاملہ مگر آخری عمل سے ناول نگار نے اپنی کہانی میں جو ٹوسٹ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس سے قاری کے لیے سعدیہ کے ایک عام سی معاشرتی کہانی میں دلچسپی کا عنصر بہر حال پیدا ہو جاتا ہے۔ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ناول میں کئی مقامات پر ایسے جملے ملتے ہیں جس کی قرات یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس ناول کو کمرشل ناول کے زمرے میں شامل نہ کیا جائے۔مثال کے طور پر درج ذیل جملے ملاحظہ

ہوں:

☆ محبت زبردستی کا سودا نہیں۔

☆ تقدیر کے ہاتھوں بڑے سے بڑا شہ سوار بھی مات کھا جاتا ہے۔

☆ بند کر دیہ کھیل تماشے انسان بندر نہیں جسے ڈگڈگی بجا کر نچایا جائے۔

☆ انسان سنولائٹ کا بوا نہیں جسے سلایا تو سو گیا، جگایا تو جاگ گیا۔

☆ خاموشی سونا ہے۔

☆ انسان وقت کے قدموں تلے روندا جاتا ہے اور تنہائی کا احساس گمبھیر ہو جاتا ہے۔ [19]

درجہ بالا جملوں سے ناول نگار کا فکری اور فنی شعور پوری طرح جھلکتا ہے۔ ان جملوں کی ساخت اس کے ناول کے فن سے پوری واقفیت اور اپنی تخلیق سے سنجیدگی ظاہر کرتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی تحریر میں اردو محاورات کا استعمال بھی کرتی ہے۔ ان میں مشتے از خروارے کے طور پر سر منڈاتے ہی اولے پڑنا، ذہن پر بھوت سوار ہونا، ڈنکے کی چوٹ پر کہنا، جان ہے تو جہان ہے، سنگ باش برادر خورد مباش اور ہاتھوں کے طوطے اڑنا شامل ہیں۔ اس طرح کے اور محاورات بھی ملتے ہیں جبکہ وہ اپنی اردو تحریر میں انگریزی کے الفاظ بھی وافر استعمال کرتی ہیں۔ ان میں رسٹ واچ، فروٹ، جام، ریسٹ فراڈ، ڈسچارج، لیکچر اور گائیڈ وغیرہ شامل ہیں۔ اس سے ناول کی مصنفہ کی ہر دو زبانوں سے پوری طرح شناسائی کا پتہ چلتا ہے۔ یاسمین صوفی کے ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے مبارکہ حمید لکھتی ہیں:

ان کی تحریروں میں جذبوں کا گداز اور رنج والم ملتا ہے۔ ان ناولوں میں انھوں نے عورت کے جذبات کو بیان کیا ہے۔ ان کے ناولوں کی ہیروئن عورت کی عظمت کا سمبل ہے، جو ماں، بیوی، بیٹی ہے، لیکن وہ زندگی کے ہر دور میں قربانی دینے والی اور ضبط وصبر کا پیکر ہے۔ [20]

امائمہ

یہ ایک رومانوی اور معاشرتی ناول ہے۔ قریباً چار سو صفحات پر مشتمل اس ناول میں دو محبت کرنے والوں پر معاشرتی جبر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار امائمہ ہے جس کے نام پر ناول کا عنوان ہے۔ عامر نامی نوجوان اس سے محبت کرتا ہے اور شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس کی والدہ نے بچپن ہی میں عامر کا نکاح انڈیا میں مقیم اپنے بھائی کی بیٹی سے کیا ہوتا ہے مگر اس کا پتہ اسے اپنے ماموں زاد بھائی کی شادی میں انڈیا پہنچ کر چلتا ہے۔

عامر جب حکمت عملی سے واپس آنے میں کامیاب ہوتا ہے تب تک امائمہ کی شادی اپنے ولایت پلٹ خالہ زاد بھائی سے ہو چکی ہوتی ہے جو اپنی بدکرداری کی بدولت اس پر بے جا ستم ڈھاتا ہے۔ عامر محبت میں ناکامی کے بعد ایک گلوکار بن جاتا ہے اور پھر ہارٹ اٹیک سے فوت ہو جاتا ہے مگر مرنے سے پہلے اپنی آنکھیں ایکسیڈنٹ میں زخمی اور نابینا ہو جانے والے امائمہ کے شوہر کو دے جاتا ہے۔ امائمہ ہوش و حواس کھو کر اشعر کو عامر سمجھتی ہے مگر پھر ایک دن اشعر کو گولیاں مار کر اس کی آنکھیں پھوڑ دیتی ہے اور پاگل خانے پہنچ جاتی ہے۔ اس ناول میں اعلیٰ اور امیر گھرانوں کے بڑوں کی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی کو اُجاگر کیا گیا ہے جو نوجوانوں کی زندگیاں تباہ کر دیتی ہے۔

ناول امائمہ میں منظر نگاری مہارت سے کی گئی ہے جب کہ مختلف کرداروں کے درمیان مکالمے بھی اچھے انداز میں ملتے ہیں۔ ایک رومانوی ناول ہونے کی وجہ سے اس میں جذباتی مناظر اور جذبات نگاری بھی نظر آتی ہے۔ یاسمین صوفی شستہ، سلیس اور رواں نثر لکھنے پر قدرت رکھتی ہیں۔ اس لیے یہ ناول خواتین اور کمرشل ناول کے قارئین کے ذوق پر بخوبی پورا اترتا ہے۔ ناول میں اردو روزمرہ، محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتیں کافی تعداد میں ملتی ہیں۔ ناول میں پٹھان چوکیدار کا کردار بعض جگہ پشتو الفاظ استعمال کرتا ہے مثلاً ''پخیر راغلے'' (خوش آمدید) مورہ واخلہ (امی لے لو)، تاوخورا (تم کھالو) وغیرہ کے ساتھ ساتھ اردو کے بلوچستانی لہجے میں گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ عامر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ ''مرا بچہ، صبر کرو۔۔۔ صبر۔۔۔ یہ موہبت کسی کو نہیں ملتا۔ آدم کو درخانے موسیٰ کو گل مکئی اور جلات کو اس کا مابوبہ کب مل گیا؟ جو تم کو امائمہ مل جاتا۔''[۲۱]

محولہ بالا اقتباس میں نہ صرف بلوچستان کا مقامی اردو لہجہ ملتا ہے جس کا پتہ محبت اور محبوبہ جیسے الفاظ کے تلفظ اور املا سے چلتا ہے۔ بلکہ اس میں آدم درخانے، موسیٰ گل مکئی اور جلات کے تاریخی کرداروں کے تذکرے سے یہاں کی تاریخی، رومانوی داستانوں سے مصنفہ کی آگاہی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ پھر جس فطری انداز میں برمحل ان ناموں کا ذکر آیا ہے وہ خصوصاً قابل داد ہے۔

یہ کمرشل ناول ہے مگر جب عامر انڈیا میں مقیم ہوتا ہے تو اس زمانے میں وہاں ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات پھوٹنے کا تذکرہ ناول میں ملتا ہے۔ عامر کا اپنے ماموں کے ساتھ مباحثہ بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں ماموں اسے انڈیا میں آزادی کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیتے ہیں مگر وہ انھیں بتاتا ہے کہ یہاں تو مذہبی آزادی تک نہیں بلکہ تنگ نظری ہے۔ وہ انھیں یہ بھی بتاتا ہے کہ حقیقی آزادی اصل میں ہر رشتے سے افضل ہے۔ آزادی کے حوالے سے وہ

پاکستان کوفوقیت دیتے ہوئے ماموں سے مخاطب ہوکر کہتا ہے۔ ’’آپ میرے ساتھ پاکستان چلیے ۔۔۔کم ازکم بے موت مرنے کا خدشہ تو نہیں رہے گا۔‘‘ [۲۲]

ان باتوں سے ناول امــائـمــہ میں مصنفہ کے سیاسی اور ثقافتی رجحانات اوراس کے سیاسی وسماجی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

فریحه

یہ رومانوی ناول ہے مگر اس کی خاص بات اس کا لوکیل اور وقت کا دورانیہ ہے۔ ناول کا مرکزی کردار فریحہ اور احمد کراچی سے تعلق رکھتے ہیں مگر فریحہ کے کچھ رشتے دار ڈھاکہ میں رہتے ہیں اس لیے ان دونوں کی وہاں آمدورفت نظر آتی ہے۔ یہ ناول جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت تک سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ رونما نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مصنفہ نے اپنے مرکزی کرداروں کو مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں گھومتے پھرتے دکھایا ہے۔ ناول کے دونوں مرکزی کرداروں کے درمیان محبت بھی چٹا گانگ اور دیگر علاقوں کی سیاحت کے دوران پروان چڑھتی ہے اور فریحہ کی شادی احمد کی بجائے اپنے پھوپھی زاد بھائی فواد سے ہوتی ہے اور اسے ایک عرصہ ڈھاکہ میں رہنا پڑتا ہے۔ ناول میں ڈھاکہ، چٹا گانگ اور رنگامتی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ ناول سقوطِ ڈھاکہ کے سال ہی اشاعت پذیر ہوا مگر اس میں اس خاص صورت حال کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ایک جگہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے جغرافیائی خدوخال کا تقابلی ذکر آتا ہے اور دونوں طرف کے کسانوں کی محنت شاقہ پر مختصر تبصرہ ملتا ہے۔ ناول فـریـحـہ اگرچہ پاپولر ناول کے زمرے میں شامل ہے اور ایک گھریلو فارمولا کہانی پر مبنی ہے مگر اس میں مارکسی یا ترقی پسند رجحان کا ہلکا سا عکس ذیل کے اقتباس میں ملتا ہے۔ جب احمد کہتا ہے:

> مجھ میں اتنی طاقت گفتار ہے کہ میں قومی نظریات بدلوا سکوں اور ہر آزاد ذہن میری بات بخوبی سمجھ سکے کہ دولت کی تقسیم کس طرح ہو۔ کوئی تو سوکھی روٹی کے ٹکڑے کو ترسے اور کوئی اپنے کتوں کو دودھ ڈبل روٹی کھلائے۔ کوئی مخمل وکمخواب کے بستر پر سوئے تو کسی کو ایک اینٹ کا سرہانہ ملے۔ کوئی محل بنا کر عیش کرے تو کوئی موسم سرما کی طویل راتوں میں بغیر چھت کے بیٹھ کر رات گزارے۔ [۲۳]

دیکھا جائے تو محولہ بالا اقتباس سے اس کی مصنفہ کا ترقی پسندانہ نظریات سے متاثر ہونا صاف نظر آتا

ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ایک پاپولر ادیبہ اپنے خیالات کا اظہار اس پختہ انداز میں بغیر لگی لپٹی کرتی ہے۔ جہاں تک اسلوب کی بات ہے، اس ناول میں بھی بامحاورہ شستہ اور رواں زبان ملتی ہے جبکہ کئی جگہ بعض کرداروں کا مخصوص لہجہ بھی نظر آتا ہے۔ بلوچستان کی ان خواتین ناول نگاروں کے حوالے سے فاروق احمد کی یہ رائے درست ہے کہ ''بلوچستان میں ناول نگاری کا رجحان اگرچہ کم رہا ہے، تاہم رفعت زیبا، شاہین روحی بخاری، یاسمین صوفی نے کئی اہم اور دلچسپ ناول لکھے ہیں۔'' ۲۴

حمیدہ جبیں (پ ۱۹۴۳ء) کی ناول نگاری

حمیدہ جبیں کا شمار بھی بلوچستان میں پاپولر ناول لکھنے والی اہم خواتین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جو مقبول عام ناول لکھے ہیں، ان کا الگ الگ مطالعہ بہ تفصیل آگے پیش کیا جاتا ہے۔

گیت یہ میرے

حمیدہ جبیں نے اسے ایک اصلاحی رومانی ناول قرار دیا ہے۔ اس سے مصنفہ کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے کہ اس میں رومان بھی ہے اور بعض کرداروں کی اصلاح بھی دکھائی گئی ہے۔ اس کا مرکزی کردار فیصل نامی ایک خوبرو اور معروف گلوکار ہوتا ہے، جو روشنی سے محبت کرتا ہے، مگر روشنی اپنی والدہ کی وجہ سے اس سے شادی نہیں کر پاتی تو وہ انتقام پر اتر آتا ہے۔ وہ عورت ذات کو کھلونا سمجھ کر کئی خوبصورت لڑکیوں کی عزتوں سے کھیلتا ہے، مگر سکون سے محروم رہتا ہے۔ بالآخر اسے روشنی کی مجبوری کا پتہ چلتا ہے تو وہ اپنی ان مذموم حرکات سے باز آجاتا ہے۔ پھر شمائلہ نام کی ایک لڑکی اس کی زندگی میں آتی ہے۔ جو اوائل عمری میں اپنے ماں باپ سے محروم ہوتی ہے اور ماموں کے گھر پر پلتی ہے۔ جوان ہونے پر وہ اس کی شادی زبردستی ایک بوڑھے شخص سے کرنا چاہتے ہیں مگر وہ گھر سے فرار ہو کر لاہور آجاتی ہے۔ یہیں وہ فیصل سے ملتی ہے۔ ناول میں کوئٹہ کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ جب شمائلہ اپنی سہیلی کے پاس جانا چاہتی ہے اور فیصل اسے کوئٹہ چھوڑنے جاتا ہے اور پھر اس کی محبت میں مبتلا ہو کر دوبارہ کوئٹہ جاتا ہے چونکہ مصنفہ کوئٹہ میں رہتی تھیں لہٰذا انھوں نے ایک طرح سے کوئٹہ میں ناول کے مرکزی کرداروں کو دکھایا ہے مگر اس میں بلوچستان کی ثقافت کا کوئی پہلو البتہ اپنی جھلک نہیں دکھاتا۔

دل کا شہر

ناول دل کا شہر محبت کے موضوع پر ایک کمرشل ناول ہے جو چھوٹے سائز کے 454 صفحات پر مشتمل ہے اس ناول کا ہیرو دانش ایک امیر اور دولت مند آدمی ہوتا ہے جو کلب میں اٹھتا بیٹھتا اور عورتوں کے ساتھ آزادی' میل جول رکھتا ہے۔ وہ ایک وجیہہ شخص ہوتا ہے اس لئے کلب کی اکثر عورتیں اس کی طرف مائل ہوتی ہیں مگر وہ انہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ دانش ایک دولت مند شخص ہونے کے باوجود ایک ہمدرد دل کا مالک ہوتا ہے۔ اس کا صرف ایک دوست انور ہے جو غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اسے غریبوں سے ہمدردی ہوتی ہے۔ دانش ایک روز بارش کے باعث گاڑی خراب ہونے پر انور کی ٹیکسی لے کر روانہ ہوتا ہے کہ راستے میں اسے آرزو نام کی لڑکی ملتی ہے' جو سکول ٹیچر ہوتی ہے۔ دانش کو وہ سادہ اور عام سی لڑکی اچھی لگتی ہے اور وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو کر ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں اسے گھر سے سکول پہنچانے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں محبت ہو جاتی ہے دانش اسے اپنی اصلیت اس لئے نہیں بتاتا کہ آرزو کو دولت مندوں سے نفرت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کی ماں اس کی پیدائش کے بعد اسے اور اس کے باپ کو چھوڑ کر ایک دولت مند آدمی کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ آرزو کئی جگہ دولت مندوں سے نفرت کا اظہار کرتی ہے ایک موقع پر وہ کہتی ہے۔ ''میں نے ہمیشہ غریبوں کو حالات کی چکی میں پستے دیکھا ہے اور پتہ ہے وہ حالات کس نے پیدا کئے ہیں انہی دولت مندوں نے۔''[۲۵]

کرداروں کے اس طرح مکالمے سے ان کے مارکسی خیالات کا دوٹوک اظہار ہوتا ہے۔ جس سے ان کے ترقی پسند رجحان کی عکاسی ہوتی ہے۔

ایک موقع پر جب آرزو، دانش کو امیرانہ روپ میں دیکھتی ہے تو وہ اسے اپنا ہم شکل بھائی بتاتا ہے جس سے ناراضگی کی وجہ سے وہ ٹیکسی ڈرائیور بنا پھرتا ہے تاہم یہ بات زیادہ دیر چھپی نہیں رہتی اور آرزو کو پتہ چل جاتا ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور راجہ ہی اصل میں دانش ہے۔ کلب میں دانش کو مسز رشید کے روپ میں ملنے والی خاتون یہ برداشت نہیں کرتی کہ دانش اسے چھوڑ کر ایک غریب لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو وہ دانش سے اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام ہونے کا بدلہ لینا کا عہد کرتی ہے اور پہلے آرزو سے سکول کی جاب چھڑاتی ہے اور پھر اسے اپنے آفس میں جاب کی آفر کرتی ہے جہاں وہ ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے ایسے حالات پیدا کرتی ہے کہ خود کو بلیک میل کرنے والے صابر کو خود قتل کرتی ہے مگر اس کا الزام آرزو کے سر جاتا ہے اور تمام تر ثبوتوں کے باعث اس کی سزا یقینی نظر آتی ہے

تب ایک ڈرامائی موڑ آتا ہے اور یہ راز کھلتا ہے کہ آرزو رصل مسز رشدی کی ہی بیٹی ہے جب عدالت آرزو کو سزا سنانے لگتی ہے اس وقت مسز رشید قتل کا اعتراف کرتے ہوئے تمام حقائق بتا دیتی ہے یوں مسز رشید کو سزا ملتی ہے اور آرزو باعزت رہا ہو کر دانش کے ساتھ چل پڑتی ہے ناول میں دولت کو لالچ کے برے نتائج اور بعض معاشرتی حقائق کو کہانی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ یہ ایک کمرشل ناول ہے۔ اپنے دائرے میں اسے ایک اچھا ناول کہا جا سکتا ہے۔

شاخ بریدہ

یہ ناول ایک گھریلو کہانی پر مبنی ہے۔ اس کا مرکزی کردار نمو نامی لڑکی ہے جس کے والد اس کی پیدائش سے پہلے اور والدہ اس کی پیدائش پر انتقال کر جاتی ہیں۔ اس لیے اسے منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پرورش اس کی دادی کرتی ہیں۔ مگر ان کی وفات کے بعد وہ اپنے چچا کے گھر آ جاتی ہے۔ جہاں اس کی چچی اور چچا زاد بہن نجمہ اس سے برا سلوک روا رکھتی ہیں۔ دادی مرنے سے پہلے نمو کے نام اپنی ساری جائیداد کر جاتی ہیں۔ نجمہ کا رشتہ اس کے خالہ زاد منصور سے بچپن میں طے ہو چکا ہوتا ہے۔ جب وہ لندن سے ڈاکٹر بن کر آتا ہے تو اسے ملازمت کی وجہ سے نجمہ کے گھر رکنا پڑتا ہے۔ وہ نجمہ کی بجائے نمو میں دلچسپی لیتا ہے اور ان میں باہم محبت پروان چڑھنے لگتی ہے۔ جب بات کھلتی ہے تو منصور کی والدہ اس کی شادی نمو سے کرنے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔ منصور دلبرداشتہ ہو کر باہر نکلتا ہے تو اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ وہ ہسپتال میں قریب المرگ ہوتا ہے کہ نمو کسی کے علم میں لائے بغیر اُسے اپنا خون دیتی ہے جس سے منصور کی جان بچ جاتی ہے مگر نمو مصیبت میں پڑ کر بالآخر ہلاک ہو جاتی ہے۔ تب دیگر لوگوں کو اس کی قربانی کا احساس ہوتا ہے مگر اب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ منصور اس حادثے کے باعث ہمیشہ کے لیے ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ یوں مرکزی کرداروں کے المناک انجام پر یہ روایتی کہانی ختم ہوتی ہے۔

اس ناول میں صرف ایک جگہ بلوچی لفظ وش یعنی میٹھا استعمال ہوا ہے۔ جبکہ ناول میں اردو محاورے اور روزمرہ کا استعمال بھرپور طور پر نظر آتا ہے۔ حمیدہ جبیں کی زبان صاف شستہ اور رواں ہے مگر اس کا موضوع گھریلو اور معاشرتی حوالے سے انسانوں کی ضد اور شادی کے نامناسب رشتے وغیرہ ہے۔

راستے

یہ محبت کے موضوع پر ایک روایتی سا کمرشل ناول ہے۔ ناول کا مرکزی کردار جہانزیب پاک فضائیہ میں

پائلٹ افسر ہوتا ہے۔ وہ اپنے چیف انجینئر کی بیٹی نائمہ کا پسند کرتا ہے۔ جلد ہی دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ جہانزیب ایک خفیہ مشن پر مشرقی پاکستان [بنگلہ دیش] سے آتے ہوئے حادثے کا شکار ہو کر کشمیری مجاہدین کے ہاتھ لگتا ہے اور کچھ عرصہ ان کے ساتھ مل کر بھارت کے خلاف کارروائیاں کرتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں اسے مردہ قرار دے کر نائمہ کا رشتہ ایک اور جگہ طے کر دیا جاتا ہے۔ اس کا نیا منگیتر سیف، جہانزیب کا دوست ہوتا ہے۔ ایک فضائی حادثے میں سیف ہلاک ہو جاتا ہے اور جہانزیب اور نائمہ دوبارہ رشتے میں جڑ جاتے ہیں۔ اس عام سے ناول کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کشمیر میں جاری آزادی پسندوں کی عسکری جدوجہد دکھائی جاتی ہے۔ مصنفہ نے غالباً حب الوطنی کے جذبے کے تحت جہادِ کشمیر کی عکاسی اپنے ناول میں کی ہے۔ ناول کے بیشتر کردار بھی مختلف فوجی اداروں کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ لوگ ہیں۔ اس میں مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے میں مکتی باہنی کا ذکر بھی ہے۔ مختلف کرداروں کا ٹریننگ کے لیے کوئٹہ آنے کا ذکر شاید اس لیے ملتا ہے کہ اس ناول کی مصنفہ کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ ناول راستے میں حمیدہ جبیں کے سماجی اور سیاسی شعور کی جھلک بہت واضح نظر آتی ہے۔ لوگ کس طرح اپنی وفاداریاں بدلتے ہیں، کیسے مادی فوائد کے لیے سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ناول میں معاشرتی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اسی طرح انسانی حقوق اور اظہارِ آزادی کے بارے میں اہم سوال اٹھاتے ہوئے مصنفہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> کیا ہمارے سماج میں سوچنے اور اپنی سمجھ کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہے۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو سماج کے رحم و کرم پر ہیں۔ ہزاروں بندشیں، سینکڑوں رکاوٹیں ہیں جو ہر قدم پر ہماری راہ روکے کھڑی ہیں۔[۲۶]

محولہ بالا اقتباس میں پاکستانی معاشرے کی سماجی صورتحال اور اس میں فرد کی ذہنی وفکری آزادی پر سنجیدہ نوعیت کے جو سوال اٹھائے گئے ہیں، وہ موجودہ حالات کے تناظر میں خاصے اہم ہیں اور تفصیلی بحث کا تقاضا کرتے ہیں۔ ناول میں بعض جگہ ایسے مختصر جملے اسے کسی حد تک اہم ضرور بنا دیتے ہیں۔

انور رومان کا ناولٹ

انور رومان کا ذکر افسانے کے باب میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ اس مقالے میں پہلی بار انھیں نئے تحقیقی شواہد کی بناء پر بلوچستان میں اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا گیا ہے۔ انور رومان نے ایک ناولٹ بھی لکھا ہے، جو

بلوچستان کے پس منظر میں ہے،اس ناولٹ کا تفصیلی تعارف آگے پیش کیا جاتا ہے۔

خانہ بدوش

یہ انور رومان کا تقریباً ایک سوصفحات پر مشتمل مختصر ناول ہے جوصرف اٹھارہ انیس دنوں میں لکھا گیا ہے۔ یہ مختصر ناول نہ صرف کوئٹہ یعنی بلوچستان میں لکھا گیا ہے بلکہ اس میں پیش کردہ منظر نامہ، کردار اور موضوع بھی بلوچستان سے متعلق ہے۔ جیسا کہ اس ناول کے نام سے ظاہر ہے یہ بلوچستان کے اس خانہ بدوش گھرانے کی کہانی ہے جو پہاڑی علاقے سے آ کر میدانوں کی طرف مزدوری کی غرض سے جاتا ہے تو پیچھے ایک سرداران کے علاقے پر قابض ہو جاتا ہے۔ کچھی کے میدان میں وہ ہاری اور مزارع کی حیثیت سے جس زمیندار کی زمین پر کام کرتے ہیں وہ انہیں تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ اس خانہ بدوش گھرانے کے دو بچے لشکران اور شرفو اس صورت حال میں کچھی کی زمینوں سے آگے سندھ اور پنجاب میں مقدر آزمائی کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ جہاں انہیں سازگار حالات ملتے ہیں۔ نہ انھیں نہ صرف پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہے بلکہ وہ ایک سرسبز اور شاداب علاقے میں رہنے اور اچھی خوراک کے باعث مضبوط جوان بن جاتے ہیں۔ وہ جس چرواہے کے پاس رہتے ہیں وہ انھیں اپنے بیٹے بنا کر رکھتا ہے۔ پھر ایک دن اس کی بہن صفو پنجاب سے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ آتی ہے جن کے نام ثمینہ اور بحرینہ ہوتے ہیں۔ لشکران اور شرفو کی ان بہنوں سے شادی کر دی جاتی ہے اور یہ دونوں ان کے ساتھ پنجاب کی طرف چل پڑتے ہیں جہاں وہ صفو کی دولت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ یہ دونوں آرام وسکون کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ناداروں کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ انھیں روٹی کپڑا اور مکان دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ناول کا مصنف اس زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی نعرے روٹی، کپڑا اور مکان سے متاثر ہوا ہے جس کا اظہار اس نے یہاں کیا ہے۔ غالباً یہ بھٹو کے معروف سیاسی نعرے کا پہلا ادبی استعمال ہے جو کوئٹہ میں انور رومان کے اس ناول میں نظر آتا ہے۔ پنجاب سے لشکو اور ثمینہ صفو کے بھائی اور ثمینہ کے ماموں یاور خاں کی طرف صوابی یعنی خیبر پختونخوا جاتے ہیں۔ گویا لشکو بلوچستان سے نکل کر باقی شہروں اور صوبوں میں امن وسکون سے رہائش کرتا نظر آتا ہے اور مختلف جغرافیائی خطوں، موسموں اور ثقافتوں سے روشناس ہوتا ہے۔ لشکران کو اندر ہی اندر سے احساس ہوتا ہے کہ اُسے واپس اپنے صوبے بلوچستان جانا چاہیے۔ جہاں تاریکیوں کا راج ہے اور ظلم کی حکمرانی ہے۔ اسے بلوچستان کو ان زنجیروں سے آزاد کرانا چاہیے اسے باقی تین صوبے روشن مگر بلوچستان میں تیرگی کا احساس ہوتا ہے وہ سوچتا ہے وہ پہاڑوں اور میدانوں کاریزوں اور چشموں،

آبشاروں اور جھیلوں، باغوں اور نخلستانوں، راستوں اور منزلوں اور ظاہر و مخفی نعمتوں پر جابر و قاہر لوگ جسیم و مہیب قفلوں کی طرح مسلط تھے۔ جب تک یہ قفل ہتھوڑوں سے نہ توڑے جائیں اس وقت تک بلوچستان کو آزادی اور زندگی حاصل نہ ہوسکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ یہاں ظلم و جبر کا سزوار جاگیرداری اور سرداری نظام کو قرار دیا گیا ہے مگر لشکو جب بلوچستان پہنچتا ہے تو اسے کوئی جدوجہد نہیں کرنا پڑتی کیونکہ ظالم لوگ مرکھپ گئے ہوتے ہیں اور بلوچستان اَن دیکھی زنجیروں سے آزاد ہو چکا ہوتا ہے۔ ناول کا یہ حصّہ کمزور نظر آتا ہے کہ ظالم اور جابر خود بخود ہلاک بتائے جاتے ہیں اور ناول کے ہیرو کو عملی طور پر ان کے خلاف نبرد آزما نہیں دکھایا جاتا۔ شکو کا خاندان بھی ختم ہو چکا ہے تب وہ بلوچستان کی بہتری کا خواب دیکھتا ہے کہ یہ بھی ترقی کرے اور ملک کے دیگر حصوں، صوبوں کے برابر ہو جائے اس وقت اسے چشما ور ماما کہتا ہے:

> تم خانہ بدوشوں کی جوان روح ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم یقیناً ہمیں اس منزل کی طرف لے چلو گے جس میں سارے پاکستان کا بھلا ہو اور شاید جس میں بلوچستان اہم ترین کردار ادا کرے اور بھلائی کا سہرا اس کے سر ہے۔[۲۷]

فردوس انور قاضی

فردوس انور قاضی نے افسانوں اور تنقید کے علاوہ ایک ناول بھی لکھا ہے، اس کا تعارف اور تجزیہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

خوابوں کی بستی

فردوس انور قاضی کا ناول ہے جو پہلے فردوس جہاں قاضی کے نام سے لکھتی تھیں۔ اس لیے ناول کے سرورق پر یہی نام ملتا ہے۔ سرورق پر ہی ایک مکمل سیاسی نظریاتی ناول، مکمل داستان کے الفاظ سے ناول کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ ناول سیاست کے موضوع پر ہے۔ کراچی اس ناول کا لوکیل ہے، اگرچہ ناول کے بعض مرکزی کردار کچھ دنوں کے لیے کوئٹہ و مضافات کی سیر کرنے آتے ہیں۔ یہ ناول کوئٹہ میں لکھا گیا ہے مگر اس کا موضوع تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین اور ان کو درپیش سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل ہیں اور یہ کہ نئے

ملک کے لوگ آنے والوں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔مصنفہ کا اپنا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے۔وہ قیام پاکستان کے بعد کراچی آتی ہیں اور یونیورسٹی آف بلوچستان کوئٹہ میں لیکچرر بھرتی ہو کر کوئٹہ آجاتی ہیں اور یہیں کی ہو جاتی ہیں۔ ناول میں مہاجرین کی طرف ان کا واضح جھکاؤ نظر آتا ہے۔وہ انھیں مقامی لوگوں کے مقابل بہت لائق تعلیم یافتہ اور مہذب گردانتی ہیں۔ناول خوابوں کی بستی کے پہلے سوڈیڑھ سو صفحات طویل اقتباسات سے گراں بار ہیں۔ان میں بیانیے کا لطف سرے سے ناپید ہے۔اس لیے ان کی قرات قاری کو اکتا دیتی ہے۔البتہ بعد کے صفحات پر طویل قصے کے تارو پود بکھرے نظر آتے ہیں۔اس ناول میں قصہ بنیادی طور پر ہجرت کر کے آنے والے رحمان صاحب ان کے بیٹوں حسن اختر اور بیٹیوں خصوصاً رباب اور رحمان صاحب کے مقامی دوست اور مل مالک بلال علی سومرو اور ان کے بیٹے عادل نور سومرو کے گرد گھومتا ہے۔ان مرکزی کرداروں کے علاوہ کئی چھوٹے بڑے اور غیر مستقل کردار بھی نظر آتے ہیں۔احسان صاحب کے بیٹے حسن اور اختر کراچی میں اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ انھیں کوٹہ سسٹم کے تحت خود سے نالائق بچوں کو کالج میں داخلہ ملنے پر اعتراض ہوتا ہے جبکہ داخلہ لینے والے اپنی زمین کے فخر میں مبتلا نظر آتے ہیں اور یہیں سے ناول معاشرتی اور سماجی مسائل کو موضوع بناتا ہے سیاست بھی اس کا موضوع بن جاتی ہے اور ایک فرضی نام APSMD کے تحت گویا کراچی میں ایم کیو ایم کے سیاسی ابھار کو ظاہر کیا گیا ہے۔خوابوں کی بستی کے اہم پہلوؤں میں سماجی پہلوؤں پر تخلیقی تجزیے سائنس اور مذہب کے امتزاج پر مباحث،فلسفیانہ نکات اور عورتوں کو بہ طور انسان موضوع بنایا جاتا ہے۔پاکستان کے سماج میں کرپشن کے حوالے سے ایک جملہ ملاحظہ ہو۔''پاکستان میں اگر کوئی کام مشکل ہے تو وہ مجرم کو مجرم ثابت کرنا ہے باقی سب کچھ آسان ہے۔''[۲۸]

اس طرح اس میں اس نوعیت کے فلسفیانہ جملے بھی ملتے ہیں۔''زندگی کتنی عجیب چیز ہے جو جینے دیتی ہے نہ مرنے آدمی کیا کرے۔''[۲۹]

اسلوب

فردوس انور قاضی نہ صرف اہل زبان ہیں بلکہ اردو میں پی ایچ ڈی بھی ہیں۔اس لیے ان کی تحریر میں زبان کے جملہ لوازمات ملتے ہیں۔ان کی تحریر میں سادگی اور روانی ملتی ہے۔ان کے اکثر جملے چھوٹے ہوتے ہیں،جن کی بدولت قرات آسان ہو جاتی ہے۔فاروق احمد اس ناول کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر فردوس کا یہ ناول دراصل انہی شکستہ خوابوں کی کہانی ہے،جسے سیاسی بازیگروں کے چوکھ پتھراؤ نے چکنا

چور کر دیا ہے۔ پاکستان کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تغیرات نے عوام پر اثرات مرتب کیے اور عوام نے زندگی کو جس نظر سے دیکھا؛ خوابوں کی بستی اس کشمکش کا نہایت سچا اور بے ساختہ اظہار ہے۔۳۰

خالد اقبال جوئیہ

خالد اقبال جوئیہ پیدائشی طور پر کوئٹہ کے رہنے والے ہیں۔ وہ فوج سے بہ طور میجر ریٹائر ہوئے ہیں۔ یہ کہنا نا مناسب نہ ہوگا، کہ ان کا ناول پــڑاؤ بلوچستان کی ادبی روایت کا اہم ترین ناول ہے۔ اس کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

پڑاؤ

ناول پڑاؤ ایک ضخیم ناول ہے جو کل ۵۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ خالد اقبال جوئیہ کی تصنیف ہے۔ یہ ناول صرف ضخامت ہی میں نہیں بلکہ فن کے حوالے سے بھی ایک مکمل اور اہم ترین ناول ہے۔ اس میں قصہ در قصہ کہانی کے مختلف رنگ اور شیڈز نظر آتے ہیں اور متنوع کردار بھی۔ ناول پڑاؤ بظاہر جاگیردارانہ معاشرے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، مگر اس میں زندگی کے جملہ مسائل نہایت فنکارانہ طور پر زیر بحث آئے ہیں۔ اس کی کہانی یوں ہے کہ شام پور (ایک گاؤں کا فرضی نام) کے نزدیک محکمہ معدنیات مختلف معدنی ذخائر کی تلاش میں کئی ماہرین پر مشتمل ایک کیمپ لگاتا ہے۔ شام پور کے قریب ہی دار پور اور بستی غریباں نام کے دو اور قصبے ہیں اگر چہ یہ علاقہ کسی وقت سردار رب نواز کے آباؤ اجداد کے زیر قبضہ ہوتا ہے۔ اس وقت سردار رب نواز صرف ایک خستہ حال کوٹھی کا مالک ہوتا ہے اور علاقے پر اس کی بجائے نو دولتیے بھائیوں رئیس اسمدار اور رئیس حدار کا سیاسی قبضہ ہے۔ ناول میں دونوں گروہوں کے مابین جاگیردانہ چپقلش بھی دکھائی گئی۔ دونوں گروہ اپنے علاقے میں محکمہ معدنیات کے کیمپ کا قیام پسند نہیں کرتے مبادا ان کا علاقہ ترقی کر جائے اور لوگوں کو تعلیم اور شعور مل جائے۔ انہیں خوف ہوتا ہے کہ اس طرح ان کی خاندانی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی لئے دونوں گروہ آپس میں لڑنے کے باوجود کیمپ کے خلاف ایکا کرتے ہیں اور مختلف سازشوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ آخر حالات اس قدر خراب ہو جاتے ہیں کہ ارباب اختیار کیمپ کو ختم کر دینے کا حکم جاری کرتے ہیں تا کہ علاقے کا امن وامان برقرار رکھا جاسکے۔ یہ پڑاؤ کی کہانی کا مختصر خلاصہ ہے۔

اس کیمپ کے ملازمین میں ایک انگریز لارنس کے علاوہ باقی تمام دیسی مگر پڑھے لکھے لوگ شامل ہوتے ہیں یہ لوگ حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ مقامی لوگوں کے ساتھ کسی تنازعے میں نہ الجھیں۔ اس لئے وہ مقامی لوگوں سے

فاصلے پر رہتے ہیں مگر پھر حالات کے جبر کے تحت وہ لڑائی میں شامل ہو جاتے۔کیمپ کے رہائشیوں کے مابین مختلف مواقع پر فلسفیانہ، دانش آمیز اور پر مزاح گفتگو دکھائی گئی ہے۔اس سے زندگی کے بارے میں ان کے مطمع نظر سے قاری کو آگاہی ہوتی ہے۔ایک موقع پر ناول کا کردار میجر زین، جاگیردارانہ سماج کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے:

> اجتماعی زندگی میں عوام کی شمولیت کی ضرورت اگر یہ تقاضا کرتی ہے کہ مزدوروں، ہاریوں اور مزارعوں کا پرائی محکومیت والا States ختم کر دیا جائے اور انہیں معاشرے میں بلند مقام دیا جائے اور ایسا فیوڈلزم کو ختم کئے بغیر ممکن نہ ہو تو فیوڈلزم کو بلا تردد ختم کر دینا چاہیے۔[۳۱]

ناول کے ایک کردار کا اس قدر واضح موقف ظاہر کرتا ہے کہ پـــڑاؤ میں ترقی پسند رجحانات بھی ملتے ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ اس ناول میں ایک خاص سطح کی گہرائی بھی ملتی ہے، جو اچھے ناولوں کا خاصہ ہوتی ہے۔اس ناول کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فاروق احمد رقمطراز ہیں:

> خالد اقبال جوئیہ نے پڑاؤ لکھ کر حقیقتاً آج کے پاکستان کی تقدیر لکھی ہے، جس میں عوام کی محرومیاں، تہذیبی منافقت، سیاسی مصلحتیں اور جاگیرداری نظام کی تاریکیاں سب کچھ شامل ہیں۔مصنف نے اپنی تحریر کی شگفتگی سے پـڑاؤ کو اس قابل بنا دیا ہے، کہ یہ مدتوں پڑھا جاتا رہے گا۔آج کی ناول نگاری میں پـڑاؤ بلا شبہ ایک اہم اور معتبر اضافہ ہے۔۳۲

مصنف کا اسلوب سادہ، پختہ اور رواں ہے اسے زبان پر مکمل عبور حاصل ہے۔وہ ایسی نثر لکھنے کی مہارت رکھتا ہے جو ایک عمدہ ادبی ناول کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔پڑاؤ میں نہ صرف اسلوب نکھرا ہوا ہے بلکہ اس میں بیانیے کی تشکیل بھی نہایت خوبی سے کی گئی ہے بعض تاریخی حالات و واقعات بھی قصے میں در آتے ہیں جو کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں۔غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلوچستان میں لکھے گئے ناولوں میں پـڑاؤ اہم ترین ناول ہے۔یہ اور بات ہے کہ اسے ملکی سطح پر نظر انداز کیا گیا ہے اور اردو ادب کے قارئین اور ناقدین اس کے نام تک سے آگاہ نہیں ہیں۔اس پر حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس ہوتا ہے کہ بلوچستان سے منظر عام پر آنے والے ایک اہم ناول کو قومی سطح پر کیسے نظر انداز کر دیا گیا۔پاکستان میں ہونے والے اردو ناول کے ارتقائی مطالعات میں اس ناول کا ذکر ہی نہیں ملتا۔ظاہر ہے کہ یہ سخت ناانصافی کی بات ہے ورنہ پڑاؤ ایسا ناول ہرگز نہیں جسے یوں نظر انداز کر دیا جائے۔

مسزممتازشفیع

مسزممتازشفیع نے بلوچستان میں اپنے قیام کے دوران ایک ناول یہ زرنگار وادیاں لکھا ہے۔اس کی تصدیق عذرا اصغر نے کی ہے۔[۳۳] اس لیے ان کے اس ناول کا شمار بلوچستان کی ادبی روایت میں ہوگا۔ممتازشفیع کے شوہر فوج میں میجر تھے جو ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۶ء کا عرصہ کوئٹہ میں تعینات رہے۔اس دوران مسزممتازشفیع کو کوئٹہ میں رہنے اور بلوچی ادب وثقافت اور تاریخ کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ان کی دوستیاں بھی بلوچستان کے سرکردہ قبائلی راہنماؤں کی دختران اور ہمشیرگان سے رہیں۔ان سب چیزوں نے ان سے یہ ناول لکھوایا۔وہ اسی حوالے سے دیباچے میں لکھتی ہیں:

> اس خطے کے ادیبوں، شاعروں اوران کی گراں قدر تصنیفات سے فیض یاب ہوئی جنھوں نے مجھے بے حد متاثر کیا اور حقیقت وفسانے کے ملاپ سے میرا یہ ناول یہ زرنگار وادیاں میرے عالم تخیل سے عالم وجود میں آیا۔[۳۴]

اس ناول کا تفصیلی تعارف اور تجزیہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ زرنگار وادیاں

یہ ناول ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اسے مکمل ادبی یا کمرشل ناول نہیں کہا جاسکتا۔یہ ان دونوں کے بین بین ہے۔اس کے کئی صفحات کمرشل ناول کے محسوس ہوتے ہیں تو کئی جگہ اس میں ادبی ناول کا ذائقہ بھی ملتا ہے۔ بالخصوص اس کے بیشتر کرداروں کے حوالے سے۔پھر بعض کرداروں کے نام بھی ایک جیسے ہیں۔پتہ نہیں چلتا کہ کس کردار کی بات ہورہی ہے۔اس لیے بعض جگہ ناول کی قرات خاصی توجہ چاہتی ہے۔ناول کے بیشتر کرداروں کے نام بلوچستان کے تاریخی کرداروں پر رکھے گئے ہیں مثلاً میر محراب خان، گراناز، ممتاز اور شہسوار وغیرہ اس طرح بعض انگریز کردار یعنی ڈاکٹر میری رابرٹ اس کی بیوی ڈاکٹر مارگریٹ رابرٹ اوران کی بیٹی ڈاکٹر میری بھی مختصر عرصے کے لیے جلوہ گر ہوتے ہیں۔یہ مری بلوچوں کے علاقے کاہان میں غریبوں کا مفت علاج وغیرہ کرتے ہیں۔یہاں ان کے سیاسی مقاصد ہوتے ہیں۔یہ ایسا سوال ہے جس کا مطالعہ مابعد نوآبادیاتی فکر کے تناظر میں کیا جانا چاہیے۔

مصنفہ کا تعلق چونکہ ایک فوجی گھرانے سے ہے اس لیے ناول کا آغاز ہی جنگ ۱۹۷۱ء میں شہید ہونے

والے فوجیوں میں تقسیم اعزازات کی تقریب سے ہوتا ہے۔ ممتاز کے شوہر کیپٹن نصیر خاں مری کو ڈھاکا میں شہادت کی وجہ سے سب سے بڑا فوجی اعزاز نشان حیدر ملتا ہے لیکن چونکہ اس کی لاش نہیں مل سکی ہوتی اس لیے ممتاز کا دل اپنے شوہر کو مردہ تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اسے زندہ سمجھتی ہے۔ اس کے بھتیجے خالد اور گراناز دونوں ڈاکٹر ہوتے ہیں جبکہ اس کا شوہر گوہر حسن کو پہلے جج دکھایا جاتا ہے اور پھر تاجر اور خطرناک شخص جو مختلف سازشیں کرتا نظر آتا ہے۔ گراناز اور اس کے بیچ ہمیشہ تلخی رہتی ہے۔ یہ سب لوگ پیدائشی طور پر کوئٹہ کی بجائے لاہور میں رہتے ہیں البتہ ناول کے درمیان میں اور پھر آخر تک کئی بار کوئٹہ آتے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق مری قبیلے کے سردار خاندان سے ہوتا ہے۔ اس لیے جب کبھی وہ کوئٹہ یا کاہان جاتے ہیں تو اپنے علاقے میں ان کی بہت پذیرائی ہوتی ہے مگر بلوچستان میں اچھے ڈاکٹرز اور صحت عامہ کی سہولتوں کی عدم دستیابی کے باوجود جس کا احساس ان کرداروں کو ہوتا ہے۔ یہ لوگ بیشتر وقت لاہور میں گزارتے ہیں۔ اس ناول کی کہانی بنیادی طور پر شادی شدہ دو جوڑوں کے گرد گھومتی ہے۔ ممتاز اور اس کا شوہر کیپٹن نصیر خان مری جسے شہید سمجھ کر نشان حیدر دیا جاتا ہے، مگر وہ زندہ بچ جاتا ہے اور ڈھاکا سے انگلینڈ چلا جاتا ہے۔ وہاں اس کا علاج ہوتا ہے اور وہ صحت یاب ہو کر واپس آ جاتا ہے مگر اس کے واپس آنے تک اُسے مردہ ہی تصور کیا جاتا ہے جو غیر فطری محسوس ہوتا ہے۔ دوسرا جوڑا گراناز اور گوہر حسن کا ہوتا ہے۔ ان کے والدین آپس میں دوست ہوتے ہیں اور وہ بلوچ رواج کے مطابق ان کی پیدائش سے پہلے ہی آپس میں اپنی اولاد کا رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ گوہر حسن کا والد اس کی پیدائش کے بعد جلدی وفات پا جاتا ہے۔ وہ قلات ریاست کے اہم خاندان کا مرد ہوتا ہے۔ گوہر حسن اور اس کے کزن خان قلات میر محمود خان کو تعلیم اور حفاظت کی غرض سے برطانیہ بھیج دیا جاتا ہے۔ اس اثنا میں قادر یہ بیگم نامی افغان خاتون جس سے زبردستی شادی کی ہوتی ہے۔ اپنے بیٹے کو گوہر حسن بنا کر گراناز سے شادی کر دیتی ہے جن کے درمیان ہمیشہ ناچاقی رہتی ہے مگر اس کا پتہ گراناز کے گھر والوں کو آخر میں چلتا ہے۔ یہ سب جو غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ اصل گوہر حسن ڈاکٹر بننے کے بعد واپس آتا ہے اور کئی مشکلات جھیلنے اور قتل کی سازش سے بچ جانے پر بالآخر گراناز سے شادی کر کے گویا ایک طرح ہنسی خوشی رہنے لگتا ہے۔ یعنی ناول کا اختتام بالکل روایتی اور بچوں کے لیے لکھی جانے والی بادشاہوں کی کہانیوں جیسا ہے۔ اگرچہ ناول میں بلوچستان کی تاریخ کے کئی واقعات اور کردار نظر آتے ہیں مگر وہ تخلیقی سطح پر نظر نہیں آتے جو ایک ناول نگار کو تاریخی کرداروں کو پیش کرتے ہوئے لازمی طور پر کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ تاریخی واقعات و کردار گراناز کے تاریخی کتابوں کے مطالعوں اور ان کے اقتباسات کی شکل میں ملتے ہیں۔ بعض جگہ تو ایسی کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام بھی دیئے گئے ہیں۔ یوں گمان ہوتا ہے جیسے یہ بعینہٖ مختلف

کتابوں سے نقل کیے گئے ہوں۔ظاہر ہے کہ ان باتوں سے یہ ناول کمزور ثابت ہوتا ہے۔

اسلوب

مسز ممتاز شفیع کا اسلوب سادہ اور رواں تو ہے مگر اسے دلچسپ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اسے منفرد اور الگ نہ سہی ایک مکمل ادبی اسلوب کی شکل دینے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکیں جس سے ان کا پایۂ اعتبار قائم ہوتا۔ وہ چونکہ پیدائشی طور پر بلوچ بھی نہیں ہیں، نہ ہی وہ بلوچستان میں بچپن ولڑکپن سے تا آخر رہتی آئی ہیں۔ اس کے باوجود اس نے یہ ناول کے لکھنے میں کافی محنت نے کی ہے۔ اس کی تحریر میں بلوچی زبان کے الفاظ کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

قات (پھوپھو)، آریپ (والد)، بامی استار (صبح کا تارا) آدین (آئینہ) اداریں کار (ادارہ فلاح وبہبود)، استار سہور (ستارہ سحری)، باہوٹ (جسے پناہ دی جائے) بسر (گڑ والی روٹی)، شیلانچ (چھاچھ سے بنی مٹھائی وغیرہ) مصنفہ نے اردو روزمرہ اور محاورے کا استعمال بہت کم کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کی ساری توجہ بلوچستان کی ثقافت و تاریخ کو پیش کرنے اور اپنی زیادہ سے زیادہ بلوچی الفاظ استعمال کرنے پر رہی ناول میں بلوچستان کی تاریخ وثقافت کے ساتھ ساتھ لسانی سطح پر کئی الفاظ پہلی بار اردو عبارت میں مستعمل نظر آتے ہیں۔

اس کی غیر جانبداری پر سوال اٹھتا ہے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے ناول کا بیانیہ سرکاری حکمت عملی کی تبلیغ یا حمایت کرنا نظر آتا ہے۔ کئی جگہ اس طرح کے اقتباسات ملتے ہیں جن میں بلوچ کردار پاکستان سے حب الوطنی یوں لگتا ہے جیسے بلوچستان میں روز اول سے ہونے والی شورشوں اور مختلف واقعات میں بغاوت کے واقعات سے مصنفہ قطعاً واقف نہ ہو۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ناول کے سب بلوچ کردار جگہ جگہ پاکستان سے محبت کا تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ناول میں بعض جگہ انسان او زندگی کے بارے بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ گراناز کا والد بیٹی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

> بیٹا! ایسے حالات میں ان کی ہمت بندھانی چاہیے تھی۔ مرد چاہے باہر سے کتنا ہی سخت گیر دکھائی دے اندر سے بودا اور کمزور ہے۔ اسے ہمیشہ نسوانی سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ عورت کے دلاسے اور شیریں زبان سے اس میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔[۳۵]

مرد کے بارے میں یہ بات مصنفہ ایک بوڑھے اور جہاں دیدہ مرد سے کہلاتی ہے جو نہایت اہم بات ہے۔ اس طرح ناول کے بارے میں بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ ناول ابدی حقائق اور انسانی زندگی کی جزئیات کو پیش کرتا ہے اور انسانی زندگی کے المیوں کو موضوع بناتا ہے۔ یہ زرنگار وادیاں میں اگرچہ ایسے باریک نکتے بہت کم ہیں مگر ایک آدھ جگہ دو چار ایسے جملے مل ہی جاتے جن سے زندگی اور موت کے بارے میں مصنفہ کی ایک رائے ضرور سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> موت ایک ایسی دکھ بھری حقیقت ہے کہ انسان اسے قبول نہیں کر سکتا۔ حادثاتی موت تو اور بھی زیادہ الم ناک ہوتی ہے۔ پل بھر میں ہنستا، مسکراتا، صحت مند انسان ختم ہو جاتا ہے۔[۳۶]

یہ ناول اگرچہ اردو ناول کے مرکزی دھارے میں شامل نہیں ہے۔ اس کا ذکر اردو ناول کے کسی تحقیقی مطالعے میں نہیں ملتا مگر یہ اپنے موضوع یعنی بلوچستان کے حوالے سے پہلا ضخیم ناول ہے جو باقاعدہ تحقیق و تفتیش کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس میں بلوچستان کی تاریخ کو کرداروں اور اوقات کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے۔

آغا گل

آغا گل نے افسانوں کے علاوہ چار مختصر ناول بھی لکھے ہیں، جن کا تجزیہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔

دشت میں سفر

آغا گل کا ناولٹ ہے جو پہلی بار ۱۹۸۶ء میں طبع ہوا۔[۳۷] اس کا سرورق صادقین کا بنایا ہوا ہے، جبکہ اس کا عنوان عطا شاد کے مندرجہ ذیل شعر سے اخذ کیا گیا ہے:

دشت میں سفر ٹھہرا پھر مرے سفینے کا
میں نے خواب دیکھا تھا برف کے پگھلنے کا[۳۸]

چھوٹے سائز کے ۱۲۰ صفحات پر مشتمل اس ناولٹ کا موضوع کوئٹہ کے چند بے فکرے، رسوم و قیود سے آزاد اور خوش طبع نوجوانوں کی داستانِ حیات ہے۔ اس میں آج سے قریباً چالیس پچاس برس قبل کوئٹہ کے شب و روز کا

احوال ملتا ہے۔ جب اس شہر کے ہوٹل یعنی ریسٹورنٹ اور بالا خانے آباد تھے۔ رقص وسرور اور ناچ گانوں کی محفلیں مختلف محلوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ آزاد طبع لڑکیوں سے دوستی اور طوائفوں سے تعلقات رکھنا آسان تھا۔ اس مختصر ناول میں کہانی خورشید اور اس کے دوستوں کے گرد گھومتی ہے۔ خورشید اس کہانی کا مرکزی کردار ہے دوستوں میں اس کی حیثیت ایک سہولت کار کی ہے کہ وہ اپنے امیر باپ کے مرنے کے بعد اپنی حویلی اور روپیہ دوستوں کے ساتھ گپ بازی، شراب نوشی اور آوارہ لڑکیوں سے تعلقات میں خرچ کرتا ہے۔ رخسانہ اس ناولٹ کا مرکزی کردار ہے۔ جو پہلے اس گروپ کے ایک فرد قاضی سے تعلق بناتی ہے مگر جلد ہی اس سے تعلق توڑ کر ایک دوسرے کردار سے رشتہ جوڑ لیتی ہے جو ناولٹ کے آخر تک چلتا ہے مگر ہمیں اس کردار کے نام کا پتہ آخر تک نہیں چلتا۔ وہ کہانی میں اسم اشارہ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ قاضی اور دوسرے کردار اس کے درمیان رخسانہ کی وجہ سے لڑائی اور نوک جھونک بھی ہوتی ہے مگر چونکہ رخسانہ قاضی کے بجائے دوسرے کردار سے تعلق رکھنا چاہتی ہے۔ قاضی اپنی شکست تسلیم کرنے کے بعد اپنے اس دوست سے رابطہ بحال کر لیتا ہے مگر رخسانہ کوئی شریف لڑکی نہیں ہوتی وہ پہلے سے شادی شدہ اور تین بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کبھی کبھی جسم فروشی بھی کرتی ہے لیکن اس کی کم عمری اور حسن کی بدولت پہلے پہل اس کے عاشق کو اس کا پتہ نہیں چلتا وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور منگنی بھی کر لیتا ہے۔ تب ایک دن پولیس کے رخسانہ کے گھر چھاپے کے دوران اسے ساری صورت حال کا علم ہوتا ہے۔ وہ رخسانہ کو پولیس سے تو بچا لیتا ہے مگر اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ رخسانہ سے ہر قسم کا تعلق توڑ لیتا ہے مگر پھر کچھ دنوں کے بعد رخسانہ اس کے دفتر آتی ہے اور اپنے ساتھ تعلقات رکھنے پر آمادہ کر لیتی ہے اور وہ پھر سے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُسے اپنا لیتا ہے۔ پھر اسے ایک ٹریننگ کے باعث ایران جانا پڑتا ہے۔ جب وہ واپس لوٹتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ رخسانہ نے اس کی عدم موجودگی میں کوئٹہ کے ایک معروف بزنس مین سیٹھ قادر کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے دوستوں نے رخسانہ کو کوئٹہ سے دور ایک علاقہ میں چھپایا ہوتا ہے وہ اسے رخسانہ سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں مگر وہ اس کے بغیر نہیں رہ پاتا اور اپنے دفتر جا کر ایک بڑی سرکاری رقم نکلوا کر رخسانہ کے ہاں پہنچتا ہے تا کہ بیرون ملک فرار ہو سکے۔ ان کے اس سفر میں اعانت کے لیے غفار آتا ہے جو رخسانہ کا رشتہ دار ہوتا ہے۔ رخسانہ نے بھی قتل کے بعد سیٹھ قادر کی دولت لوٹی ہوتی ہے۔ غفار ایک لانچ پر آتا ہے اور رخسانہ کو ساتھ چلنے کو کہتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ رخسانہ اپنے عاشق کو دغا دے چکی ہے۔ آخر میں وہ عاشق غفار کی لانچ پر فائرنگ کرتا ہے جس سے اس کی لانچ بیچ سمندر تباہ ہو جاتی ہے اور لانچ سے کی گئی فائرنگ کی زد میں رخسانہ کا عاشق آ جاتا ہے اور وہ بھی موت کے

گھاٹ اتر جاتا ہے۔ اکیلی رخسانہ بے یارومددگار رہ جاتی ہے۔ اس ناولٹ میں بتایا گیا ہے کہ بری صحبت اور حرص و ہوس کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ اس ناولٹ میں جا بجا متعدد تاریخی حوالے ملتے ہیں جو بلوچستان اور تاریخ عالم سے اخذ کیے گئے ہیں۔ دو چار جگہ بائبل اور بھگوت گیتا سے بھی مختصر اقتباسات نقل کیے گئے ہیں۔ اس سے مصنف کے مطالعے کا پتہ تو چلتا ہے مگر اس کی موجودگی بھی کھلتی ہے۔ انگریزی الفاظ، محاورے، ترجمے اور اصل شکل میں جا بجا ملتے ہیں جبکہ ہجر وصل کے حالات میں تشبیہات میں بلوچستان کے مختلف علاقوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے نام مع ان کی صفات کے دیے گئے ہیں۔

دشت وفا

اس ناول کا عنوان عین سلام کے اس شعر سے مستعار لیا گیا ہے:

یہ ہے دشتِ وفا یہاں سورج
ساتھ میرے سفر میں رہتا ہے[۳۹]

یہ ناول دراصل آغا گل کے پہلے ناولٹ دشت میں سفر کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس میں وہی بنیادی کردار اور کہانی ملتی ہے جو کہ دشت میں سفر میں ہے؛ البتہ دشت وفا کی کہانی میں اس طور اضافہ کیا گیا ہے کہ اس میں بلوچستان کے صوبائی حقوق کے لیے کی گئی مسلح جدوجہد کا احوال بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس میں جس بغاوت کا حال ملتا ہے وہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بلوچستان کے متعدد علاقوں میں ہوئی تھی۔ اس میں بھی رخسانہ کا مرکزی کردار ہے اور یہ تمام ناول پر حاوی نظر آتا ہے۔ اس کے متوازی کردار میں نجیب نظر آتا ہے۔ ناول کے آغاز میں وہی بے فکر اور عیش پسند دوستوں کا گروہ نظر آتا ہے مگر پھر جب انھیں آزادی یا حقوق کی جنگ لڑنے والوں کے پیغامات ملتے ہیں تو وہ اپنے دوستوں کی مدد کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ مدد زخمیوں کو فوجی گھیرے سے نکال کر لے جانے، ادویات پہنچانے، روپیہ کا بندوبست کرنے یا پھر علاج معالجہ کی دیگر سہولتوں کی دستیابی تک محدود رہتی ہے۔ نجیب کسی طور مسلح کارروائیوں کا حصّہ بننا پسند نہیں کرتا وہ صاف کہتا ہے کہ وہ انسانوں کو قتل نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے باغی دوستوں کو معصوم انسانوں اور سرکاری اداروں پر بم حملوں سے روکتا نظر آتا ہے کہ اس سے بلوچستان مزید پسماندہ ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ آگ سرداروں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے لگائی ہوتی ہے مگر آخر کار وہ اس جنگ میں معاونت اور سہولت کار کے طور پر شریک ہو جاتا ہے۔ ناول کے اختتام میں وہ اپنے تعلقات کو استعمال

میں لاکر ان لوگوں کو حکومت کے ساتھ مذاکرات پر آمادہ کرتا ہے اور پھر بالآخر طرفین باہمی رضا مندی سے ایک پرامن سمجھوتے کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں مگر بعض شرپسند عناصر سمجھوتہ نہیں چاہتے وہ آخر میں نجیب پر حملہ آور ہوتے ہیں کہ وہ اسے اس سمجھوتے کا باعث سمجھتے ہیں۔ ان سے لڑتے لڑتے نجیب اور رخسانہ دونوں ہلاک ہوجاتے ہیں۔ اس ناول میں کئی جگہ ایسے جملے ملتے ہیں جن سے آغا گل کا خاص اسلوب جھلکتا ہے۔ مثلاً: ''شراب، عورت اور اسلحہ کبھی جوٹھا نہیں ہوتا'' دنیا نہ اچھے لوگوں کو یاد رکھتی ہے نہ برے لوگوں کو، وقت کا دریا بہے جاتا ہے۔''[۴۰]

اس ناول میں بھی تاریخی حوالہ جات، مختلف اقوال اور بائبل و گیتا کے مندرجات جگہ جگہ دیئے گئے ہیں۔ انگریزی، ہندی اور پشتو الفاظ، محاورے اپنی اصل شکل اور ترجمے ہر دو روپ میں ملتے ہیں۔ اس ناول میں آج سے چالیس پچاس برس کوئٹہ کا سماجی منظرنامہ، بلوچستان کا سیاسی ماحول اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ہونے والی ناکام مسلح بغاوت کا احوال خوبصورتی سے قلمبند کیا گیا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں ادبی چاشنی اور ناول کے لیے درکار گہرائی و گیرائی نہیں ملتی۔ جبکہ ناول کے کردار بھی قاری پر کوئی اثر چھوڑتے نظر نہیں آتے۔ بہرحال اسے بلوچستان میں اردو ناول کے ارتقا کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں پہلی بار بلوچستان کے سیاسی مسئلے کو کہانی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی بات اس کی اہمیت ظاہر کرتی ہے۔

بیلہ

یہ آغا گل کا دوسرا مختصر ناول ہے۔ بیلـــہ ایک ایسی کہانی ہے جس کا مرکزی کردار رحمان دراصل ایک بس ڈرائیور ہوتا ہے جو کوئٹہ سے کراچی بس چلاتا ہے، وہ اپنے بعض شخصی خصائص کے ساتھ ساتھ بس چلانے میں بھی ایسی مہارت رکھتا ہے کہ اس روٹ کا کوئی اور ڈرائیور ایسی کارکردگی نہیں دکھا سکتا۔ اس لیے اسے کنگ آف دی روڈ کہا جاتا ہے۔ وہ سیٹھ شمروز کی بس چلاتا ہے جو نہ صرف ایک بہت بڑی بس سروس کا مالک ہے بلکہ سماجی اور قبائلی حوالے سے بھی ایک ممتاز شخصیت ہے۔ اُسے رحمان سے ایک خاص تعلق ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ڈرائیور کے جا و بے جا ہر طرح کے ناز اُٹھاتا ہے۔ رحمان کا کردار ہو بہو ویسے ہی تخلیق کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر بس ڈرائیور ہوتے ہیں۔ بس اڈے میں اس کی دلچسپیاں، دوستیاں، لڑائی جھگڑے، اپنے ڈرائیور طبقے کے ساتھ ہمدردی، چیک پوسٹوں پر سیکورٹی اور پولیس والوں سے تلخ کلامی، راستے کے ہوٹلوں پر اپنی خاطر مدارت کروانا اور خوبصورت لڑکیوں، لڑکوں میں یکساں دلچسپی لینا اور فقرے کسنا وغیرہ۔ رحمان کو اگرچہ حالات نے ڈرائیور بنایا ہوتا ہے مگر اس کا خاندان انقلابی

پس منظر رکھتا ہے اس کے والد اور چچا بلوچستان کے حقوق کی خاطر پہاڑوں پر روپوش ہوتے ہیں اور پھر ایک دن سیکورٹی اداروں سے لڑتے ہوئے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ اس انقلابی پس منظر کی وجہ سے رحمان کے باطن میں ایک انسان زندہ رہتا ہے۔ ناولٹ کا دوسرا مرکزی کردار بیلہ نامی لڑکی کا ہے۔ وہ رحمان کے ساتھ ایک سفر کرتی ہے اور رحمان کو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ بیلہ دراصل ٹام بوائے لڑکی ہوتی ہے۔ اس کے بال بوائے کٹ، چال ڈھال لباس، بدن بولی اور دیگر رویے لڑکوں والے ہوتے ہیں۔ رحمان بھی پہلے پہل اسے خوبصورت لڑکا سمجھتا ہے مگر بعد میں اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ دراصل لڑکی ہے تو وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ بیلہ اُسے ٹو ان ون لگتی ہے۔ رحمان جب اس کی تعریف کرتا ہے تو آغا گل کی ڈرائیور طبقے کی زندگی سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے کہ ڈرائیور لڑکیوں اور لڑکوں کی تعریف اپنے طبقے کی زبان یعنی گاڑیوں کے پرزہ جات کے حوالے سے کیے کرتے ہیں۔ ذیل کے جملے ملاحظہ ہوں:

> پہلی نظر میں تو وہ ایک بہت خوبصورت من موہنی کلینز لگی مگر بمپر آگے پیچھے کے پکار رہے تھے کہ لڑکی ہے۔[۴۱]

> آخر اس لڑکا نما لڑکی میں ایسا کیا ہے رحمان نے خوشی سے سوچا۔ یہ کیوں مجھے اچھی اچھی لگ رہی ہے۔ شائید ٹو ان ون ہے۔ ورنہ ایسی خاص بات کیا ہے ایسی ہیڈ لائٹ ایسا فریم، ایسے بمپر تو ہر لڑکی کے ہوتے ہیں۔[۴۲]

بیلہ کراچی میں نرسنگ کا کورس کر رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا رحمان جب بھی کراچی جاتا ہے تو وہ اس کے ساتھ ساحل سمندر پر جاتا ہے۔ یوں دونوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس عشق میں رحمان کی توجہ اپنی ڈرائیونگ پر پہلے جیسی نہیں رہتی۔ سیٹھ شمریز کو اس محبت کا پتہ چلتا ہے تو وہ اسے شادی کرنے کا کہتا ہے لیکن بیلہ نہیں مانتی کہ اُسے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ گھر کی ذمہ داری اٹھانی ہے۔ رحمان کا دوست ڈاکٹر مسرور سمجھاتا ہے کہ بیلہ جیسی لڑکیاں کبھی ڈرائیوروں سے شادی نہیں کرتیں۔ لہٰذا اسے بیلہ کی محبت دل سے نکال دینا چاہیے، مگر رحمان اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ دفعتاً کہانی میں سیٹھ شمروز کے جواں سال بیٹے کو اس کے مخالفین قتل کر دیتے ہیں تو وہ اپنے بیٹے کے انتقام لینے کی قسم اٹھاتا ہے اور اس کی محبت میں رحمان الگ انتقام لینے کی قسم اٹھاتا ہے اور پھر اس طرح اس پر عمل کرتا ہے کہ شمروز کو پتہ نہیں چلتا۔ رحمان پہلے اس قاتل کے جوان اور عیاش بیٹے اور پھر خود اُسے قتل کر دیتا ہے لیکن آخر میں

یہ شک ہوتا ہے کہ سیٹھ شمروز نے رحمان کے ہاتھوں یہ قتل کرائے ہوتے ہیں جس کا خود رحمان کو بھی غم نہیں ہوتا۔ آخر میں رحمان لاپتہ ہو جاتا ہے اور سات سال بعد کراچی میں ڈاکٹر سرور کے پاس پہنچتا ہے تب اُسے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کی نظر میں مر چکا ہے اور کراچی سے کوئٹہ تک لوگ اُسے ایک برگزیدہ شخص سمجھتے ہیں۔ ہر سال اس کی برسی منائی جاتی ہے اور سیٹھ شمروز اس کی برسی پر پیسہ پانی کی طرح بہاتا ہے اور اُسے بہت عزت سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے بچوں کو ڈرائیور بنانا چاہتے ہیں وہ انھیں رحمان کی طرح ڈرائیور بننے کو کہتے ہیں۔ رحمان یہ سب باتیں جان کر ڈاکٹر مسرور کو اُسے مردہ برقرار رکھنے کی آرزو کر کے پھر سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔ بیلہ کی کہیں اور شادی ہو جاتی ہے۔ ناول کے اختتام میں کہانی کے کچھ کمزور پہلو سامنے آتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ اس کہانی میں مرکزی کردار رحمان کوئٹہ کراچی بس چلاتا ہے۔ لہٰذا اس کا لوکیل بھی بلوچستان ہے۔ کہانی میں کئی جگہ بس کے مسافروں سے مختلف چیک پوسٹوں پر جامہ تلاشی لی جاتی ہے اور اس تناظر میں اہل بلوچستان کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے کسی بھی روٹ پر مسافروں کی یوں تذلیل اور ان کی اس طرح تلاشی نہ لی جاتی ہوگی جیسے کہ اس روٹ پر مشاہدے میں آتی ہے۔ اس لیے کہانی میں کئی جگہ مسافر سیکورٹی اڈوں کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتے نظر آتے ہیں جیسا کہ وہ کسی دوسرے یا قابض ملک کے اہلکار ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سیٹھ شمروز کے کردار میں ایسی گمراہی جو جوانوں کی طرف سے اپنے ملک سے نفرت، اداروں اور سڑکوں کی توڑ پھوڑ پر شدید نکتہ چینی کرتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو بلوچستان اور اس کی خوشحالی کا دشمن سمجھتا ہے اور سیکورٹی والوں کے بارے میں اچھا نقطہ نظر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ناول کی زبان میں مقامیت کا عنصر نمایاں ہے۔ عبارت میں کئی جگہ مقامی زبانوں کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ ان میں پٹو (چادر) ٹکر ٹکر (نڈھال ہونا) دڑ دڑ (خراب رستہ) زوئے (بیٹا) شلوبے (لسی) اور گواڑخ (گل لالہ) وغیرہ شامل ہیں مگر یہ تو صرف چند الفاظ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی الفاظ اور محاورے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو روزمرہ اور محاورے کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ آغا گل کی تحریر میں ایک اور عنصر بہت نمایاں ہے اور وہ ہے انگریزی الفاظ، محاورے اور جملوں کا ایک تواتر کے ساتھ استعمال بعض دفعہ تو انگریزی الفاظ غیر ضروری محسوس ہوتے ہیں۔ بعض جگہ آغا گل کی تحریر میں نقص بھی نظر آتا ہے یعنی وہ روانی میں بھول جاتے ہیں کہ وہ کس طبقے کے حوالے سے جملہ لکھ رہے ہیں۔ ایک جگہ رحمان جیسا ان پڑھ ڈرائیور سوچتے ہوئے نظر آتا ہے۔ ''رحمان کو اندازہ ہوا کہ وہ رات یہاں نہیں رہ سکتا اس کا دل ہاؤس پائپ کی طرح پھٹ جائے گا۔''[۴۳]

اب ایک ڈرائیور کی زبانی ہاؤس پائپ کہلوانا انتہائی غیر منطقی لگتا ہے۔ ایک ڈرائیور آخر اس بارے کیسے کچھ جان سکتا ہے مگر اس عیب کے باوجود آغا گل کی تحریر خاصی دلچسپ اور جاندار محسوس ہوتی ہے۔

بابو

ناول بابو کی کہانی اس کے مرکزی کردار بابو سمیت کوئٹہ کے چند آزادخیال اور آوارہ مزاج لڑکوں کی داستانِ محبت ہے۔ یہ لڑکے گرلز سکولوں اور کالجوں کے گرد منڈلاتے ہیں۔ خوبصورت لڑکیوں کا تعاقب کرتے اور ان سے عشق لڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کامیاب ہوتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کی محبت جز وقتی ہوتی ہے۔ مرکزی کردار بابو، نسیم نامی ایک لڑکی پر فریفتہ ہوتا ہے۔ لڑکی خاندان تو ان کی شادی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے مگر لڑکے یعنی بابو کے والدین جو اصلاً راجستھان سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے بیٹے کی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ یوں ساری کہانی بابو کی اپنے والدین کو اس شادی پر آمادہ کرنے کی کوششوں کو پیش کرتی ہے۔ بابو کے دوست بھی اس کا مکمل ساتھ دیتے ہیں۔ اس میں نوجوانی میں دوستوں کے ساتھ یارانے، گپ شپ اور لڑائی بھڑائی کا احوال بھی ملتا ہے۔ آخر میں بابو اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نسیم سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہ کہانی کوئٹہ کے لوکیل میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے اس میں کوئٹہ کے ہوٹلوں، تھڑے باری اور سینما وغیرہ کا تذکرہ زیادہ ہے۔ تمام کردار بھی کوئٹہ کی مقامیت کا عکس لیے ہوئے ہیں۔ بابو کا ایک دوست ہے جسے گھوڑا کہا گیا ہے۔ اگرچہ اس کا اصل نام کچھ اور ہوتا ہے۔ اس سے ذہن شفیق الرحمان کی کتابوں حماقتیں اور مزید حماقتیں میں گھوڑے نامی کردار کی طرف جاتا ہے۔ دونوں کرداروں میں مماثلت سے شبہ ہوتا ہے کہ بابو لکھتے ہوئے آغا گل کے ذہن میں شفیق الرحمٰن کا کردار گھوڑا رہا ہوگا۔ ناول بابو میں مزاحیہ عنصر کی موجودگی اور دلچسپ کردار سازی اس شبے کو تقویت دیتی ہے۔

یوں تو آغا گل کی ہر تحریر چاہے وہ افسانہ ہو یا ناولٹ اس میں کوئٹہ کی بولی کا عنصر لفظ اور جملے کی بناوٹ میں ملتا ہے مگر ایک ناول بابو شعوری طور پر کوئٹہ کے اردو لہجے میں لکھا گیا ہے۔ آغا گل دیباچے میں لکھتے ہیں:

> میں نے یہ ناولٹ کوئٹہ کی خصوصی اردو میں لکھا ہے جسے ادب کی اصطلاح میں ریلیشن ازم کہا جاتا ہے۔ یہ ناول Trend Setter ہے۔ کوئٹہ کی اردو غیر تحریری زبان ہے۔ میں نے اسے پہلے تحریری شکل دی ہے اُمید ہے کہ یہ سلسلہ چل نکلے گا۔[۴۴]

مصنف کی طرف سے اس ناول یا ناولٹ کو ''ٹرینڈ سیٹر'' کہنا محل نظر ہے۔ ایسا دعویٰ خود مصنف کی طرف سے باعث تعجب ہے۔ ان کی یہ بات بھی درست نہیں کہ انہوں نے کوئٹہ کی اردو کو سب سے پہلے تحریری شکل دی ہے۔ ان سے پہلے لکھے گئے ناولوں اور افسانوں میں کوئٹہ کی اردو کا لہجہ کئی جگہ ملتا ہے۔ البتہ اس ناول کی تمام تر اہمیت کہانی یا کردار کی بجائے زبان ہی ہے۔ مگر یہ تخلیقی سطح پر کس قدر مؤثر اور دلچسپ ہے اس پر بات ہو سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بابو میں کوئٹہ کی اردو نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ بابو کا دوست اسے محبت ترک کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔ ''زوئے ہمارا سر خراب مت کرو۔ تم خود ایک دن پچھتائے گا۔ لیلیٰ مجنوں بھی خر پاگل تھے۔ کیا ملا مجنوں کو جو ہم کو نہیں ملتا۔''[۴۵]

یہاں بات کوئٹہ کے اردو لہجے کو نمایاں کرتے ہوئے قابل تفہیم بھی رہتی ہے مگر بعض اوقات جملوں کی بناوٹ، مقامی زبانوں کے الفاظ کی کثرت اور لہجے کو اس قدر نمایاں کرنے کی کوشش نظر آتی ہے کہ ابلاغ کا سرا ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور پڑھتے ہوئے لطف بھی نہیں آتا مثلاً ذیل کا جملہ ملاحظہ ہو۔ ''اوئے پٹکہ مت مارو۔ خر بکری، بگیل ہو گیا۔ جو کاٹنا ہے ابھی کاٹو۔''[۴۶]

یہ ایک ایسا جملہ ہے کہ کوئٹہ کے اردو لہجے سے اچھی طرح واقفیت رکھنے والا بھی پڑھے تو ایک بار سٹپٹا کر رہ جائے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ الفاظ اور مقامی محاورات کے ایک ہی جملے میں اس قدر کثیر استعمال نے عبارت کے حسن کو زائل کر دیا ہے۔ چونکہ یہ ناولٹ کوئٹہ کی اردو زبان کو نمایاں کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس لیے اس میں کوئٹہ کی اردو لفظیات کی بھرمار نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناولٹ کے اختتام میں قاری کی سہولت کے لیے لغت بھی مرتب کی گئی ہے۔ اس ناولٹ میں پائے جانے والے مقامی الفاظ، محاورات یوں ہیں؛ حرامی، وختی، لغڑی، سوختہ ہونا، ہانڈیوال، ٹن ہونا، کلٹی ہونا، آموختہ، آسرے باز، بکری بن جانا، بولڈال اور بیخ نکل جانا، ان میں سے چند ایک ہیں۔ ایسے بہت سارے دیگر الفاظ اس ناولٹ کے لہجے کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ ناولٹ لسانی تجربے کے علاوہ ایک ہلکے پھلکے انداز کی ایسی دلچسپ کہانی ہے جسے ایک نشست میں پڑھا جا سکتا ہے۔ آغا گل کے ناولوں کے بارے شاہد علی خان لکھتے ہیں:

اس کے ناول دشتِ وفا اور بابو بنیادی طور پر ہیں۔ ایسے ناولوں کے ہیرو کسی مروجہ ضابطہ اخلاق کے پابند نہیں ہوا کرتے۔ عرفِ عام میں انہیں بدمعاش کہا جاتا ہے۔ جینے کی راہ خود ہی نکالتے ہیں۔ اس کے ہیرو بھی اینٹی

ہیرو کے زمرے میں آتے ہیں، جن کے کرداروں میں اخلاقی قدروں کی گنجائش نہیں۔[۴۷]

فسانہ جنات

آغا گل کا وہ ناول ہے جسے مصنف نے اینٹی ناول اور بلوچستان کا پہلا نثری رزمیہ قرار دیا۔ان کے بقول ''فسانہ جنات ایک رزمیہ ہے یا شاید ایک نامکمل رزمیہ گمشدہ اوراق والا''۔[۴۸]

اس قصے میں مصنف صیغہ واحد متکلم میں کہانی سناتا ہے وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ریلوے کی مرمت کا کام دیکھنے جاتا ہے۔ وہاں وہ گھومتے ہوئے دور نکل جاتا ہے اور بارش ہونے پر ایک پہاڑ کی غار میں پناہ لیتا ہے۔ جہاں اس کی ملاقات کئی جنات سے ہوتی ہے جن کے نام کلتاش، یوبل، فماش، عیوش تنکا میل، حائیل اور شکراج وغیرہ ہوتے ہیں۔ وہ اسے بلوچستان میں انگریز دور میں ریلوے کے قیام کے دوران آنے والے واقعات سناتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کو یہاں ریلوے لائن بچھاتے ہوئے نہ صرف قبائل کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا بلکہ عناصر فطرت بھی ان کی راہ میں مزاحم ہوئے تھے۔ اس میں بلوچستان کے کئی شہروں اور قبیلوں کے ناموں کا تاریخی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس قصے میں زیادہ تر بلوچستان کا جغرافیائی مطالعہ حاوی نظر آتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسے ناول بھی قرار دیا جا سکتا ہے نہیں مصنف نے بہر حال اسے ناول ہی لکھا ہے۔

راز محمد راز

پروفیسر راز محمد راز پشتو کے شاعر اور ناول نگار تھے۔انھوں نے اردو میں صرف ایک ناول لکھا، جس کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

دی ہولی سینرز (The Holy Sinners)

یہ کل ۹۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ناول دی ہولی سینرز مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے۔ مصنف کے بقول: ''میں نے اس کہانی میں کائناتی جنسی نظریے کے تناظر میں گناہ کے Mystic مفہوم کو ایک نئی جہت دینے کی سعی کی ہے۔''[۴۹]

اگر چہ اس قصے میں اسلوب اور فن کی سطح پر کچھ سقم پائے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ راز محمد خان اپنے ناول میں گناہ کے بارے میں ایک بالکل مختلف اور نقطۂ نظر پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اس ناول کے چار مرکزی کردار ہیں۔ان میں ونیزہ احمد اس کا شوہر شعیب احمد خان، ونیزہ کی سہیلی، روشن عبدالعزیز اور اس کا امریکی استاد جیمز رابرٹ، مصریوں ہے کہ ونیرہ احمد معاشرے میں طوائفوں کی موجودگی کو ایک مثبت پہلو سمجھتی ہے۔اس کے خیال میں طوائفوں کی موجودگی کی بدولت عزت دار گھرانوں کی خواتین کی عصمتیں محفوظ رہتی ہیں۔وہ ان طوائفوں کو عملی طور پر خراج تحسین ادا کرنے کے لیے سہاگ رات ایک طوائف کے کوٹھے پر بسر کرنا چاہتی ہے چنانچہ وہ ضد کر کے اپنے شوہر شعیب احمد خان کو اپنے ساتھ وہاں لے جاتی ہے مگر شب بسری کے بعد شعیب احمد خان احساس گناہ کا شکار ہو کر اپنی مردانگی کھو دیتا ہے۔دونوں میاں بیوی کے درمیان اس وجہ سے سرد مہری پیدا ہو جاتی ہے۔شعیب سے مایوس ہونے کے بعد ونیزہ ایک فیکٹری کے مارکیٹنگ افسر شمس سے تعلقات قائم کر لیتی ہے۔اس دوران میں اس کی سہیلی روشن عبدالعزیز امریکہ سے نفسیات میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد لوٹ آتی ہے۔ وہ اپنے استاد جیمز رابرٹ کا مسلک بھی اختیار کر چکی ہوتی ہے جو شادی نہیں کرتے، نہ ہی جنسی تعلقات بناتے ہیں بلکہ اپنی ورجنٹی (Verginity) کی شکتی کے ساتھ جیتے ہیں تا کہ موت کے بعد اپنی مرضی کی صورت اختیار کر سکیں۔ اس لیے وہ اپنے سفلی جذبات کو تسخیر کرنے کے جتن کرتے ہیں۔روشن اپنی سہیلی ونیزہ کی صورت حال سے آگاہ ہونے کے بعد شعیب کا علاج کرنا چاہتی ہے۔شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اسے پسند کرنے لگتی ہے۔پھر ایک روز جب شعیب احمد اپنی شادی کی سالگرہ کے دن اسی کوٹھے پر اس کمرے میں موجود ہوتا ہے جہاں اس نے سہاگ رات منائی تھی۔روشن پہنچ آتی ہے۔دونوں میں پہلے محبت اور پھر لڑائی ہوتی ہے۔تب دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زخمی حالت میں لپٹ جاتے ہیں۔اس اثنا میں شعیب احمد کی مردانگی لوٹ آتی ہے اور وہ روشن کے ساتھ جنسی تعلقات بناتا ہے۔روشن بعد میں پچھتانے پر جب اپنے استاد جیمز کے ساتھ رابطہ کرتی ہے تو وہ فوراً اس کے پاس لاہور آ جاتا ہے۔جو اس ناول کا لوکیل ہے۔جیمز روشن کو سمجھاتا ہے کہ ایک نیک مقصد کے لیے (یعنی شعیب کی مردانگی بحال کرنا) اس کا اپنی ورجنٹی (Verginity) کھونا اور گناہ پر آمادہ ہونا اصل میں گناہ نہیں ہے۔یوں وہ اُسے گناہ کے کائناتی جنسی نظریے کے بارے میں بتاتا ہے جس کے مطابق سورج زمین، چاند، ستارے انسان، حیوان سب اشیاء ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہیں یا جنسی ملاپ کرتے ہیں۔تب خود جیمز بھی پہلے ونیزہ کی طرف راغب ہوتا ہے مگر پھر روشن کے ساتھ جسمانی تعلقات استوار کرتا ہے۔اس کے بعد اچانک روشن کی موت غیر فطری طور پر دکھائی جاتی ہے۔ناول دی ہولی سنیرز کی زبان سادہ اور رواں ہے۔اردو محاورے نہ ہونے کے برابر ہیں۔بعض جگہ انگریزی کے الفاظ رومن رسم الخط میں ملتے ہیں۔اس ناول میں جنسی گناہوں کو فلسفیانہ طور پر جسٹس

فائی کرنے کی کاوش ملتی ہے۔اس لیے اس کی زبان بھی فلسفیانہ،سنجیدگی کی حامل ہے۔اس میں فلسفے کی مختلف اقسام مثلاً،سیریلزم،اسکزم،نفسیات،شعور،لاشعور،تحت الشعور،ایڈی پس کمپلیکس،جمالیاتی بصیرت وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ناول میں ڈیکارٹ،فرائیڈ اور کافکا جبکہ مصنف کے اپنے دیباچے میں دیگر بہت سارے مغربی فلسفیوں کے تذکرے اور افکار سے راز محمد خان کے Sorce of incipiriation کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ناول مں پیش کیا گیا گناہ سے متعلق نظریہ ان کا اپنا ہے مگر اسے کہانی کا روپ ضرور انھوں نے دیا ہے۔

ہاشم ندیم

ہاشم ندیم اب تک سات ناول لکھ چکا ہے۔اگر چہ اس کے تمام ناول کمرشل ناول کے زمرے میں آتے ہیں مگر ان میں دلچسپی کا عنصر بہر حال پایا جاتا ہے۔بعض ناولوں میں کئی اہم نکات بھی آتے ہیں۔ ہاشم ندیم کے مختلف ناولوں کا الگ الگ مطالعہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

خدا اور محبت

یہ ناول ۱۳۷ابواب اور ۲۸۰صفحات پر مشتمل ہے۔اس ناول کا مرکزی موضوع محبت ہے جبکہ مذہب اس کا ایک ذیلی موضوع ہے۔ ناول کا ہیرو حماد امجد صیغہ واحد متکلم میں اپنی کہانی سناتا ہے۔ ناول کا لوکیل کوئٹہ اور لندن ہیں۔اس ناول میں ایک باب کوئٹہ جبکہ دوسرا لندن میں پیش آمدہ واقعات پر مشتمل ہے جہاں ہیرو محبت کے تجربے سے گزرنے کے بعد تعلیم حاصل کرنے پہنچتا ہے۔کوئٹہ کا باب ماضی جبکہ لندن کی کہانی حال کے دائرے میں رواں نظر آتی ہے۔اس طرح گویا ناول فلیش بیک تکنیک میں لکھا گیا ہے۔

ناول خدا اور محبت کی کہانی یوں ہے کہ حماد امجد جو ایک کمشنر کا بیٹا ہوتا ہے اسے اپنے بھتیجے کو قرآن پڑھانے والے غریب مولوی علم کی بیٹی ایمان سے یک طرفہ محبت ہو جاتی ہے۔وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر اس کا سخت گیر والد اُسے گھر سے نکال دیتا ہے۔تب وہ ایک طویل عرصہ ریلوے سٹیشن پر قلی کی ملازمت کرتا ہے مگر ایمان کا والد کسی بھی صورت اپنی بیٹی کی شادی حماد سے نہیں کرنا چاہتا وہ اس کی شادی اپنے بھتیجے سے طے کر دیتا ہے۔ایمان پہلے تو حماد سے محبت سے انکار کرتی ہے اور اسے واپس اپنے گھر بھیجنا چاہتی ہے مگر جب شادی نزدیک آتی ہے تو وہ بھی حماد کی محبت میں مبتلا ہو کر شدید بیمار پڑ جاتی ہے چونکہ وہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے کھل کر اظہار اور اقرار نہیں کر پاتی اور گھل گھل کر بیمار پڑ جاتی ہے۔اس کی جان کنی کے عالم میں یہ راز کھلتا ہے تو حماد کو بلایا

جاتا ہے۔اسے دیکھتے ہی ایمان انتقال کر جاتی ہے۔ یہ سانحہ حماد کے حواس معطل کر دیتا ہے اور وہ مہینوں ہسپتال میں زیر علاج رہتا ہے۔ علاج ہونے کے بعد اس کے ماں باپ اور مولوی اس سے معافی کے طلب گار ہوتے ہیں کہ وہ لوگ اس کی سچی محبت کو وقت پر سمجھ نہیں پائے تھے۔اس کے بعد حماد کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اور پڑھنے کے لیے لندن بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنے دوست کامران کے فلیٹ پر رہتا ہے۔لندن میں اس کی ملاقات اپنی یہودی کلاس فیلو سارہ آئزک اور جم وغیرہ سے ہوتی ہے جو یہودی ہوتے ہیں اور مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ سارہ کے گروپ اور حماد میں کئی بار مذہبی حوالے سے تلخ باتیں ہوتی ہیں۔سارہ خود ایک نہایت لائق اور سچ کی پرستار طالبہ ہوتی ہے۔مختلف مواقع پر جب حماد کو ناکردہ گناہوں کی سزا دیتے ہوئے یونیورسٹی سے نکالے جانے کی کوششیں ہوتی ہیں تو سارہ حماد کی طرف داری کرتی ہے۔ جم وغیرہ سے بھی اس کی بالآخر دوستی ہو جاتی ہے۔

حماد اپنے ٹرم پیپر کے لیے یہودیوں کے معروف نظریے ہالوکاسٹ کی حقانیت پر سوال اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔وہ اپنا مواد حاصل کرنے کے لیے جس لائبریری سے رجوع کرتا ہے اس کا لائبریرین متنازعہ مواد اس کے حوالے کرنے سے پس و پیش سے کام لیتا ہے بلکہ اسے دھمکاتا بھی ہے مگر حماد اپنی تحقیق سے باز نہیں آتا۔نتیجتاً وہ حماد کی شکایت پہلے یونیورسٹی آفس اور پھر پولیس میں کرتا ہے اور اس پر جھوٹے الزامات لگاتا ہے اسے یونیورسٹی ڈین کی پس پشت حمایت حاصل ہوتی ہے جو سارہ کا والد ہوتا ہے۔اس تحقیق کے تنازعے میں باپ بیٹی میں فاصلے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ سارہ ہر حال میں سچ کی حمایت کرنا چاہتی ہے۔ٹرم پیپر مکمل ہو جانے کے بعد حماد کو اُسے سٹوڈنٹس کے ہال میں پیش کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔تب سارہ اپنے ٹرم پیپر کی بجائے حماد کا ریسرچ ورک پیش کرتی ہے۔جس سے یونیورسٹی اور بعد ازاں شہر میں حالات خراب ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔آخر کار سارہ اسلام قبول کر لیتی ہے اور حماد اس کا نام ایمان تجویز کرتا ہے۔حماد کو پولیس کے دباؤ پر لندن چھوڑنا پڑتا ہے۔

خدا اور محبت میں جذبات کی فراوانی ملتی ہے۔ہاشم ندیم پر اثر تحریر لکھنے پر قادر ہے۔جو بعض اوقات قاری پر رقت طاری کر دیتی ہے۔عطا الحق قاسمی کی یہ رائے درست ثابت ہوتی ہے کہ:''یہ تکیے بھگو دینے والی کہانی ہے۔ناول میں ہیرو کی محبت کی تپش اس کے قاری کو بھی پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔''[۵۰]

ہاشم ندیم کی تحریر میں اردو روزمرہ اور محاورے، کہاوتوں کا استعمال عام ملتا ہے۔ایک آدھ جگہ غالب کے اشعار بھی نظر آتے ہیں۔اس کی تحریر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو ادب پر خاصی نظر رکھتا ہے۔جس کی وجہ

سے اس کی تحریر رواں اور دلچسپ نظر آتی ہے۔ ناول کا ہیرو ایک جگہ تشبیہ دیتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''میں اس بچے کی طرح گاڑی نکال کر اپنی پرانی حویلی کی طرف بھاگا جو اپنے روزے کے دن عصر کے وقت سے ہی روزہ کھلنے کے انتظار میں دسترخوان پر جا بیٹھتا ہے۔'' [۵۱]

بچپن کا دسمبر

یہ ناول تین ادوار اور بچپن ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں الگ عنوان ہے۔ اس کے کل صفحات کی تعداد ۳۲۰ ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ناول بچپن کے دسمبر کی کہانی ہے بلکہ صرف دسمبر نہیں بلکہ ان سارے موسموں کی کہانی ہے جو کوئی شخص زندگی بھر جیتا ہے مگر ان کا آغاز بچپن سے ہوتا ہے۔

اس ناول کا پہلا حصّہ ناول کے ہیرو عباد جسے ناول میں آدی کہا گیا ہے کے بچپن کی کہانی ہے جو تین درجوں میں تقسیم ہے۔ آدی کا بچپن سرکاری ملازمت کی ایک کالونی میں گزرتا ہے۔ اس میں اس کے بچپن کے دوستوں کی ننھی منھی شرارتوں کا تفصیلی ذکر ہے اور اس کی جوانی یعنی وجیہہ کا جو آدی سے سات آٹھ سال بڑی ہوتی ہے مگر آدی کو اس سے ایک خاص نسبت ہوتی ہے جو تا آخر باقی رہتی ہے۔

ناول کا دوسرا حصّہ آدی کے کیڈٹ کالج میں گزاری زندگی اور اس میں پیش آمدہ حالات واقعات پر مشتمل ہے۔ کیڈٹ کالج میں بچوں کو جس طرح فوجی زندگی کی مشقیں کرائی جاتی ہیں اور تعلیم کے ساتھ ساتھ جو تربیت دی جاتی ہے۔ کیڈٹس کالج میں اپنے سینئرز، جونیئرز اور دوستوں کے ساتھ مل کر جو شرارتیں کرتے ہیں ان سب کا دلچسپ اور تفصیلی ذکر اس حصے میں ملتا ہے۔

ناول کا تیسرا حصّہ آدی کی عملی زندگی میں قدم رکھنے سے متعلق ہے جب وہ سی ایس پی آفیسر بن کر اپنے شہر کو لوٹتا ہے۔ اس کے ساتھ اس میں اس کی بچپن کی آپی یعنی وجو کی مشکل زندگی بیان کی گئی ہے۔ لیکن اس کا تذکرہ دوسرے باب میں بھی ملتا ہے جب وجو کو ٹیوشن پڑھانے والے اور پسند کرنے والے طاہر بھائی کو اِکو نامی آوارہ نوجوان قتل کر دیتا ہے۔ پھر وجو کی شادی ایک ناکارہ شخص ناصر کے ساتھ ہوتی ہے جو اس کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے آخر وجو کو طلاق ہو جاتی ہے۔ طلاق کے کافی عرصہ بعد ریحان نامی شخص جس کے بچوں کو وجو ٹیوشن پڑھاتی ہے اور وہ ایک مہذب شخص ہوتا ہے۔ وجو کے رشتے کا طالب ہوتا ہے۔ آدی کو جب اس کا پتہ چلتا ہے تو وہ عمر کے فرق کے باوجود وجو سے اپنی دوستی اور انسیت کے باعث شادی کا ارادہ ظاہر کرتا ہے مگر وجو اس کی دوستی اور انسیت کو شادی سے

زیادہ گہرا اور پروقار رشتہ قرار دیتے ہوئے ریحان سے شادی پر آمادہ ہوجاتی ہے آخر کار اس کی رخصتی ہوجاتی ہے۔

بچپن کا دسمبر ایک معاشرتی ناول ہے جس میں بچپن سے لے کر جوانی تک کے مختلف کردار بھرپور زندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ ناول کی ہیروئن وجو بچپن سے ہی اپنی شکل وصورت اور گفتار و کردار کی بناء پر ایک الگ ہستی نظر آتی ہے جس کا سحر نہ صرف ناول کے ہیرو آدی بلکہ قاری پر آخر تک برقرار رہتا ہے۔ ناول کی زبان رواں اور پر اثر ہے۔ اُردو کے محاورے اور کہاوتیں کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ مصنف حالات واقعات کو فطری انداز میں لکھنے پر قدرت رکھتا ہے۔ جذبات نگاری اس کی تحریر کی ایک خاص پہچان ہے۔ ناول میں بچپن کی زندگی، کیڈٹ کالج میں تعلیم اور ناول کے ہیرو کا سی ایس ایس کر کے افسر بننے میں مصنف کے سوانحی حالات کا شائبہ نظر آتا ہے۔ کمرشل ناول کے زمرے میں شامل ہونے کے باوجود مجموعی طور پر یہ ایک قابل مطالعہ ناول ہے۔

عبداللہ

اس ناول کے دو حصّے ہیں، پہلا حصّہ ۲۶۴ جبکہ دوسرا حصّہ ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول کا ہیرو ساحر معاشرے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس لیے وہ خاصا بگڑا ہوا نوجوان ہوتا ہے جو ریس جیتنے کے لیے لاکھوں روپے مالیت کی نئی گاڑی تباہ کر دیتا ہے اور اسے ذرا ملال نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں پھر ایک روز وہ ایک لڑکی زہرا کو دیکھتا ہے جو ایک مزار پر آتی ہے تو اس کا دیوانہ ہوجاتا ہے۔ شادی کا پیغام بھیجتا ہے جو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ تب بھید کھلتا ہے کہ وہ اس مزار کے متولی عبداللہ کی دیوانی ہوتی ہے۔ ساحر اس کے عشق میں مزار پر حاضر ہوتا ہے تو اسے سلطان بابا مزار کا متولی مقرر کر کے اس کا نام عبداللہ تجویز کرتے ہیں اور پچھلے والے عبداللہ کو دوسری جگہ بھیج دیا جاتا ہے۔ تب نیا عبداللہ یعنی ساحر سلطان بابا کی معیت میں مختلف جگہوں پر عجیب وغریب حالات سے گزرتا ہے اور مصیبت میں پھنسے ہوئے لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ ناول میں مافوق الفطرت کردار یعنی بھوت جن وغیرہ بھی نظر آتے ہیں اور ان کا سایہ کئی لوگوں کی زندگی اجیرن کرتا ہے۔ جنھیں عبداللہ اور سلطان بابا اپنی روحانی طاقتوں سے خلاصی دلاتے ہیں۔ ناول عبداللہ دراصل انسانی زندگی میں قائم متوازی روحانی نظام کی کہانی ہے جسے معاشرے کا ایک بڑا طبقہ حقیقت سمجھتا ہے جبکہ چند لوگ اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اگرچہ ناول میں حالات وواقعات کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے لیکن مصنف کا اسلوب اور واقعات کا بہاؤ قاری کی توجہ آخر تک قائم رکھتا ہے۔ ناول میں کہیں کہیں روحانی نظام کے بارے سائنسی طرزِ فکر کی مثبت رائے سے اس نظام کی حقانیت کے بارے

میں قاری کو قائل کرنے کی کاوش بھی ملتی ہے۔ عبداللہ یعنی ساحر کو بالآخر کامیابی ملتی ہے اور وہ اپنی محبت زہرا کے روپ میں حاصل کر لیتا ہے۔

پری زاد

یہ ناول دراصل ہاشم ندیم کے اسی عنوان سے لکھے گئے افسانے کی توضیحی شکل ہے جو ان کے افسانوی مجموعے صلیبِ عشق میں شامل ہے۔ اس کی مرکزی کہانی بعینہٖ وہی ہے البتہ اس میں حالات و واقعات کا اضافہ ضرور نظر آتا ہے اور شاید یہ اضافہ ناول کی شکل دینے کے لیے ناگزیر تھا۔ صلیب عشق میں شامل ایک اور افسانے ''انتونیو'' کو بھی اس کا حصّہ بنایا گیا ہے جو سپین میں ہونے والی بل فائٹنگ سے متعلق ہے۔ پری زاد اس شخص کا المیہ ہے جس کا نام تو اگرچہ پری زاد تھا مگر وہ ایک بدصورت شخص تھا جسے کوئی بھی شخص دوسری نظر دیکھنے کی تاب نہ لا سکتا۔ خصوصاً لڑکیاں اسے کسی طور پسند نہ کرتیں۔ اس لیے تمام عمر وہ محبت پانے میں ناکام رہا۔ آخر اس کی زندگی میں ایک نابینا لڑکی قرۃ العین آتی ہے جو مصور ہوتی ہے اور کسی بھی نقش کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے محسوس کر کے کینوس پر شکل میں ڈھالتی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوتی ہے مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرتے۔ قرۃ العین اپنی آنکھوں کے علاج کے لیے امریکہ جاتی ہے جس کا خرچ پری زاد اٹھاتا ہے مگر اس کے امریکہ جانے کے بعد وہ اپنی بیش بہا سرمائے کی حامل دنیا کو تیاگ دیتا ہے اور خود کو گم کر دیتا ہے۔ کیونکہ اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ بینائی لوٹنے کے بعد جب عینی اُسے دیکھے گی تو وہ اس سے محبت نہ کر پائے گی جو ناول کے آخر میں عینی سے اتفاقیہ ملاقات میں غلط ثابت ہوتا ہے مگر پری زاد مشکل حالات سے گزرنے کی وجہ سے سخت بیمار ہوتا ہے اور عینی کی گود میں سر رکھے مر جاتا ہے۔ یوں ناول میں اس کا انجام افسانے 'پری زاد' سے مختلف نظر آتا ہے کہ وہاں عینی اُسے اپنے ساتھ واپس لے جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو افسانے کا انجام حقیقت سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔

مقدس

جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے یہ ناول ایک مقدس مشن کی تکمیل کرتا ہے۔ ناول میں لوکیل اور اس کا زمانہ نائن الیون کے بعد کے امریکہ کا شہر نیویارک ہے جہاں اس واقعہ کے فوری بعد مسلمانوں سے شدید نفرت اور تعصب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یونیورسٹیز میں تعلیم پانے والے مسلم طلبا بھی اس نفرت کا نشانہ بنتے ہیں۔ ناول

میں ایک امریکی یونیورسٹی میں طلبا کی مذہبی سیاست کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کا ہیرو پاکستانی نژاد امریکی شہری آیان احمد ہے جو ایک لاابالی نوجوان ہوتا ہے اور اسے طلبہ سیاست یا اپنے مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ ایک مسلم نوجوان بابر کی رقابت میں یہودی کونسلر کی ایما پر مسلم سوسائٹی کا حصّہ بنتا ہے تا کہ ان کی مخبری کر سکے۔ پھر حالات ایسا رُخ اختیار کرتے ہیں کہ مسلم کونسلر عامر بن حبیب کو گرفتار کر لیا جاتا ہے تو آیان احمد کو مسلم کونسلر نامزد کیا جاتا ہے۔ تب آیان احمد اپنے ماضی کی غلطی کو درست کرنے کی خاطر مسلم طلبا کے مفادات کے لیے خود کو وقف کر دیتا ہے۔ اُسے پہلے عیسائی اور یہودی کونسلروں کی دشمنی ملتی ہے مگر وہ اپنے کردار سے ان دونوں کے ساتھ تعلقات استوار کر لیتا ہے۔ اس کا امتحان تب ہوتا ہے جب یونیورسٹی ڈنمارک کی ایک این جی او کی ایما پر مقدس شخصیات کے توہین آمیز خاکوں پر مبنی ایک سیمینار کی اجازت دیتی ہے۔ اس سے مسلم طلباء میں شدید بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ وہ یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتے ہیں مگر آیان احمد انھیں ایسے کسی بھی اشتعال انگیز اقدام سے روک دیتا ہے۔ وہ انھیں سمجھاتا ہے کہ ہم ان کا مقابلہ حکمت عملی سے کریں گے۔ تب وہ چندہ مہم شروع کر کے ہال کی تمام ٹکٹیں حاصل کر لیتا ہے۔ عیسائی اور یہودی کونسلر بھی اپنی ٹکٹیں اسے دے دیتے ہیں کہ وہ بھی مذہبی شخصیات کی توہین نہیں چاہتے۔ اس طرح بخیر و خوبی یہ معاملہ حل ہو جاتا ہے۔ آخر میں آیان کو پولیس تفتیش کے لیے گرفتار لیتی ہے۔ ہاشم ندیم کے اس ناول میں بھی دیگر ناولوں کی طرح محبت کی ایک زیریں لہر چلتی رہتی ہے۔ درحقیقت مــقــدس معاصر عہد میں مقدس شخصیات کے احترام کی سوچ اجاگر کرنے کی ایک کامیاب کاوش ہے۔

ایک محبت اور سہی

یہ ناول بھی گرچہ محبت کے موضوع پر لکھا گیا ہے مگر محبت اس کا ذیلی موضوع ہے۔ اس کا اصل موضوع معاشرے کے ایک غریب اور بگڑے ہوئے نوجوان آیان احمد [ناول مقدس کے ہیرو کا بھی یہی نام ہے] کا بخت کی یاوری سے حکومت تک پہنچنا۔ لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اسمبلی ممبر بننا ہے تا کہ معاشرے کو بہتر بنایا جا سکے۔ آیان احمد ایک غریب نوجوان ہوتا ہے جس کا والد نالاں ہو کر اسے گھر سے نکال دیتا ہے۔ وہ گلی محلے کی لڑائی میں نام پیدا کر کے رنگا استاد کے ڈیرے تک پہنچتا ہے جو شہر کے ایک حصّے کا مالک ہوتا ہے۔ وہاں وہ لڑائی بھڑائی اور چاقو گری کا فن سیکھتا ہے۔ وہ رنگا استاد کی بیٹی کو اردو پڑھاتا ہے اور اس کا بھائی بن جاتا ہے اس لیے رنگا استاد کی نظر میں ایک معتبر حیثیت رکھتا ہے تب وہ رنگا استاد کو اس دنیا سے نکالنا چاہتا ہے اور اس کے لیے الیکشن لڑتا ہے۔ رنگا استاد کے

گروپ کی مدد اور عام لوگوں کی حمایت سے وہ اسمبلی ممبر بن جاتا ہے۔ آیان احمد جسے ناول میں انو کہا جاتا ہے عام لوگوں کے ساتھ مل کر گلی محلے اور شہر کے مسائل کے لیے نہ صرف آواز اٹھاتا ہے بلکہ عملی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ:

> ہم اگر تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے گھر اور گلی سے ابتداء کرنی ہوگی۔ گھر گلی محلّہ، سڑک، یونین کونسل، شہر ضلع صوبہ اور پھر ملک یہ ترتیب رہے گی۔ تبھی ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں گے۔ خود کو تبدیل کیے بنا نظام کو بدلنے کی باتیں صرف ایک دھوکہ اور سراب ہوتی ہیں۔ [۵۲]

شاہ نواز علی کے ناول

حالیہ برسوں میں شاہ نواز علی کے چار ناول شائع ہوئے ہیں۔ یہ چاروں ناول مقبول عام ادب کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان میں معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ذیل میں ان ناولوں کا الگ الگ تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

بددعا

اس کمرشل ناول میں معاشرے کی خانگی الجھنوں کو بیان کیا گیا ہے اس میں سعید اور ناصرہ کے گھرانے کے پس منظر میں لوگوں کی کم ظرفیوں اور دل زاریوں کی بناء پر مشکلات سے گزرنے کو کہانی کا موضوع بنایا گیا ہے انسان اگر عادات بد میں مبتلا ہوں تو ان کی لڑائی جھگڑے کی عادت، دوسروں کو قبول نہ کرنا اور ہوس زر کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ یہ سب اس گھرانے کے مختلف افراد بھی رضوان، غزل اور سائزہ جو سعید اور ناصرہ کے بچے ہوتے ہیں اس روپ میں ملتا ہے ناصرہ ہوس زر اور لالچ میں ان کی امیر گھرانوں میں شادی کرتی ہے اور اپنی بہوؤں کو محبت اور عزت دینے کی بجائے ان کی بے عزتی کرتی ہے اور ان کے ماں باپ سے دولت سمیٹنا چاہتی ہے اس کی بیٹیاں سائرہ اور غزل بھی غلط خیالات کے باعث اپنی نارمل زندگی میں مشکلات پیدا کر لیتی ہیں جب ناصرہ اپنے بیٹے علی سے اس کی بیوی نائلہ کو ناحق طلاق دلاتی ہے تو وہ اس گھرانے کے اجڑنے کی بددعا دیتی ہے جو قبول ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ گھرانا اجڑ جاتا ہے۔ تب بہت ساری مشکلات سے گزرنے کے بعد یہ لوگ نصیحت پاتے ہیں اور اپنے رویے درست کرنے کے ساتھ ساتھ نائلہ سے معافی طلب کرتے ہیں۔ اس کے معاف کرنے پر یہ پھر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں مگر ناصرہ زخمی ہونے کی وجہ سے جانبر نہیں ہو پاتی اور اس کی وفات ہو جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے کے لوگ کس طرح

بے جا دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہیں اور ہوس زر میں مبتلا ہو کر دستیاب اور میسر نعمتوں کو ٹھکراتے ہیں۔ اس کا احساس انہیں تباہ و برباد ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ اس ناول میں شادی جو ہمارے معاشرے کا ایک اہم مسئلہ ہے بنیادی موضوع ہے اکثر والدین رشتہ دیکھتے ہوئے انسان کی اچھائی اور شرافت کی بجائے اس کے عہدے اور دولت میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ زندگی کو خوبصورت بنانا چاہتے ہیں مگر اس لالچ میں اپنا اطمینان قلب کھو دیتے ہیں اور پہلے سے زیادہ پریشان کن حالات کا سامنا کرتے ہیں۔ شاہ نواز علی نے اس مسئلے کو اچھے انداز میں اپنے اس ناول میں پیش کیا ہے کمرشل ناول کے طور پر یہ ایک قابل مطالعہ ناول ہے اس کا انداز بیاں سادہ اور رواں ہے۔

مجھے پاکستان سے جانا ہے

ناول مجھے پاکستان سے جانا ہے کے عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ ان پاکستانیوں کی کہانی ہے جو پاکستان میں مشکل حالات سے مایوس ہو کر غیر ممالک میں قسمت آزمائی کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہاں پہنچتے ہی ان پر ہن برسنا شروع ہو جائے گا اور وہ دولت مند اور مالا مال ہو جائیں گے۔ وہ یہ حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ بیرون ملک جانے والوں کو نہ صرف سخت حالات سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ انتھک محنت کے بعد وہ آسائش کی زندگی حاصل کرتے ہیں یہی محنت وہ اگر اپنے ملک میں کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی ان کے حالات بہتر ہو جائیں اور وہ ان مشکلات کا سامنا کرنے سے بچ جائیں۔ جو ایسے لوگوں کو غلط راستوں سے بیرون ملک جاتے ہوئے پیش آتی ہیں ناول مجھے پاکستان سے جانا ہے کے مرکزی کردار نعمان اعجاز اور شہ زور ہیں۔ ان میں سے نعمان اور اعجاز کسی نہ کسی طرح باہر جانا چاہتے ہیں۔ آخر کار وہ بمشکل مطلوبہ رقم کا بندوبست کر کے ایجنٹ کے ذریعے پہلے انڈونیشیا اور پھر وہاں سے غیر قانونی طور پر کشتی کے ذریعے آسٹریلیا جاتے ہیں۔ ان کا ایجنٹ دراصل خان جیلانی خان کا بندہ ہوتا ہے اور یہ خان جیلانی خان مختلف غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہوتا ہے جن میں نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کو غیر ملک میں ملازمت کا جھانسا دے کر جسم فروشی پر مجبور کرنا، کمسن بچوں کو اغواء کر کے اونٹ ریس کے لئے دبئی بھجوانا ہے جبکہ نشے کے عادی افراد کو اغوا اور قتل کے بعد ان کے پنجر طبی تحقیق کے اداروں کو منہ مانگی قیمت پر بیچنا ہیں۔ خان جیلانی خان اور اس کا سارا گروہ پولیس افسر شکیل احمد کی ایماندارانہ تفتیش کے باعث بالآخر انجام کو پہنچتا ہے۔ نعمان آسٹریلیا کے راستے میں شدید مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ اعجاز بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہاں اس کی لاٹری بھی نکل آتی ہے اور وہ کروڑ پتی بن جاتا ہے جبکہ

نعمان سمندر میں گرنے کے باعث کوسٹ گارڈ کے ہاتھ لگتا ہے اور بالآخر خالی ہاتھ واپس بھیج دیا جاتا ہے دیکھا جائے تو یہ ناول میں پاکستانی بالخصوص کوئٹہ کے نوجوانوں کی آسٹریلیا جانے کے رجحان کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔شہہ زور پاکستان میں رہ کر محنت کرتا ہے اور سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے سول آفیسر بن جاتا ہے۔اس طرح ناول کے آخر میں مصنف کا اپنے ملک میں محنت کر کے عزت کا روزگار حاصل کرنا جیسا تعمیری مقصد سامنے آتا ہے۔

شب گزیدہ سحر

ناول شب گزیدہ سحر گھریلو معاملات بالخصوص نوجوانوں کی شادیوں کو موضوع بناتے ہوئے اس میں والدین کی ہوس زر اور عاقبت نااندیشیوں کے طفیل زندگی میں درآنے والی مشکلات پر لکھا گیا ہے جنس زندگی کی ٹھوس حقیقت ہے ہر نوجوان چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی جوان ہوتے ہی مخالف جنس میں کشش پاتا ہے اور اپنے لئے ایک مناسب رشتہ ڈھونڈتا ہے۔اس طرح وہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ناول شب گزیدہ سحر میں اپنے ملک میں بلکہ رشتے داروں میں مناسب رشتے ہونے کے باوجود والدین اپنی بیٹیوں ہما اور زارا کی بیرون ملک سے آئے دونوجوان بھائیوں سے شادی کر دیتے ہیں یہ دونوں جب لندن پہنچتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ سونیا جو مدثر اور دانیال کی بہن ہوتی ہے اپنی لانڈری کی شاپس کے لئے مفت نوکرانیوں کے حصول کے لئے بھائیوں کی شادیاں ان دیسی لڑکیوں سے کی ہے۔مدثر اور دانیال وہاں کی دو انگریز لڑکیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سے شادی کے خواہش مند ہوتے ہیں اس ساری صورتحال میں ان کی ماں مسز شبیر پہلے منفی اور بعد میں مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ وہ اپنے بیٹوں سے ان لڑکیوں کی شادی تو کرتی ہے مگر جب ہما اور زارا پر مشکل وقت آتا ہے تو ان کی مدد بھی کرتی ہے اور آخر میں مرنے سے قبل اپنی جائیداد ان کے نام کر جاتی ہے اس ساری صورتحال میں ہما کا کزن عابد جو اس سے محبت کرتا ہے کو ناحق اس محبت میں خوار ہوتے دکھایا گیا ہے بعض جگہ کئی واقعات اور کرداروں کے اعمال غیر حقیقی اور افسانوی لگتے ہیں اگر یہ پیش نظر رکھا جائے کہ تو کمرشل ناولوں میں اس طرح کے واقعات و حالات پیش کئے جاتے ہیں تو زیادہ اچنبھا نہیں ہوتا۔

آدم زادیاں

ناول آدم زادیاں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس کا موضوع عورت ہے۔وہ عورت جس کا جنسی اور معاشی استحصال کیا جاتا ہے۔اس میں مردانہ اور جاگیردانہ معاشرے میں جنسی استحصال کا شکار عورت کی عکاسی کی گئی

ہے۔نو جوان لڑکیوں سے نہ صرف جنسی زیادتی کی جاتی ہے بلکہ اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے انہیں قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔ناول کا آغاز جنسی زیادتی اور قتل کر کے بعد ملنے والی نو جوان لڑکیوں کی لاشوں اوران کی تفتیش سے ہوتا ہے۔آدم زادیاں میں ایسے مختلف نسوانی کردار پیش کئے گئے ہیں جنہیں ورغلا پھسلا کر جسم فروشی ایسے مکروہ دھندے میں ملوث کیا جاتا ہے۔ایسے مختلف کرداروں میں ثانیہ ارم' شمسہ' نغمہ' گل' رابی' عندلیب اور ساجدہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب کو قابو کرنے اور جنسی دھندہ کرنے میں نگار اور اس کی بہن عالیہ جیسی خواتین بھی ملوث ہوتی ہیں۔یہ عورتیں مختلف بیوروکریٹس اور امراء کے ساتھ تعلقات بناتی اور انہیں عیاشی کے لئے نو جوان لڑکیاں فراہم کرتی ہیں۔۔یوں عورت خود بھی عورت کے استحصال میں مددگار اور معاون ہوتی ہے یہ حقیقت ہے کہ عورت کیمعاونت کے بغیر عورت کا استحصال مشکل ہوتا ہے۔ناول میں سمیع ایسا مرد بھی ہے جو مختلف لڑکیوں کے ساتھ شادی کر کے انہیں اس دھندے میں پھنساتا ہے۔ناول کے ظالم کرداروں میں بہت سے وقتی عیاش طبع لوگوں کے علاوہ احسن اس کا مرکزی کردار ہے۔جو معصوم لڑکیوں کی عصمت پامال کرتا ہے وہ سیاست میں آتا ہے اور وفاقی وزیر کا عہدہ حاصل کر لیتا ہے۔اس کے علاوہ ناول کے دو کردار عدنان اور اس کی مینگیتر مدیحہ ہیں جو صحافی ہیں اور اس گھمبیر معاملے کی چھان بین کرتے ہیں اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں' ناول کے اختتام میں سب برے کردار اپنے انجام کو پہنچتے ہیں اور اس کا کریڈٹ پولیس افسر فواد کو جاتا ہے جو اپنے محکمے کی چند کالی بھیڑوں کے اس گھناؤنے کھیل میں شمولیت کے باوجود آخر تک مجرموں کے خلاف تفتیش میں لگا رہتا ہے اور بالآخر انہیں انجام تک پہنچاتا ہے۔عورتوں کے استحصال کے ساتھ ساتھ ناول میں ملک میں صحافت کو درپیش چیلنجز اور پس پردہ کام کرنے والی قوتوں کا تذکرہ بھی مختصراً کیا گیا ہے۔آج جس طرح ملک بھر میں کمسن بچیوں کو جنسی زیادتی کے بعد قتل کرنے کے واقعات رونما ہو رہے ہیں اس تناظر میں ناول آدم زادیاں اس اہم مسئلے کو پیش کرتا ہے اور اس کی افادیت کے لئے ایک یہی بات کافی ہے۔

راکھی چوہدری

راکھی چوہدری نئی لکھنے والی ہے،جس کا ایک پاپولر ناول حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے،جس کا تذکرہ آگے کیا جاتا ہے۔

خواہش

خواہش راکھی چوہدری کا واحد ناول ہے جو بڑے سائز کے ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کا موضوع

محبت ہے۔ یہ ایک روایتی موضوع پر روایتی انداز میں لکھی گئی کہانی ہے جس طرح عموماً کمرشل ناول لکھے جاتے ہیں۔ اس کا لوکیل البتہ کوئٹہ کا ہے اور مرکزی کرداروں کا تعلق بھی کوئٹہ سے بتایا گیا ہے۔ اس لئے کہیں کہیں مقامی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار خواہش نامی لڑکی ہے ناول کی ساری کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے شاید اسی لئے ناول کا نام بھی یہی رکھا گیا ہے۔ خواہش ہوش سنبھالتی ہے تو اسے اپنے والدین کی بجائے ان کے دوست ذیشان اور اس کی بیوی سے ماں باپ کی محبت ملتی ہے۔ وہ ابتدا میں ایک لڑکی اپاہج ہوتی ہے۔ ذیشان کا بیٹا انس جو ڈاکٹر ہوتا ہے اس کا علاج کرتا ہے اور بالآخر اسے یوں ٹھیک کر دیتا ہے کہ وہ عام انسانوں کی مانند چلنے پھرنے لگتی ہے۔ خواہش زیادہ وقت رہتی بھی انس کے گھر ہے تو انس کو اس سے محبت ہو جاتی ہے مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر پاتا ہے۔ **خواہش** کے جوان ہونے پر برطانیہ سے آنے والا فخر نامی نوجوان اس سے اظہار محبت کرتا ہے مگر اس کے انداز میں سختی اور برہمی کا عنصر ہونے پر خواہش اس سے محبت نہیں کر پاتی حالانکہ اس کی منگنی بھی فخر سے کر دی جاتی ہے۔ اس اثناء میں خواہش کو پتہ چل جاتا ہے کہ مہران اور ممتاز اس کے اصل والدین نہیں۔ وہ اس بارے میں کھوج کرتی ہے تب پتہ چلتا ہے کہ درحقیقت وہ مہران کی بھانجی اور صابر نامی آدمی کی بیٹی ہے جو بہت مالدار ہوتا ہے۔ اس دوران حالات واقعات کا ایک طویل سلسلہ چلتا ہے۔ یہ ایک سنجیدہ قاری کے لئے تو غیر دلچسپ ہے کہ اس میں کئی جگہ تحریر کی کمزوریاں اجاگر ہوتی ہیں۔ تاہم یہ کمرشل ناول کی ایک ضرورت ہے۔ فخر کے انتہائی اقدامات سے تنگ آ کر خواہش اس سے شادی پر انکار کر دیتی ہے۔ پھر ایک دن انس کی ڈائری اس کے ہاتھ لگتی ہے تو اسے انس کی محبت کا پتہ چلتا ہے تب وہ ہر تعلق کو شبے کی نظر سے دیکھنے لگتی ہے۔ اسے لگتا ہے ہر شخص اپنے مفاد میں دوسرے شخص سے تعلق بناتا ہے اور اس کے لئے قربانی دیتا ہے۔ بہر حال وہ اس وقت دوبارہ انس کی کشش اور محبت اپنے دل میں محسوس کرتی ہے جب وہ اسے زخمی حالت میں دبئی کے ایک ہسپتال میں دیکھتی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کچھ عرصہ دبئی میں دکھائے جاتے ہیں۔ اس وقت دبئی کی اہم شاہراہوں اور عمارتوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جس سے ناول نگار کی اس اہم بین الاقوامی شہر سے آگاہی کا پتہ چلتا ہے۔

ناول کے آخر میں جب انس اور خواہش کی شادی ہو رہی ہوتی ہے اس وقت فخر دوسری مرتبہ خواہش کو زخمی کر دیتا ہے پھر اچانک اس کے دل میں خواہش کو بچانے کی آرزو پیدا ہوتی ہے اور وہ خودکشی کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہے۔ آخر میں یہ پتہ تو نہیں چلتا کہ آیا خواہش اور انس مل پاتے ہیں کہ نہیں البتہ فخر خواہش کی ہدایت پر خودکشی کے تصور سے باز آ جاتا ہے۔ اسے پتہ چلتا ہے کہ محبت کو پانا ہی سب کچھ نہیں ہوتا اس کے بغیر چلنا بھی سیکھنا ہوتا ہے۔

ناول خواہش کی زبان اسی طرح عامیانہ اور معمولی ہے جیسی کہ عموماً کمرشل ناولوں میں ہوتی ہے اس میں ادبی چاشنی بالکل مفقود ہے۔ عبارت میں اکثر جگہ انگریزی الفاظ برتے گئے ہیں جو بعض جگہ سخت ناگوار گزرتے ہیں۔ فخر کی زبانی اردو زبان کے مختلف الفاظ کا تلفظ اسی طرح بگاڑ کر لکھا گیا ہے جیسا کہ کوئی گورا غلط اردو بولتا ہے۔ یہ اس لئے ٹھیک لگتا ہے کہ فخر برطانیہ سے آیا ہوتا ہے اور وہیں پلا بڑھا ہوتا ہے۔ ناول میں جذباتیت وافر پائی جاتی ہے۔ غرض کہ اگرچہ اس کی ضخامت تین سو سے زائد صفحات کی ہے اس میں کہانی پن اور کردار نگاری عمومی کمرشل ناولوں کی سطح کی نہیں ملتی جیسا کہ کوئٹہ ہی کے ہاشم ندیم کے ناول ہیں جو کم از کم پڑھنے میں ایک عام قاری کی دلچسپی کا سامان بہم کرتے ہیں۔

ولایت حسین

ولایت حسین ایک نوجوان ناول نگار کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس کے واحد ناول کا تجزیہ اگے پیش کیا جاتا ہے۔

عشق مجسم

ولایت حسین کا ناول عشقِ مجسم اپنے نام سے کمرشل ناول محسوس ہوتا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے اسے ایک سنجیدہ ناول سمجھا جانا چاہیے۔ ولایت حسین نے واقعہ کربلا کے پس منظر میں یہ ناول لکھا ہے اور عشق مجسم سے اس کی مراد امام عالی مقام حضرت حسینؓ کی ہے۔ اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک حقیقی ناول کی طرح مختلف ابواب میں اس کے کردار، لوکیل اور زمانہ بدلتے رہتے ہیں۔ ناول کی ابتداء مومن (نام توجہ چاہتا ہے) کے کردار سے ہوتی ہے جو عبادت کے لئے اپنے شہر کے قریب واقع ایک پہاڑ پر جاتا ہے اور وہاں اس کی ملاقات ایک روحانی بزرگ سے ہوتی ہے۔ جو اسے مژدہ سناتا ہے کہ وہ اسے اپنے ہمراہ عشق مجسم کے سفر پر لے جائے گا۔ مومن ایک غریب شخص ہے مگر اس کا بھائی ضامن انتہائی مالدار شخص ہوتا ہے جو اسے اپنے ساتھ بزنس میں لانا چاہتا ہے لیکن مومن اس کے رزق کو حرام قرار دے کر اس کی سمت نہیں جاتا۔ مومن غریب ہے مگر صحت مند ہے جبکہ ضامن بہت مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف بیماریوں کا شکار ہے۔ ان باتوں کا پتہ ناول کے اگلے ابواب میں چلتا ہے۔

ناول کے دوسرے باب کا لوکیل کنعان کا شہر ہے جہاں کا بادشاہ ساؤل اور ملکہ سبیع ہے اس باب کے دوسرے کرداروں کے نام یرمیاہ، یدیدیاہ، سبا، ابیسلوم، عفرون، اروناہ، یوآب، ابیاتر اور ادونیاہ جیسے دیگر بالکل اجنبی الفاظ ہیں جانے یہ کس زبان کے الفاظ ہیں یہ ناول نگار کے من گھڑت الفاظ ہیں بہرحال ان الفاظ کے انتخاب میں

ناول نگار کی ایک اجنبی فضا پیدا کرنے کی خواہش جھلکتی ہے اور مصنف اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتا ہے۔اس باب میں پرمیاہ مرکزی کردار ہے اور وہ مختلف حالات سے دوچار ہوتا ہے وہ اپنے لوگوں اور بادشاہ کو مژدہ سناتا ہے کہ وہ مستقبل کے سفر پر روانہ ہونے والا ہے اور پندرہ سو سال بعد عشقِ مجسم کا نظارہ کرے گا' عشقِ مجسم اگرچہ بہت اچھا یا کامیاب ناول نہیں تاہم اسے سنجیدہ ناول لکھنے کی ایک اچھی کاوش قرار دیا جاسکتا ہے۔اس سے اگلے باب میں کہانی رام اور سیتا کے گھر گھومتی ہے اور اس کا محل وقوع گنگا اور جمنا کی دھرتی ہے۔رام اور سیتا کا تاریخی پس منظر بیان ہونے کے بعد یہ دونوں بھی بالآخر مستقبل کے سفر پر نکلتے ہیں اور دریائے سرائیو میں اتر جاتے ہیں۔

اس سے اگلے باب میں کہانی پھر پینترا بدلتی ہے اب امریکہ کے شہر نیویارک کی ایک سرد رات کا بیان ملتا ہے۔ پروفیسر مائیکل ڈیویڈ اپنے کمرے میں مطالعے میں مصروف ہے اور اس کا موضوع بھی عشق ہے وہ عشق کے بارے میں پڑھتے پڑھتے اپنی معمول کی زندگی سے لاتعلق ہو جاتا ہے اس سے اس کی گھریلو زندگی متاثر ہوتی ہے وہ دراصل انسان کے جذبہ عشق کو سمجھنا چاہتا ہے جسے آخر میں مصنف ایک ایرانی امریکن ٹیکسی ڈرائیور کے ذریعے سمجھاتا ہے جو پہلے اسے ایک فارسی شعر

سینہ زنانم زجان بے خبر
عشق حسینی زدہ مارا بہ سر

کے حوالے سے حسینی عشق کے بارے میں بتاتا ہے اور پھر دوسرے دن سی ڈی میں محرم کے ماتم کی ویڈیو دکھاتا ہے اور اس کی حیرانی پر اسے بتاتا ہے کہ یہ لوگ حضرت حسینؓ کے عشق میں سرشار ہیں اور اپنے محبوب کی تکلیف محسوس کرنے کے لئے زنجیر زنی کررہے ہیں۔اسی طرح امریکی پروفیسر ''عشق حسینؓ '' سے آگاہ ہوتا ہے۔اس طرح اس ناول کا مطمع نظر اہل تشیع کے مسلک کا فروغ ہے۔

عشقِ مجسم کے بالکل آخری باب میں زندگی اور موت کا تذکرہ مکالمے کے روپ میں ملتا ہے موت کیا ہے اور کیوں آتی ہے طرح کے سوالوں کو ٹھوس حقائق کی شکل میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔کیا کبھی موت کا وجود ختم ہوسکتا ہے۔اس نوعیت کے بنیادی سوال اٹھانے سے بطور ناول یہ ایک اچھی کاوش محسوس ہوتا ہے۔ناول میں کئی جگہ کچھ مافوق الفطرت عناصر ملتے ہیں جو نہ صرف مرکزی کرداروں بلکہ ناول کے مصنف کی ضعیف الاعتقادی کی نشاندہی کرتے ہوئے ناول کی کمزوری کو اجاگر کرتے ہیں۔

فارس مغل

فارس مغل کوئٹہ سے تعلق رکھنے والا نو جوان شاعر اور ناول نگار ہے، ہم جان اس کا پہلا ناول ہے۔

ہم جان

ہم جان یعنی Solemate فارس مغل کا ناول ہے۔ اس کا موضوع محبت ہے مگر اس کی بنیادی تھیم یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں معذور افراد سے صرف ہمدردی کی جاتی ہے۔ محبت نہیں کی جاتی۔ معذور افراد بھی کسی ایک عضو کے متاثر ہونے کے باوجود انسان ہی ہوتے ہیں۔ وہ بھی دل رکھتے ہیں اور اپنے دل میں چاہے جانے کی یا کسی کو چاہنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر معاشرہ عمومی طور پر ان سے ایسا سلوک روا رکھتا ہے گویا وہ جیتے جاگتے انسان نہ ہوں بلکہ جذبات و احساسات سے یکسر محروم ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور یہی حال اس ناول میں خوبی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ اس طرح ناول کا موضوع محبت ہونے کے باوجود اس میں ایک خاص انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اس میں ویرا اور نرمین نامی دو نوجوان لڑکیاں معذور ہوتی ہیں۔ دونوں چاہے جانے کی شدید خواہش رکھتی ہیں مگر انھیں دھتکار دیا جاتا ہے۔ ویرا کی زندگی میں کچھ دیر کے لیے ماجد نامی نوجوان آتا ہے مگر وہ اس سے محبت کی بجائے جسمانی وصال کی خواہش رکھتا ہے جبکہ نرمین کو اپنے ہی گھر میں قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں غفران نامی نوجوان آتا ہے جو اس سے حقیقی محبت کرتا ہے کہ اس کے چہرے میں اسے مونا لیزا کی اداس مسکراہٹ نظر آتی ہے مگر تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ نرمین اپنے دل میں موت کی خواہش پال چکی ہوتی ہے۔ وہ جلد ہی وفات پا جاتی ہے۔ غفران اس سانحے سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہ خود معذور ہو جاتا ہے۔ اس کا نچلا دھڑ سن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر قدرت اللہ اس کا کامیاب نفسیاتی علاج کرنے کے بعد اسے واپس معمولی کی زندگی کی طرف لاتا ہے۔ اس ناول میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہر شخص کا ایک ہم جان یعنی soulmate ہوتا ہے یا ہر شخص کسی دوسرے کا ہم جان ہوتا ہے۔ اگر کسی کو اس کا ہم جان نہ مل سکے تو وہ بہر حال اس شخص سے ضرور ملتا ہے جس کا ہم جان یہ شخص ہوتا ہے۔ یہ ذرا الجھا دینے والی بات ہے۔ ناول میں ویرا کا ہم جان ارمان نامی نوجوان ہے جو اس کے سامنے ایک حادثے میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کی روح ویرا سے خواب میں طویل مکالمہ کرتی ہے جبکہ ناول کے آخر میں ویرا غفران سے ملتی ہے کہ وہ اس کی ہم جان ہوتی ہے۔ غفران اُسے نرمین کا دوسرا روپ سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ ناول ہم جان میں غفران کے دوست عفی کا مختصر کردار ہے جو صرف ایک جھلک دکھاتا ہے مگر وہ غفران سے محبت کے موضوع پر اہم باتیں ناولائی

اسلوب میں کرتا ہے۔عفی محبت کوفضول کی بکواس قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

> تم مڈل کلاسیے نہ مشرقی ہو نہ مغربی ہو بلکہ بیچ میں لٹکی ہوئی کوئی چمگادڑ نما چیز ہو۔جبکہ ہمارے ایلیٹ طبقے کی نسل کا طرز زندگی مکمل طور پر مغربی ہے۔وہ جسمانی بھوک کو محبت کے ڈھونگ سے مشروط نہیں کرتے۔ وہ تو جہاں بھوک لگی منٹوں میں فاسٹ فوڈ کی طرح یہ کھایا وہ گیا۔[۵۳]

اس میں نہ صرف ہمارے نوجوان طبقے کی عامیانہ محبت پر گہرا طنز ملتا ہے بلکہ اس میں طبقاتی شعور بھی نظر آتا ہے۔عفی کے نزدیک ایلیٹ طبقے کی درس گاہیں ہاورڈ، آکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ ہیں جہاں سے وہ عوام کو غلام رکھنے کا ہنر سیکھ کر آتے ہیں اور اس میں کامیاب رہتے ہیں۔ یہاں عفی کے روپ میں مصنف ایک خاص سطح کے سیاسی شعور کا اظہار کرتا ہے۔معذور افراد کے جذبہ محبت کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم پہلو جس کی بدولت یہ ناول فلسفیانہ رجحان سامنے لاتا ہے وہ اس میں زیر بحث آیا وقت کا مسئلہ ہے۔ وقت ایسا مسئلہ ہے جو ہر بڑے ناول میں ملتا ہے۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں خصوصاً وقت پر فلسفیانہ بحث ملتی ہے ان کے ناول آگ کا دریا میں تو وقت خود ایک زندہ کردار کے روپ میں نظر آتا ہے۔قرۃ العین حیدر اپنے اولین ناول میرے بھی صنم خانے میں وقت کے بارے میں لکھتی ہیں۔''وقت کی بات۔۔۔ یہ وقت کی بات۔۔۔جو لمحے گزر جاتے ہیں وہ واپس نہیں آپاتے۔ وہ اپنے گزر جانے کا شدید تکلیف دہ احساس چھوڑ جاتے ہیں۔''[۵۴]

اسی طرح وہ سفینہ ء غمِ دل میں اپنی رائے یوں ظاہر کرتی ہیں۔''لیکن وقت زندہ ہے ہمیں ختم کر دیا ہے۔''[۵۵]

فارس مغل کے ناول ہم جان میں بھی وقت کے بارے میں اس طرح کے تخلیقی جملے ملتے ہیں مثلاً:''وقت ایک آسیب ہے عفریت کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔۔۔۔وقت ایک کھلا دھوکہ ہے۔۔۔وقت ایک بہلا وا ہے۔''[۵۶]

وقت کے دائمی تسلسل کے بارے میں جب ارمان ویرا سے یہ کہتا ہے کہ:

> یہ شام کا وقت کل پھر آئے گا۔شام کے بعد رات اور صبح کے بعد دوبارہ شام۔ایسی خزاں

اگلے برس پھر آ ئے گی۔خزاں کے بعد سرما اور گرما کے بعد دوبارہ خزاں۔ یہ طے شدہ عمل ہے۔لیکن ہم نے بدل جانا ہے۔بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہونا ہے۔واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ [۵۷]

محولہ بالا اقتباس میں وقت کے بارے پائے جانے والے خیالات پر قرۃ العین حیدر کے تصور وقت کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ جو اوپر دیئے گئے ان کے صرف ایک جملے ''لیکن وقت زندہ ہے۔ہمیں ختم کر دیا ہے''۔ سے بخوبی ظاہر ہے۔ یوں لگتا ہے فارس مغل نے قرۃ العین حیدر کے فلسفۂ وقت کو شعوری طور پر زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہو۔

ناول ہم جان میں بلوچستان یونیورسٹی ہنہ اوڑک اور کوئٹہ شہر کے مختلف علاقوں کا تفصیلی منظر نامہ ملتا ہے۔ایک نوجوان لکھاری ہونے کے باوجود مصنف نے ان تمام مناظر کی منظر کشی خوبصورتی اور ایسی فنی چابکدستی سے کی ہے کہ پڑھنے والے کو ذہن کے پردے پر فلم چلتی محسوس ہوتی ہے۔ہم جان میں پائے جانے والے محبت کے بارے روایتی تصورات طبقاتی تفریق، سیاسی کشمکش اور وقت کے بارے فلسفیانہ مباحث اس ناول کی مختلف جہات کو نمایاں کرتے ہیں۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ اس کا مصنف ایک نوجوان قلم کار ہے تو اس ناول کی بدولت بلوچستان میں لکھے جانے والے اردو ناول کے فکری دائرے میں ایک خاص طرح کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔البتہ اس ناول کا آخری سے پہلا باب جو کہ ''بلوری محل کی دیوی'' کے عنوان سے ہے اضافی اور ناول پر ایک بوجھ معلوم ہوتا ہے۔اس کی شمولیت ناول کی معنویت میں کوئی اضافہ نہیں کرتی۔اس کے بغیر بھی ناول اپنی جگہ مکمل ہے۔

شیر دل غیب

شیر دل غیب ایک نوجوان قلمکار ہے،اس کے اب تک دو مختصر ناولٹ شائع ہوئے ہیں۔ان کی تفصیل آگے دی جاتی ہے۔

تیرے فراق میں

یہ شیر دل غیب کا ناولٹ ہے۔ جسے مختصر ناول کہنا چاہیے شیر دل غیب بلوچستان کا ایک نوجوان لکھاری ہے جو خطہ مکران سے تعلق رکھتا ہے۔نوجوان ہونے کے باوجود اس کی تحریر میں پختگی دکھائی دیتی ہے۔ تیرے فراق میں

یونیورسٹی میں زیرِتعلیم نوجوان کی محبت پرمبنی سرگزشت ہے۔ یہ کہانی ہے ایک ایسے نوجوان کی جو جامعہ بلوچستان میں حصول تعلیم کے لیے آتا ہے مگر اُسے یہاں ایک لڑکی سے شدید محبت ہوجاتی ہے۔ وہ اس کی محبت میں کھوکر ہر شے بھول جاتا ہے۔ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ وہ کوئٹہ پڑھنے کی غرض سے آیا ہے اور اس کے غریب ماں باپ دور گاؤں میں منتظر ہیں کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد نوکری کرے گا اور ان کی غربت ختم ہوجائے گی۔ تیرے فراق میں کو ایک طرح سے یادداشت کہا جاسکتا ہے کہ اس میں اس لڑکی جس کا فرضی یا پیار سے نام امبل ہے کو جابجا مخاطب کیا گیا ہے۔ اسے آپ کی بیتی یا مکالمہ بھی کہا جاسکتا ہے جو صیغہ واحد متکلم میں اپنی محبوبہ سے کیا گیا ہے۔ اس کا انداز بیانیہ روپ لیے ہوئے ہے مگر ان سب مکالموں کو الگ الگ اقتباسات کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ ایک دو صفحے پر مشتمل یہ کل ۱۳۵ اقتباسات ہیں۔ اسی میں ساری کہانی بیان کی گئی ہے۔ ناول کا ہیرو صیغہ واحد متکلم میں نہ صرف اپنی داستان محبت سناتا ہے۔ تعلیم سے عدم دلچسپی کا حال لکھتا ہے اور شراب نوشی کی تفصیل دیتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ جب بلوچستان کے مخصوص سیاسی حالات میں اس کے کلاس فیلو اور دوست گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے لاپتہ ہور ہے تھے اور ان کی مسخ شدہ لاشیں مل رہی تھیں وہ ہر طرح کی سیاست سے دوران سیاسی وسماجی حالات سے بے پرواصرف محبت میں کھویا رہا۔ امبل یعنی اس کی محبوبہ کی وجہ سے سیاست اس کے لیے شجر ممنوعہ قرار پائی۔ کہانی کے آخر میں جب اس کی محبوبہ اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے شخص سے منسوب ہوجاتی ہے تو اُسے ان سب حالات کا افسوس ہوتا ہے۔ اسے اپنے دوستوں کی دائمی جدائی اور ریاستی جبر کا احساس ہوتا ہے۔ جس کے خلاف وہ آوازیں اٹھاپاتا اور آخر میں اکیلا رہ جاتا ہے یہاں تک وہ خود کو بہت کمزور محسوس کرتا ہے۔ اگر یہ مدِنظر رکھا جائے کہ اس کہانی کو لکھنے والا بلوچستان کا ایک نوجوان ہے تو اس کے اسلوب اور تحریر کی پختگی پر حیرت ہوتی ہے۔ شیر دل غیب کی تحریر سادہ، رواں اور چست ہے وہ اس میں کئی جگہ اردو شعروں کو نثری انداز میں لکھتا ہے۔ بعض جگہ مکمل شعر یا مصرعہ شاعر کے نام کے حوالے سے لکھتا ہے۔ حال اور ماضی کے نامور شعرا کا تذکرہ کرتا ہے۔ کہانی کا اختتام ایک جرمن شاعر کی نظم کے ترجمے پر کرتا ہے جس سے اس کے وسیع مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ ان سب خصوصیات نے اس کی تحریر کو قابل مطالعہ ہی نہیں پرتاثیر بنادیا ہے۔ اس ناول میں بلوچستان کا مقامی اردو لہجہ یا لفظیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مگر اس کے باوجود کہانی کے بیان اور اسلوب میں کوئٹہ اور بلوچستان کا لوکیل نمایاں ہے۔

آخری خط

شیر دل کے ناولٹ آخری خط کو اس کے پہلے ناولٹ تیرے فراق میں کا اگلہ حصہ قرار دیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔اس میں بھی ایسی کہانی بیان کی گئی۔اسی طرح وہ اپنی محبوبہ سمبل کے نام خط یا ڈائری کے طرز پر اپنی کہانی بیان کرتا ہے جس پر حقیقی داستان کا گمان ہوتا ہے۔واضح رہے ہمبل کا املا تیرے فراق میں ''امبل'' کی صورت میں ملتا ہے۔آخری خط میں صیغہ واحد متکلم کے اپنی محبوبہ کے نام لکھے گئے ان خطوط یا رقعات میں اپنی ناکام محبت کی داستان کے ساتھ ساتھ ناول کے ہیرو پر جوگزرتی ہے اس کا احوال بھی ملتا ہے۔وہ بچپن کی یادیں یوں سکول کی سطح پر نامناسب تعلیم حاصل کرتا ہو' محبوبہ کے ساتھ گزراوقت ہو' اپنے دوست منصور کے ساتھ مکران کے مختلف علاقوں کی سیر پر جانا ہو یا اس کی خودکشی کا المناک واقعہ ہو اور پھر بلوچستان میں جاری مسلح شورش اور اسکے نتیجے میں سیاسی وسماجی صورتحال میں ابتری کا درآنا ہو' جگہ جگہ چیک پوسٹیں قائم ہونا' روایتی لباس میں ملبوس ہر بلوچ نوجوان کو شک کی نظر سے دیکھنا ہو' تمام تر صورتحال بلوچستان کے روزمرہ حالات واقعات کو بلا کروکاست کہانی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے:۔''کبھی بلوچی چوٹ پہننے پر میری تذلیل کرتے ہیں تو کبھی بلوچی چادر اور شلوار کی بے حرمتی' جو میری تہذیب کا حصہ ہیں۔''۵۸

آج کے بلوچستان میں رہنے والے ایک عام بلوچ نوجوان کو جن مشکلات کا سامنا ہے یا اس کے دل ودماغ میں جس طرح کے باغیانہ جذبات واحساسات پائے جاتے ہیں یہ سب ناول میں بین السطور بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔شیر دل غیب اپنے پختہ اور رواں اسلوب سے قاری کو متاثر کرتا ہے وہ اپنی تحریر میں کئی جگہ بعض بلوچی زبان کے مختلف الفاظ بھی استعمال کرتا ہے اس کی تحریر بھی بلوچستان کے مختلف شہریوں اور علاقوں کا منظرنامہ سانس لیتا نظر آتا ہے۔وہ مختصر جملوں میں ماحول اور جغرافیے کی منظرکشی بھی خوبی سے کرتا ہے۔

عابدہ رحمان

عابدہ رحمان حالیہ برسوں میں بہ طور لکھاری سامنے آئی ہے۔وہ مضامین بھی لکھتی ہے اور اس کا ایک ناول طبع ہو چکا ہے۔

صرف ایک پُل

عابدہ رحمان کا ناول ہے۔اس کا موضوع اگر چہ عامیانہ نوعیت کا ہے یعنی رومانوی محبت اور بے وفائی مگر اس ناول کی خاص بات اس کا لوکیل یعنی بلوچستان کا دارالخلافہ کوئٹہ ہے۔ناول کے مرکزی کرداروں کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔نعمان نامی نوجوان یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران اسماء نامی لڑکی سے محبت کرتا ہے وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ دونوں اگر چہ پنجابی ہوتے ہیں مگر اسما آرائیں قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔اس کا خاندان کسی صورت برادری سے باہر شادی نہیں کرتا لہٰذا وہ نعمان کو صاف انکار کر دیتی ہے۔عبیر ان کی ہم جماعت پٹھان لڑکی ہے وہ نعمان کو چاہتی ہے مگر جب اُسے نعمان کی اسماء سے محبت کا پتہ چلتا ہے تو وہ اسماء کو راضی کرنے کی کافی کوشش کرتی ہے مگر اسماء اسے بھی صاف انکار کر دیتی ہے کہ یہ ممکن نہیں۔نعمان اور عبیر کا رابطہ فون پر رہتا ہے تو ایک دن وہ باتوں باتوں میں اس سے اپنی محبت کا اقرار کر لیتی ہے۔تب ان دونوں کے درمیان رومان پروان چڑھتا ہے۔ وہ چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ان باہمی ملاقاتوں اور موبائل پر وہ ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں جو بوسوں کی حد تک رہتا ہے۔نعمان اور عبیر بھی شادی کرنا چاہتے ہیں مگر نعمان کے مطابق اس کی ماں پٹھان لڑکی سے اس کی شادی پر تیار نہیں۔ وہ اپنی ماں کو منانے کی بات کرتا ہے مگر اس کی دلچسپی عبیر میں رفتہ رفتہ کم ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف عبیر اُسے بے طرح پیار کرتی ہے۔نعمان آخر کار کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔جبکہ عبیر کو خواب میں ایک شخص سیاہ پیراہن میں بار بار ملتا ہے جو اصل میں کراچی کے معروف پیر غازی شاہ ہوتے ہیں۔وہ عبیر کا ہاتھ تھام کر اسے عام انسانوں کے ساتھ جینے کا درس دیتے ہیں۔عبیر جو مختلف این جی اوز میں کام کرتی ہے۔سیلاب سے متاثر علاقوں میں پہنچتی ہے اور اسے عام لوگوں کے ساتھ گھل مل کر ان کے مسائل اور دکھ بانٹ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔اس طرح محبت میں ناکامی کے بعد عبیر عام لوگوں سے اپنا تعلق استوار کر کے گویا روحانی خوشی اور مسرت پا لیتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ محبت میں ناکام نہ ہوتی تو کیا وہ عام لوگوں سے رابطہ نہ رکھتی۔ان کی مشکلات میں ان کے کام نہ آتی۔ پیر غازی شاہ کی عبیر کے خوابوں میں مسلسل آمد دراصل تصوف کی طرف اشارہ ہے مگر یہ تو عبیر کے کردار میں شروع میں بھی نظر آتا ہے۔جب وہ ممتاز مفتی کے ناول الکھ نگری کے مطالعے کا ذکر کرتی ہے۔پھر بعد میں نعمان کی بے وفائی جان کر وہ بانو قدسیہ سے ملنے کی تمنائی ہوتی ہے تاکہ ان سے کچھ پوچھ سکے کہ انھوں نے جو اپنے ناول راجہ گدھ میں انسان کے گناہ کی بابت لکھا ہے کہ ادھر وہ Mutution کے ذریعے مزید تباہی لاتا ہے تو کیا بے وفائی اور دھوکہ بھی Mutation کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ان دونوں ناولوں کے باعث نہ صرف ناول کی

ہیروئن عبیر بلکہ ناول کی مصنفہ کے تصوف کی طرف رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

عابدہ رحمان سادہ اور رواں اردو لکھنے پر قادر ہے۔ وہ اردو میں مستعمل مقامی الفاظ کا استعمال بالکل نہیں کرتی مگر بعض جگہ ایک آدھ جملہ پشتو کا ملتا ہے۔ ناول صرف ایک پُل کو ادبی ناول کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہلکا پھلکا رومانوی ناول ہے جو کمرشل ادب کے دائرے میں آتا ہے۔

خیام ثناء

خیام ثناء نوجوان شاعر اور ادیب ہے۔ اس کا ایک ناولٹ شائع ہوا ہے۔

ڈھائی دن محبت کے

یہ نوجوان لکھاری خیام ثناء کی مختصر کہانی ہے، جسے مصنف نے ناولٹ کے طور پر شائع کیا ہے۔ اب ناولٹ کا رجحان معدوم ہو چکا ہے اور اس کی بجائے مختصر ناول لکھے جاتے ہیں بلکہ انھیں مختصر بھی نہیں صرف ناول کہا جاتا ہے۔ ناول کے لئے مگر بنیادی شرط ایک بیانیے اور اسلوب کی ہے، ناول کے یہ دونوں بنیادی اوصاف ڈھائی دن محبت کے میں نہیں ملتے۔ کتاب کا عنوان خوب ہے اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں موجود کہانی (اگر اسے کہانی کہا جا سکتا ہے تو) محبت کے موضوع پر ہے۔ اس میں ناول کا پلاٹ اور کردار نگاری بالکل مفقود ہے یوں لگتا ہے جیسے مصنف نے ذاتی تجربے یا کسی دوست کی حقیقی داستان محبت کو کہانی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کا اسلوب کافی کمزور ہے کئی جگہ غلط زبان لکھتا نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک کچی پکی کہانی کو لکھ کر اس پر مزید محنت کئے بغیر شائع کر دیا گیا ہو۔ محبت کی جو کہانی ' کہانی کے ہیرو سلطان اور اس کے واحد نسوانی کردار شمائلہ حسن خان کے گرد گھومتی ہے وہ ابتداء میں مثبت تعلق کے بعد اس طرح ختم ہو جاتی ہے کہ شمائلہ سلطان کے دفتر آنا چھوڑ دیتی ہے اور سلطان موبائل مسیجز کے جواب میں اسے ڈانٹتی اور مسیج نہ کرنے کا کہتی ہے۔ پھر سلطان اخبار میں خبر پڑھتا ہے کہ کوئٹہ کے دھماکے میں جو لوگ مرے ہیں ان میں زرخاتون اور نائیلہ بی بی بھی ہوتی ہے اور وہ اس خبر سے غم زدہ ہو جاتا ہے اب شمائلہ خان سے زرخاتون یا نائلہ بی بی کا کیا تعلق ہے کچھ پتہ نہیں چلتا یوں لگتا ہے جیسے مصنف نے آخر میں شمائلہ کا نام لکھنے میں غلطی کی ہو اور وہ اس کا نام نائیلہ بی بی لکھ گیا ہو۔ اسی طرح اس تحریر میں کئی جگہ مذکر مؤنث کے مسائل اور پروف کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں غرض کہ یہ ایک کمزور پلاٹ پر لکھی گئی ناپختہ کہانی ہے جسے ناول کہنا مناسب نہیں۔

محمد اسلم آزاد

اسلم آزاد کا ایک ناول سامنے آیا ہے۔اس کا تجزیہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔

Silent Love

کہنے کو تو یہ محمد اسلم آزاد کا ناول ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اسے کسی طور پر ناول نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں ناول کے فنی لوازمات کو سرے سے بروے کار ہی نہیں لایا گیا۔اس میں ایک کچی پکی کہانی البتہ ضرور ملتی ہے۔ جو مختلف کرداروں کے درمیان موبائل فون پر SMS کے ذریعے چلتی نظر آتی ہے۔مگر جس طرح دو مرکزی کردار نازیہ اور نعیم اور ان کے دیگر دوست اس کہانی کا حصہ بنتے ہیں وہ بالکل غیر فطری اور فرضی محسوس ہوتے ہیں۔ پھر یہ کردار عورت اور مرد ہونے کے باوجود تعلق بنانے کے بعد جن پاکیزہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی اپنی کہانی سناتے ہیں وہ بھی سر بہ سر جھوٹ لگتا ہے۔غرض نہایت بھونڈے انداز میں فون پر بنے تعلق کو کہانی کا روپ دیا گیا ہے۔نعیم کو ایک شاعر بتایا گیا ہے جو آزاد نظمیں لکھتا ہے اور نازیہ کو SMS کرتا ہے۔ نازیہ بھی اسے جواب میں آزاد نظمیں SMS کرتی ہے مگر یہ آزاد نہیں بلکہ نثری نظمیں ہیں جو لفظیات اور خیال کی سطح پر بالکل سطحی اور عامیانہ ہیں۔Silent Love جیسے غیر دلچسپ تحریر کو ناول قرار دینا سراسر زیادتی ہے۔مصنف کو ناول کے فن سے ذرا آگاہی بھی ہوتی تو وہ اپنی کتاب کو ناول کے طور پر پیش نہ کرتا۔

انگریزی ناول کے اردو تراجم

اس مقالے کی تسوید کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ بلوچستان میں کچھ انگریزی ناولوں کے اردو تراجم بھی ہوئے ہیں، چونکہ یہ مقالہ بلوچستان میں اردو کی تخلیقی نثر سے بحث کرتا ہے،اوران تراجم میں بھی مترجم کا تخلیقی رویہ سامنے آتا ہے؛ لہٰذا ان تراجم کا مختصر حال رقم کرنا مناسب ہوگا۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ انگریزی کے دو اہم ناولوں کے ان تراجم کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔مترجم اور تراجم کا حال ذیل میں دیا جاتا ہے۔

اولین خاتون مترجم؛شفیق بانو منہاج

دستیاب شواہد کے مطابق بلوچستان میں کسی غیر زبان سے اردو میں تخلیقی ادب کے ترجمے کے حوالے سے شفیق بانو منہاج نہ صرف پہلی مترجم بلکہ پہلی خاتون مترجم بھی ہیں۔ان کے ذاتی کوائف نہیں مل سکے ہیں،مگر اتنا پتہ

چلا ہے کہ وہ ایک مقامی سکول میں انگریزی کا مضمون پڑھاتی رہی ہیں۔کیا وہ کوئٹہ میں پیدا ہوئیں یا کسی دوسرے صوبے سے آ کر یہاں قیام کیا،اس بارے تحقیق جاری ہے؛ٹھوس شواہد سامنے آنے پر ان کے ذاتی حالات کا تذکرہ کیا جائے گا۔شفیق بانو منہاج نے انگریزی سے اردو میں دو ناول ترجمہ کیے،جو بالترتیب ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۲ء میں قلات پبلشرز،کوئٹہ سے شائع ہوئے۔ان کا حال آگے دیا جاتا ہے۔

سیلاب

یہ شفیق بانو منہاج کا پہلا ترجمہ شدہ ناول ہے،ناول کے عنوان کے نیچے اسے ''جارج الیٹ کی ناول سے ماخوذ'' بتایا گیا ہے،مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ ان کے کس ناول سے ماخوذ ہے۔جارج الیٹ (۱۸۱۹ء۔۱۸۸۰ء) کا قلمی نام اختیار کرنے والی اس برطانوی خاتون ناول نگار کا اصل نام میری اینی ایونز تھا۔وہ شاعرہ،ناول نگار،صحافی اور مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ وکٹورین عہد کی ایک سرکردہ ادیبہ تھیں۔انھوں نے سات ناول لکھے،انھیں نفسیاتی گہرائی کی حامل اور حقیقت نگار ناول نگار کہا جاتا ہے۔۵۹

سیلاب دراصل جارج الیٹ کے ناول دی مِل آن دی فلاس کا اردو ترجمہ ہے۔شفیق بانو منہاج پیش لفظ میں ترجمے کے لیے جارج الیٹ کے ناول کی وجہ انتخاب بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

ہمارے ناقدین کہتے ہیں کہ اردو ادب میں معیاری ناول کم یاب ہیں،اسی لیے جی چاہا کہ انگریزی کے مثالی ناولوں کا عکس کچھ اس طرح پیش کیا جائے کہ صرف اردو سمجھنے والے قارئین بھی ان کی خصوصیات سے متعارف ہو جائیں۔اس سلسلے میں جارج الیٹ کے اس ناول پر نظر پڑی۔۶۰

اپنے اس ترجمے کو شفیق بانو منہاج نے اگرچہ ماخوذ کہا ہے مگر یہ ماخوذ نہیں ہے،بلکہ یہ اس کا تخلیقی ترجمہ ہے۔مترجم نے مصنفہ کے اسلوب اور انفرادی رنگ کو ترجمے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی اور وہ اس مین بڑی حد تک کامیاب رہی ہیں۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

آپ اسے میری قدامت پرستی سمجھیں یا ادبیات عالیہ سے لگاؤ کہ اس کاوش میں مصنفہ کی انفرادیت کا رنگ پوری آب و تاب سے منعکس کرنے کا تہیہ کیا ہے۔۔۔کوشش کی گئی ہے کہ مصنفہ کے اسلوب بیان تک کی نمائیندگی ہو جائے،حتیٰ کہ تشبیہہ و استعارات کی ندرت و لطافت سے بھی محرومی نہ رہے اور مصنفہ کے بیان کیے ہوئے واقعات

حادثات وجذبات کے تمام نقشے قارئین کے ذہن پر مرتسم ہو جائیں۔۶۱

جارج الیٹ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بچوں اور عورتوں کے کردار اور مکالمے نہایت فنکاری سے پیش کرتی ہیں۔اس دور کے یورپ کے ماحول اور لوگوں بالخصوص انگریز خواتین کے انداز فکر وعمل میں ایک طرح کا مشرقی رنگ جھلکتا ہے۔مترجم نے اس ناول میں پیش کردہ ماحول اور کرداروں کو اردو میں خوبی سے ڈھالا ہے۔ایسا کرتے ہوئے انھوں نے ان کرداروں کے نام تک مقامی رکھ دیے مثلاً ناول میں بہن بھائی کے دو مرکزی کردار ٹام اور میگی اس ترجمے میں فائز اور صائمہ ہیں، اسی طرح ان کے والدین کے نام مسٹر اینڈ مسز ٹر لیور کو سالمی اور بیگم سالمی کے ناموں میں پیش کیا گیا ہے۔ناول میں دونوں بہن بھائی کی کشمکش دکھانے کے بعد ان کی موت سیلاب کے باعث ہوتی ہے اس لیے شاید اس کا اردو عنوان سیـلاب رکھا گیا ہے۔اس ترجمے کی قرات میں شفیق بانو منہاج کی لگن اور محنت صاف نظر آتی ہے، کہ یہ بہت رواں اور دلچسپ ہے۔اس میں کئی جگہ انگریزی اسلوب کے خوبصورت جملے ملتے ہیں۔مثال کے طور پر ناول کی ابتداء میں ہی ایک منظر کی پیشکش کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

فروری کا مہینہ تھا اور سہ پہر کا وقت، آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا اور بادل گرج رہے تھے۔درخت ویران و اداس تھے۔ چراگاہیں سرسبز وشاداب اور دریا پانی سے لبریز تھا۔کارخانے کی مشینوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں اور مزدور اپنی روزی کمانے کی۔۔۔[یہاں ایک دو لفظ نہیں پڑھے جا رہے] وجفاکشی کا ثبوت دے رہے تھے۔ان کے کھردرے ہاتھ، بھاری بھرکم بازوسعیٔ مسلسل میں لگے ہوئے تھے۔سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہوتا تھا کہ سانس پھول رہی ہے۔دریا کے کنارے کھڑی ایک چھوٹی سی لڑکی دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اس کے قریب ہی نرم وملائم بالوں والا سفید کتا کھڑا تھا۔۶۲

محولہ بالا اقتباس سے شفیق بانو کے ترجمے کا اسلوب اور اس کی خوبصورتی صاف نظر آتی ہے۔درحقیقت ایک زبان کے ادب کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ شفیق بانو ایک اہم انگریزی ناول کا ترجمہ پورے ادبی حسن کے ساتھ کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

ویرانہ ء دل

یہ ترجمہ بھی شفیق بانو منہاج کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔یہ دراصل ٹامس ہارڈی (۱۸۴۰ء۔۱۹۲۸ء) کے ناول ٹیـــس آف دی ڈوبـر ولـرز کا اردو ترجمہ ہے۔اس ناول میں ایک غریب لڑکی ٹیس کا مختلف مشکل حالات و

واقعات سے گزرنا دکھایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی آبرو بھی کھو دیتی ہے۔ اس اردو ترجمے میں ٹیس کا نام ''نائلہ'' رکھا گیا ہے، اسی طرح باقی کرداروں کے نام بھی اردو میں ملتے ہیں۔ اصل ناول میں دیہی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے مناظر قدرت کی جزئیات اور انسانی فطرت کی گہرائیوں کو خوبی سے بیان کیا گیا ہے، ٹیس جس صورتحال سے دوچار ہے، اس سے انسانی زندگی کی المنا کی اور ستم ظریفی کا احساس ہوتا ہے۔ مترجم نے ترجمے کے لیے وکٹورین عہد کے جن دو ناولوں کا انتخاب کیا ہے، اور جس خوبی سے انھیں اردو کا ملبوس پہنایا ہے، اسے بیان کرتے ہوئے خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

شفیق بانو منہاج کے پختہ ادبی ذوق کا انداز، ان کے انتخاب ہی سے ہوسکتا ہے۔ انھوں نے انگریزی کلچر، طرز معاشرت اور طرزِ احساس وفکر کو اچھی طرح سمجھا اور ناول نگار کے فنی تجربے کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ انگریزی اور اردو پر قدرت تامہ کی بدولت ناول نگار کے فنی تجربات کے پیکروں کو اپنی زبان میں ایسے پیکر عطا کیے ہیں کہ ترجمے مین تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے۔٦٣

مجموعی جائزہ

بلوچستان کے بعض مصنفین نے آزادی سے قبل یہاں اردو فکشن کے ابتدائی آثار کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں ادبی نثر، افسانے اور ناول کی صورت میں قیام پاکستان کے بعد ہی لکھی گئی ہے۔ اس تحقیقی مطالعے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ قیام پاکستان سے قبل بلوچستان کے کسی ادیب نے کوئی ناول نہیں لکھا۔ اس حوالے سے کی گئی ہر بات قیاساً کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق وتنقید کی کسی کتاب میں یہاں لکھے گئے کسی ناول یا اس کے مصنف کا تفصیلی تعارف نہیں ملتا۔ اس طرح بلوچستان کے بعض محققین کا یہ دعویٰ بہ تحقیق غلط ثابت ہوا کہ مرزا ہادی رسوا نے اپنا معروف ناول امراؤ جانِ ادا یہاں اپنے زمانہ قیام میں لکھا تھا۔ مرزا رسوا انیسویں صدی کے آخر میں اس وقت بلوچستان میں کچھ عرصہ رہے جب یہاں مختلف علاقوں میں ریل کی پٹڑی بچھائی جا رہی تھی تاہم رسوا نے اپنے تمام ناول یہاں سے جانے کے بعد لکھے تھے۔ اس مقالے میں بلوچستان میں اردو کے اولین ناول کے حوالے سے انعام الحق کوثر اور ضیاء الرحمٰن کے دعاوی بھی ٹھوس دلائل کی بناء پر رد کیے گئے ہیں۔ انعام الحق کوثر نے بنا دیکھے اور پڑھے ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۰ء کے درمیانی عرصے میں شائع ہونے والی کتاب بہ عنوان محبت کا دیوتا عرف برابر کی چوٹ کو بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے۔[۶۴] اس کا عنوان ہی یہ بات ثابت کرتا ہے کہ یہ کسی طور کسی ناول کا نام نہیں ہوسکتا البتہ یہ جاسوسی کہانی ٹائپ کوئی چیز شاید ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کا ذکر بطور ناول کہیں ملتا ہے نہ ہی یہ کسی کتاب خانے میں دستیاب ہے۔ فاضل محقق نے اس مقالہ نگار سے بھی یہ بات کی تھی کہ انہوں نے یہ ناول اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا البتہ بعض احباب سے اس بارے سنا تھا۔[۶۵] ضیاء الرحمٰن نے اپنے ایک مقالے میں اخبار میں شائع شدہ چند اقتباسات کو اردو کے ابتدائی ناول کے اوراق قرار دیا ہے۔ یہ تحریر بھی مکمل صورت میں دستیاب نہیں جبکہ شائع شدہ اوراق کا متن بھی کسی طور اسے ایک ناول کا اقتباس ثابت نہیں کرتا۔ وہ کسی افسانے کا حصہ بھی ہوسکتا ہے اور ڈرامے کا بھی۔ اس لئے بلوچستان میں اردو ناول کے ضمن میں ان دونوں آراء کو تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے کی بناء پر رد کر دیا گیا۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول کون سا ہے اور اس کا مصنف کون ہے۔ ایک علاقے کی ادبی روایت کے تناظر میں صوبہ بلوچستان سے متعلق یہ ایک اہم سوال ہے۔ اور ایک بڑے اعزاز کی بات بھی ہے۔

اس مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق بلوچستان میں لکھا گیا اردو کا پہلا ناول داستانِ مجاہد ہے اور اس کا

مصنف کوئی اور نہیں معروف تاریخی ناول نگار نسیم حجازی ہے اس دلچسپ حقیقت کا پس منظر یہ ہے کہ نسیم حجازی قیام پاکستان سے قبل مسلم لیگ بلوچستان کے ایک رہنما جعفر خان جمالی کے اخبار تنظیم کے مدیر کے طور پر کوئٹہ میں کئی برس مقیم رہے۔ وہ 1941ء میں کوئٹہ آئے اور 1948ء تک رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اخبار کی ادارت کے ساتھ ساتھ اپنے ابتدائی ناول بھی لکھے۔ نسیم حجازی نے کوئٹہ میں رہتے ہوئے جو ناول لکھے ان داستان، مجاہد، محمد بن قاسم، شاہین اور آخری چٹان شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوئٹہ ہی میں قیام کے دنوں میں طنز و مزاح پر مبنی ایک کتاب سو سال بعد لکھی۔ ان کتابوں کی اولین اشاعتوں میں مصنف کے رقم کردہ جو مختصر دیباچے شامل ہیں، ان کے اختتام میں نہ صرف جائے تحریر کوئٹہ کی ہے بلکہ ان میں سے کچھ جعفر خان جمالی اور دیگر بلوچ شخصیات کے نام معنون کی گئی ہیں۔ بعض دیباچوں میں چند بلوچ شخصیات کی طرف سے فراہم کردہ تعاون کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہوتی کہ نسیم حجازی نے اپنے ابتدائی ناول کوئٹہ میں ہی لکھے تھے، اور بلوچستان میں لکھا گیا پہلا ناول نسیم حجازی ہی کا ہے۔

نسیم حجازی کے ناول تاریخی رجحان کے ہیں۔ ان میں اسلامی تاریخ کے مختلف مشہور کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ نسیم حجازی کے فن پر اسلوب اور فکر کی سطح پر اقبال کے اثرات بھی واضح ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جس کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ ضرورت ہے کہ نسیم حجازی کے فن پر اقبال کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ الگ سے کیا جائے۔ نسیم حجازی کے ناولوں کے مطالعے سے جو اہم بات سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں اسلامی تاریخ کے بعض ممتاز کرداروں کے تناظر میں نوجوانوں میں جذبہ جہاد ابھارنے کی کوشش بہت واضح نظر آتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں بین السطور مسلمان نوجوانوں کو جہاد پر اکساتے ہوئے کفار کے ملکوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔

آج مسلم دنیا بالعموم اور ہمارا خطہ بالخصوص انتہا پسندی کے گھیرے میں ہے۔ طالبان اور دیگر انتہا پسند عناصر کے تصور جہاد کے باعث دنیا کو جن مشکلات کا سامنا ہے اس تمام صورتحال کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے کہ ایسی ذہنی فضا ہموار کرنے میں نسیم حجازی جیسے اہل قلم کا کتنا حصہ ہے۔ اس کے لئے نسیم حجازی کے ناولوں کی از سر نو تنقیدی جرات کی ضرورت ہے تاکہ آج کے حالات میں ان کی تصنیفات کی تعین قدر کی جا سکے۔ اس طرح کے مطالعے کی افادیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ نسیم حجازی کو آج بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ لامحالہ طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا آج کے قاری کو اسلامی تاریخ سے روشناس کرانے میں ان کی تحریری مددگار ثابت ہوتی ہیں یا پھر یہ نوجوانوں میں

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے قتل وغارت گری اور جہاد کے غلط تصورات کو فروغ دیتی ہیں۔ یہ کہ عہد حاضر میں نسیم حجازی کی کتابوں کی اشاعت کا جواز کیا ہے۔ زندہ معاشروں میں ایسے موضوعات اور کتابوں کو ناگزیر طور پر تحقیق کا موضوع بنایا جاتا ہے۔

جہاں تک بلوچستان کا تعلق ہے نسیم حجازی کو بلوچستان میں بھی پڑھا جاتا ہے تاہم اس تاریخی حقیقت سے بلوچستان میں شاید ہی کوئی آگاہ ہو کہ انھوں نے ابتدائی ناول کوئٹہ میں رہتے ہوئے لکھے تھے۔ بلوچستان کے محقق انعام الحق کوثر نے تحریک پاکستان میں بلوچستان کے حوالے سے نسیم حجازی کے کردار پر لکھا ہے۔ اس کا تذکرہ دوسرے باب میں ہو چکا ہے مگر وہ بھی کوئٹہ میں ان کی ناول نگاری کے حوالے سے خاموش ہیں۔ بلوچستان کے دانشور البتہ نسیم حجازی کے جہادی تصورات کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاہ محمد مری ان کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ''بلوچستان کی زمین ایسی ہے کہ یہاں نسیم حجازی نہیں اگتے''[۲۶] جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور بلوچستان ہی نسیم حجازی کی قلمی جنم بھومی ہے۔ بلوچستان کی سرزمین، یہاں کے ماحول اور لوگوں نے نسیم حجازی کو خاص مدد اور معاونت فراہم کی۔ اس کا اعتراف نسیم حجازی نے اپنے مختلف ناولوں کے دیباچوں میں کیا ہے۔ یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ نسیم حجازی نے اگرچہ تاریخی ناول نگاری اور اس طرح کے مقبول عام ادب میں کافی نام یا شہرت پائی ہے؛ انھوں نے بلوچستان کے ادیبوں اور لکھنے والوں کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ کیا بلوچستان کے ادیبوں کی تحریروں پر نسیم حجازی کے اثرات مرتب ہوئے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب نہایت سادہ ہے۔ اس باب میں بلوچستان میں اردو فکشن اور ادب کا جائزہ بہ تفصیل پیش کیا گیا ہے۔ اس مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بلوچستان کے ادیبوں پر اسلوب اور موضوعات پر دو حوالوں سے نسیم حجازی کے اثرات بالکل نظر نہیں آتے۔ یہاں کوئی ایک ایسا ناول نہیں لکھا گیا جو اسلامی تاریخ کے کسی کردار کو بطور ہیرو پیش کرتا ہو یا جس میں اسلوب اور مواد کی سطح پر نسیم حجازی کا عکس ملتا ہو۔ بلوچستان میں اردو افسانے اور ناول کی روایت کا ارتقا نسیم حجازی کے کوئٹہ میں قیام کے زمانے میں ہوا، مگر ان کے اثرات تو رہے ایک طرف حد تو یہ ہے کہ یہاں تاریخ کے کسی پہلو یا واقعے پر بھی سرے سے کوئی ناول نہیں لکھا گیا۔ بلوچستان میں زیادہ تر جو ناول لکھے گئے وہ عموماً محبت کے موضوع پر ہیں اور اس حوالے سے خانگی اور گھریلو مسائل کو پیش کرتے ہیں۔

یہ صورتحال قریب قریب پچاس برس تک رہی ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں البتہ ہاشم ندیم کے بعض

ناولوں میں نسیم حجازی کے اثرات مشرق ومغرب کی آویزش کی صورت میں ملتے ہیں۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے ہاشم ندیم کے ناولوں کے بیان میں آئے گا۔ یہاں ایک ضمنی سوال یہ اٹھتا ہے کہ بلوچستان میں قیام نے نسیم حجازی پر کیا اثرات مرتب کئے وہ یہاں کے ماحول اور جغرافیے سے روشناس ہوئے تو کیا انہوں نے اپنے ناولوں میں کردار نگاری، زبان وبیان یا ماحول اور منظر نگاری کے حوالے سے بلوچستان کی عکاسی کی یا نہیں۔ جہاں تک کردار، زبان و بیان اور ماحول کا تعلق ہے چونکہ حجازی کا موضوع اسلامی تاریخ کی نامور شخصیات رہی ہیں۔ اور ان سے اکثر شخصیات کا تعلق سرزمین حجاز سے ہیں لہٰذا ان کے ہاں کرداروں کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور ماحول بھی ویسا ہی ملتا ہے۔ البتہ منظر نگاری کرتے ہوئے حجازی کا قلم جب صحرا اور بیابان کی تفصیلات لکھتا ہے اس وقت کہیں کہیں بلوچستان کے صحرائی ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بلوچستان بھی عرب خطے کی طرح صحرا و بیاباں کا منظر نامہ رکھتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نسیم حجازی نے تاریخی شخصیات پر قلم اٹھاتے ہوئے لامحالہ اسلامی تاریخ سے استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے صحرائے عرب کے جغرافیائی خدوخال سے بھی ضرور آشنائی حاصل کی ہوتی، مگر واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی ناول میں صحرائی ماحول کی تصویر کشی کرتے ہوئے بلوچستان کا منظر نامہ ان کے سامنے رہا۔ یوں وہ شعوری یا لاشعوری طور سے کئی جگہ بلوچستان کے صحرا و بیابان کی تصور کشی کرتے نظر آتے ہیں ان کے ناولوں میں جہاں جہاں قدرتی منظر نامہ بیان ہوا ہے اس کے مطالعے سے قاری کو گمان ہوتا ہے جیسے وہ بلوچستان کی آب وہوا میں سانس لے رہا ہو۔ اس بات کی تائید ہر وہ شخص کرے گا جسے بلوچستان کی صحرائی آب وہوا اور بے کراں ویرانوں میں رہتے یا چلنے پھرنے کا موقع ملا ہو۔ چاہے وہ صحرا کی عظیم وسعتیں ہوں یا خشک اور بلند کوہساروں کے ویرانے اور یا پھر یہاں وہاں پھیلے ہوئے ضلع نما مکان، بلوچستان کا جغرافیائی منظر نامہ نسیم حجازی کے ناولوں میں کئی جگہ اپنی جھلک دکھاتا ہے مکران کے ناول محمد بن قاسم میں تو بلوچستان کے مختلف خطوں کا ذکر آتا ہے جن سے گزر کر قاسم کا لشکر دیبل پر حملہ آور ہوتا ہے اس واقعے کو لکھتے ہوئے نسیم حجازی کہتے ہیں:

> محمد بن قاسم شیراز سے ہوتا ہوا مکران پہنچا۔ مکران کی سرحد عبور کرنے کے بعد لس بیلا کے پہاڑی علاقے میں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بھیم سنگھ بیس ہزار فوج کے ساتھ لس بیلہ کے سندھی گورنر کی اعانت کے لئے پہنچ چکا تھا اس نے ایک مضبوط پہاڑی قلعے کو اپنا مرکز بنا کر تمام راستوں پر اپنے تیر انداز بٹھا دیئے۔ اپنے باپ کی مخالفت کے باوجود وہ راجہ کو اس بات کا یقین دلا چکا تھا کہ اس کے بیس ہزار سپاہی بارہ ہزار مسلمانوں کو لس بیلہ سے

آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔[۶۷]

اسی جگہ آگے چل کر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کا ذکر آتا ہے جو اس علاقے میں آج بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ اس طرح نسیم حجازی نے نہ صرف بلوچستان کے قدرتی ماحول اور جغرافیائی منظرنامے کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا بلکہ اس تاریخی حقیقت کی نشاندہی بھی اپنے فکشن میں کی کہ محمد بن قاسم کا لشکر بلوچستان کی طرف سے خشکی کے راستے سندھ یا اس زمانے کے دیبل پر حملہ آور ہوا تھا نہ کہ سمندری راستے سے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ شاید انہی خطوط پر بعد میں کامل القادری نے اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی اور اپنی کتاب قدیم بلوچستان میں تفصیل سے محمد بن قاسم کے بلوچستان کے راستے سندھ پر حملے کا تفصیلی حال قلمبند کیا اس کی تفصیل دوسرے باب میں آچکی ہے۔ نسیم حجازی کے ناولوں نے ابتدا ہی سے قبول عام حاصل کر لیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ قارئین ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ اور اس کے اہم کرداروں سے بھی آشنا ہوتے نسیم حجازی کی ناول نگاری کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے مشتاق احمد نوری لکھتے ہیں:

> نسیم حجازی نے اپنے تاریخی ناولوں کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے، اس میں سے آپ تاریخ تلاش کر سکتے ہیں۔ ان ناولوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی کاپیاں ایڈوانس دے کر بک کراتے تھے۔[۶۸]

محولہ بالا اقتباس میں نسیم حجازی کے ناولوں میں تاریخ تلاش کرنے کی جو بات کی گئی ہے وہ محل نظر ہے کہ فکشن آخر فکشن ہوتا ہے اس میں تاریخ کے حقائق کو اسی طرح بیان کرنا بوجوہ ممکن نہیں ہوتا بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ فکشن لکھتے ہوئے مصنف زیب داستان کے لئے بہت کچھ بڑھا بھی دیتا ہے۔ یہ بات نسیم حجازی کے ناولوں پر بھی صادق آتی ہے۔ نسیم حجازی کے ناولوں میں تاریخ کی کیا کارفرمائی ہے اور کتنا فکشن ہے اس کے لئے ان کے ناولوں کا تاریخی حقائق کی روشنی میں الگ سے تفصیلی مطالعہ درکار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقالہ اس مطالعے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

اس مقالے کی تسوید کے دوران جس اہم ناول کی بازیافت ہوئی ہے وہ بندھن ہے قیاس ہے کہ یہ ناول قیام پاکستان کے فوراً بعد کے عرصے میں لکھا گیا تھا۔ ناول بندھن کا تذکرہ قبل ازیں کسی کتاب یا مقالے میں نہیں ملتا۔ اس ناول کا مصنف ایک بلوچ مولانا بخش محمد شہی ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق مولا بخش محمد شہی اردو کا

پہلا بلوچ ناول نگار ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کا تعلق بلوچستان کے ایک معروف قبیلے محمد شہی سے ہے مگر مولا بخش محمد شہی کے ذاتی کوائف تا حال دستیاب نہیں ہو سکے کہ یہ کہاں پیدا ہوا کہاں اور کتنی تعلیم حاصل کی یا کس شہر میں رہا اور کب وفات پائی۔ یہ سوالات ہنوز تشنہ اور بلوچستان کے محققین کو دعوت تحقیق دیتے ہیں جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ناول بندھن کا تذکرہ پہلی بار اس مقالے میں کیا جا رہا ہے۔ یہ جاننا خالی از دلچسپی نہیں کہ بندھن ہی وہ پہلا ناول ہے جس میں کوئٹہ سمیت بلوچستان کے مختلف شہروں، ہندو باغ، پشین لورالائی اور مستونگ کا لوکیل ملتا ہے۔ اس ناول کے مختلف کردار ان علاقوں میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ ناول پہلی سنجیدہ کوشش ہے۔ بندھن رومانوی اور اصلاحی موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس میں تین دوستوں کی دیرینہ رفاقت کا دائرہ ان کی وفات کے بعد ان کے بچوں کے باہمی تعلق یعنی محبت اور پھر شادی تک پھیلتا نظر آتا ہے۔ اس میں اصلاح کا پہلو یوں ملتا ہے کہ ناول کے وہ کردار جنہیں چکلے کی طوائفوں سے میل جول کی عادت ہوتی ہے انہیں اس عادت بد سے پیچھا چھڑاتے دکھایا گیا ہے۔ ناول بندھن سنجیدہ ادب کے دائرے میں نہیں آتا بلکہ اسے مقبول عام ادب (پاپولر لٹریچر) کا حصہ سمجھا جانا چاہیے۔ مولا بخش محمد شہی نے اپنے ناول میں مسلمان کرداروں کے ساتھ ساتھ ہندو اور سکھ کرداروں کی شکل میں چند منفی کردار بھی پیش کئے ہیں یہ کہانی کو بڑھاوا ہی نہیں دیتے بلکہ اس زمانے کے ماحول کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ اس کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے اور فوراً بعد کے زمانے میں یہاں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اور سکھ بھی کثیر تعداد میں رہائش پذیر تھے۔ تمام مذاہب کے پیروکار گھل مل کر معاشرے کی تشکیل کرتے تھے جس میں مذہبی حوالے سے کافی رنگارنگی تھی۔ لوگ نہ صرف دوسرے کے عقیدے اور مذہب کو کھلے دل سے تسلیم کرتے تھے بلکہ اس کا احترام بھی کیا جاتا تھا۔ ناول میں کوئٹہ میں چکلے اور شراب خانوں کی موجودگی اور ناول کے بعض کرداروں کی آزادانہ آمد و رفت بھی ایک الگ معاشرت کی تصویر کشی کرتی ہے۔ آج جس کا تصور بھی محال ہے۔ ان حوالوں سے دیکھا جائے تو بندھن مقبول عام ادب کا حصہ ہونے کے باوجود پرانے کوئٹہ کی معاشرت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس حوالے سے اس کی تاریخی اہمیت ثابت ہوتی ہے جہاں تک اس میں لکھی گئی زبان اور اسلوب کا تعلق ہے بندھن کا مصنف ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص معلوم ہوتا ہے اسے اردو زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ سادہ، رواں اور پختہ نثر لکھنے پر قدرت رکھتا تھا۔ اس کے ہاں اردو روزمرہ اور محاورے کا استعمال بھی ملتا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بلوچستان میں اردو کے رائج ہونے کے نصف صدی بعد یہاں کے لوگ اس قدر اردو سے آشنا تھے کہ وہ نہ صرف اس میں اظہار خیال کرتے تھے بلکہ یہ ان کی تحریر و تخلیق کی زبان کا درجہ بھی حاصل کر

چکی تھی۔ناول بندھن اس کی علامت ہے۔

بلوچستان کے اردو فکشن کی مطبوعہ کتب پر ایک طاہرانہ نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو افسانے کے مقابلے میں یہاں لکھے جانے والے زیادہ تر ناول مقبول عام ادب میں شامل ہوتے ہیں۔ایسے ناول جو سنجیدہ ادب یا ادب عالیہ میں آتے ہوں بہت کم ہیں۔اگر چہ اردو تنقید میں مابعد جدیدیت کے رجحان نے لکھے گئے ادب میں کسی بھی فرق کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ ہر تحریر کو برابر اہمیت دینے کی بات کی گئی ہے کہ جس طرح ہر سطح کا لکھنے والا ہوتا ہے۔ اسی طرح ادب کے قارئین بھی مختلف ذہنی سطح کے حامل ہوتے ہیں۔قاری اپنی ذہنی سطح اور دلچسپی کے مطابق ادب کے مطالعے کی طرف راغب ہوتا ہے اور اپنی دلچسپی کی تحریر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اس لئے تمام ادب یکساں اہمیت کا حامل ہے جس ادب پر مقبول عام ادب کی پھبتی کسی جاتی ہے وہ تو زیادہ پڑھا جاتا ہے عوام میں زیادہ مقبول ہوتا ہے اس لئے مقبول عام ادب کہلاتا ہے پھر اسے کمتر ادب کیوں مانا جائے۔ یہ صرف اردو ناقدین کی جانبداری ہے کہ وہ اس طرح ادب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔جسے اعلیٰ ادب قرار دیں اس کی توصیف میں صفحات کالے کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف مقبول عام ادب کو یکسر رد کر دیتے ہیں۔حالانکہ اس میں بھی عام زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔اس ادب کے کردار عام انسانوں کی طرح اور ماحول بھی روزمرہ زندگی جیسا ہوتا ہے۔ان کے مسائل بھی عام انسانوں کو پیش آنے والے واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان میں بھی زندگی اور انسانی رویوں کے بارے میں سوال اٹھائے جاتے ہیں ان میں محبت کا موضوع بھی ہوتا ہے اور انسانوں کی اصلاح کا جذبہ بھی مقبول عام ادب میں شامل اکثر ناول انجام پر قاری کے لئے سبق آموز بھی ہوتے ہیں یعنی ان کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں۔اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مقبول عام ادب کو سطحی ادب کہہ کر جھٹلانا ہرگز مناسب نہیں۔اس کا مطالعہ بھی سنجیدگی سے اور پوری تنقیدی بصیرت کو بروئے کار لاکر کیا جانا چاہیے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ آخر ان میں کہانی کی بنت' کردار نگاری یا زبان میں ایسی کیا چیز ہے جو لوگوں کو اس قدر متاثر کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ مقبول عام ادب کو حقارت سے دیکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔مقبول عام ادب کا دفاع کرتے ہوئے اظہار اثر لکھتے ہیں:

> کہانی کا موضوع اور اسلوب بیان کسی کہانی کو اس کی شناخت دیتے ہیں۔اس لئے کہانی کو اچھے یا برے درجوں میں تو تقسیم کیا جاسکتا ہے اس کو ادبی یا غیر ادبی خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔[۶۹]

پاپولر لٹریچر یا مقبول عام ادب عام طور سے تین موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں پہلی مقبول قسم ''رومانی کہانیاں ہے'' دوسرا موضوع ''پراسرار جاسوسی'' کہانیاں ہیں جبکہ تیسرے نمبر پر ''مافوق الفطرت'' کہانیاں آتی ہیں۔ اردو میں اگرچہ ان تینوں موضوعات پر بہت لکھا گیا ہے مگر بلوچستان میں ان میں سے پہلے یعنی رومانی موضوع پر زیادہ زور قلم صرف کیا گیا ہے بعض لکھنے والوں کے ہاں البتہ کہیں کہیں مافوق الفطرت کردار بھی ملتے ہیں۔

جیسا کہ اردو میں مقبول عام ادب کی روایت ہے کہ رومانی کہانیاں زیادہ تر خواتین لکھنے والوں کے ہاں نظر آتی ہیں۔ بلوچستان میں لکھے گئے ادب کی بھی یہی صورتحال ہے یہاں بھی خواتین ناول نگاری کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ ان میں رفعت زیبا، حمیدہ جبیں، یاسمین صوفی، شاہین روحی بخاری، ممتاز شفیع، فردوس انور قاضی، راکھی چوہدری اور عابدہ رحمٰن وغیرہ شامل ہیں ان میں سے کئی خواتین نے سینکڑوں صفحات پر مشتمل ایک سے زائد ناول لکھے ہیں۔ ان لکھنے والیوں کے ساتھ کا المیہ مگر یہ ہوا کہ سنجیدہ ادب کے تنقیدی مطالعات اور اور ادبی تاریخ تو ایک طرف رہی مقبول عام ادب پر لکھے گئے مضامین اور کتب میں بھی ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ بلوچستان میں لکھی جانے والی بعض تحقیقی کتب میں ان کے نام ضرور ملتے ہیں مگر ان کے تخلیقی کام کے امتیازی نشانات یا اس کی اہمیت وافادیت کا بھرپور مطالعہ کیا گیا نہ ہی یہ واضح کیا گیا کہ ایک دور افتادہ خطے میں ان کے ادبی کام نے وہاں اردو زبان وادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا۔ بلوچستان کے محققین و ناقدین کی عدم دلچسپی کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں شائع ہونے والے ان خواتین کے ناول اب باآسانی دستیاب نہیں جبکہ ان کو لکھنے والی خواتین وفات پا چکی ہیں اور ان کے ذاتی کوائف بھی دستیاب نہیں ہیں۔ بلوچستان اور ملک میں پھیلے کتب خانوں اور پرانی کتابوں کے بازار سے ان کے ناولوں کی فراہمی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ۷۰

بلوچستان میں لکھے گئے مقبول عام ادب کی روایت میں پہلا اور قابل ذکر نام رفعت زیبا کا ہے۔ انہوں نے دو ناول لکھے ہیں۔ ان پہلا ناول ناسور ہے جو ۱۹۶۸ء میں، جبکہ ان کا دوسرا ناول رواج ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ رفعت زیبا نے اپنے ناول ناسور میں مردانہ اور جاگیردانہ سماج میں عورت کی زندگی کو بطور ایک المیہ پیش کیا ہے۔ عورت سے معاشرے میں کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے اور خود عورت اپنی ہی نوع یعنی عورت کا کسی طرح سماجی اور معاشی استحصال کرتی ہے یہ اس ناول کے مرکزی کردار شمع کے حوالے سے بخوبی دکھایا گیا ہے۔ شمع ایک پر صعوبت زندگی گزارنے کے باعث نفسیاتی مریضہ بن جاتی ہے اس لئے وہ اپنی سگی بیٹی کو بطور اولاد اپنانے سے انکار کر دیتی

ہے' پہلے وہ اس سے اجنبیت برتتی ہے اور بالآخر ایک دن وہ اس کا گلہ گھونٹ کر اسے جان سے مار دیتی ہے۔ ناول میں کئی جگہ ایسے جملے ملتے ہیں جس سے ناول نگار کا نسائی شعور ابھر کر سامنے آتا ہے جبکہ ماضی' حال اور مستقبل کے حوالے سے وقت کے المیے پر اس کے تاثرات اس ناول کو مقبول عام ادب کی سطح سے اوپر اٹھاتے ہیں۔ یہ سنجیدہ ادب اور مقبول عام ادب کے مابین کی ایک خاص چیز بن جاتا ہے۔ جسے ایک عام ناول سمجھ کر اس سے روگردانی کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔

رفعت زیبا کا ناول رواج پٹھانوں میں شادی کے ایک اہم رواج ''ولور'' کو موضوع بناتا ہے۔ ولور کہنے کو تو شادی کا ایک رواج ہے مگر دراصل یہ عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ پشتو میں ولور اس خاص رقم کو کہا جاتا ہے جو خاوند اپنی بیوی کے والد کو ادا کرتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ پٹھان گھرانوں میں یہ رقم برائے نام اور صرف ایک رواج کی حد تک ہوتی ہے اور دلہن کے والدین سے لی گئی رقم سے کئی گنا زیادہ رقم کا جہیز اور ساز وسامان اپنی بیٹی کو مہیا کرتے ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ گھرانوں میں البتہ زیادہ رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اگر لڑکی خوبصورت اور تعلیم یافتہ ہو تو ''ولور'' میں بہت زیادہ رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ شادی میں بہت کم رقم صرف کر کے پس انداز کر لی جاتی ہے۔ امیر گھرانوں کے لڑکوں کے لئے ''ولور'' کی رقم کا بندوبست کرنا آسان ہوتا ہے۔ غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے نوجوان ''ولور'' کی عدم فراہمی کی وجہ سے تادیر کنوارے رہتے ہیں۔ اسی طرح لڑکیاں بھی ''ولور'' نہ دے سکنے کے باعث ماں باپ کے گھر بوڑھی ہو جاتی ہیں کہ بغیر ''ولور'' کے ان کی شادی کرنا اپنی بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔ اب ''ولور'' کی رسم خاصی حد تک کم ہو چکی ہے مگر پھر بھی موجود ہے۔ رفعت زیبا نے اپنے ناول رواج میں اسی رسم کو ایک گھرانے کی تباہی کا باعث دکھایا ہے۔ ناول کا ہیرو گلزار ''ولور'' کی رقم کے حصول کے لئے کراچی جاتا ہے اور غلط کار لوگوں کے ہاتھ لگ کر مصیبتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ غلط راستوں پر چلنے کے بعد جب آخر کار وہ رقم کا بندوبست کر کے آتا ہے تو اس کی محبوبہ کی شادی تیار ہوتی ہے۔ اس کی محبوبہ اس کی بتائی ہوئی جگہ پر اسے ملنے آتی ہے تو اس کا باپ بھی پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ جاتا ہے اور غیرت کے باعث دونوں کو مار ڈالتا ہے۔ اس طرح اس کہانی میں شادی بیاہ کے لئے ''ولور'' کے نام پر دو خاندانوں کی زندگی تباہ کرنے کے مسئلے کو موثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔
رفعت زیبا کی تحریر پختہ سادہ اور رواں ہے۔ اور وہ اپنے ناولوں میں کہیں کہیں بلوچستان کے لوکیل کو مختلف علاقوں کے ناموں، خاص پھولوں اور پھلوں کے تذکرے اور منظر نگاری میں اجاگر کرتی ہیں اور یوں اپنی تحریر کو اپنی دھرتی سے جوڑنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

رفعت زیبا کے برعکس شاہین روحی بخاری حمیدہ اور یاسمین صوفی کے ناول مقبول عام ادب کی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔ ان تینوں ناول نگاروں کا بنیادی موضوع محبت ہے مگر ان میں کرداروں کے حالات و واقعات کی صورت زندگی کا جو رنگ اور روپ دکھایا جاتا ہے وہ محض ان ناولوں ہی میں ملتا ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بالخصوص شاہین روحی بخاری کے ناول من گھڑت واقعات اور فرضی اور غیر حقیقی حالات کی جو تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کا تصور بھی حقیقتی زندگی میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی ایک مثال ان کا ناول نیلے گگن تلے محض رومان لکھنے کی ایک ادنیٰ کاوش ہے۔ ناول کے مختلف کردار ایک دوسرے سے محبت کرنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور اس محبت میں وہ ناقابل یقین صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کے دوسرے ناول تیرے لئے کی ہے۔ اس کے مرکزی کردار بینا پر اس کی چچی جس طرح کا گھریلو تشدد کرتی ہے اس کا تصور آج کی معاشرتی صورتحال میں بری طرح کھٹکتا ہے۔ اسی طرح ایک اور کردار شہزاد کو جس طرح کسی ریاست کا شہزادہ دکھایا جاتا ہے۔ اسے بھی عقل سلیم آسانی سے تسلیم نہیں کرتی۔ ایسی ہی کمزوریاں یاسمین صوفی کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ جہاں اتفاقیہ طور پر انہوں نے واقعات کو رونما ہوتے دکھایا جاتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ انسانی زندگی میں بعض اوقات ناقابل یقین اتفاقات پیش آجاتے ہیں۔ تاہم ایسے واقعات ایک ناول یا ایک ہی ناول نگار کے ہاں کثرت سے پائے جائیں تو اس پر حقیقت کی بجائے افسانہ طرازی کا گماں ہوتا ہے۔ یاسمین صوفی کے مختلف ناولوں میں کرداروں کی زندگی میں ایسے اتفاقات زیادہ ملتے ہیں جن پر یقین کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس طرح ان کے ناول حقیقی زندگی کی تصویر پورے طور پر ٹھیک طرح سے پیش نہیں کرتے۔ البتہ ان میں کرداروں کی اٹھان جس طرح پوری جزئیات سمیت دکھائی جاتی ہے۔ روزمرہ گھریلو زندگی میں پیش آمدہ واقعات کی عکاسی میں تمام تفصیلات بلاشبہ حقیقی زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بعض کرداروں کی جدائی اور ملاپ کے واقعات میں فرضی اور غیر حقیقی رنگ جھلکتا ہے جن پر کسی فلمی منظر کا گمان ہوتا ہے۔ یاسمین صوفی کے ناولوں میں کئی جگہ ایسی لفظیات ملتی ہیں جو بلوچستان کی زندگی، سماج و ثقافت اور یہاں کے منظرنامے سے متعلق ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں ایک خاص طرح کا مگر محدود پیمانے پر مقامی رنگ جھلکتا ہے، جو کرداروں کے ناموں اور ان کے حلیوں سے لے کر مقامی بولی ٹھولی کی عکاسی کرتا ہے۔ یاسمین صوفی کے ناولوں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے ہاں زندگی اور زمان و مکاں کے حوالے سے بعض جگہ ایسے فلسفیانہ جملے اور مکالمے ملتے ہیں جن کی توقع کسی اعلیٰ ادب پارے سے ہوتی ہے۔ ایسی تحریریں ان کے ناولوں کی معنویت ہی میں اضافہ نہیں کرتیں بلکہ یہ ان کے ناولوں کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ اسی طرح ان کے نسوانی کرداروں کے حوالے

سے عورت کے بارے بہ طور نوع ایسی باتیں ملتی ہیں جن کی آج کے تنقیدی تناظر میں خاصی اہمیت ہے۔ ادب کی نسائی ردِ تشکیل اور تانیثیت ایسی تھوریز کے بل پر ان کے ناولوں کا الگ سے خصوصی مطالعہ خاصا اہم اور دلچسپ کام ہوسکتا ہے۔ ان کا قریباً ہر ناول چونکہ پانچ سو تک کے صفحات پر مشتمل ہے۔ اس لئے ان کے نسائی کرداروں کا ایسا مطالعہ مصنفہ کے ذہنی رجحان کو سمجھنے میں مدد دینے کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں لکھے گئے اردو فکشن کو ایک اور زاویے سے دیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس طرح کے مطالعات اس لئے بھی اہم ہوسکتے ہیں کہ ان سے عورت کے جدید روپ کے ساتھ ساتھ نیم دیہی یا قبائلی عورت کے مابین موجود فرق بھی واضح ہوسکتا ہے اور ہر دو طبقوں کی عورت کو سمجھنا آسان ہوسکتا ہے۔ واضح رہے کہ اس طرح کے جدید تنقیدی میلانات بلوچستان کی ادبی یا تنقیدی روایت میں موجود نہیں ہیں۔ اس سے وہاں لکھی گئی تنقید میں جدید رنگ آ سکتا ہے۔ یہ جدید تنقیدی تناظرات نہ صرف وہاں لکھے گئے ادب کی تعبیر بہتر طور پر کر سکتے ہیں بلکہ اس سے لامحالہ مستقبل کے مصنفین بھی استفادہ کریں گے۔ یوں بلوچستان کی ادبی روایت علمی بنیادوں پر استوار ہو سکے گی۔ یاسمین صوفی کے برعکس حمیدہ جبیں کے ناول اوسط سطح کے رومانی اور معاشرتی ناول ہیں۔ ایسے ناول جو عموماً مقبول عام ادب کے طور پر لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ ان کا انداز بیاں بھی جذباتی ہوتا ہے اور یہ عام گھریلو خواتین کے ذوق پر پورا اترتے ہیں اس لئے ان کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔

بلوچستان میں لکھے گئے خواتین کے ناولوں بلکہ تمام مقبول عام ادب پر راشد انور راشد کی یہ بات صادق آتی ہے جو انہوں نے اس طرح کے ادب کی افادیت اجاگر کرتے ہوئے کہی ہے۔ ان کے بقول:

> اس نوع کے ادب میں بھی ایک مخصوص عہد کی زندگی اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ پاپولر لٹریچر بھی سماجی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کی صورت میں نمودار ہوسکتا ہے۔ اس نوع کے ادب کے ذریعے بھی ادیب انسانی تجربات کا نچوڑ ہنر مندی کے ساتھ پیش کرتا ہے جس کی بناء پر انسانی رشتوں کا وقار قائم رہتا ہے اور زندگی کی سیاسی، سماجی اور معاشی جھلکیوں سے آگہی کے نئے منظر نامے بھی روشن ہونے لگتے ہیں۔ [۷۱]

شاید یہ بات تمام مقبول عام ادب پر صادق آتی ہو مگر جہاں تک بلوچستان میں لکھے گئے ادب کا تعلق ہے یقینی طور پر یہاں کے مقبول عام ادب پر یہ بات پوری اترتی ہے۔ چاہے وہ رفعت زیبا اور یاسمین صوفی کے ناول ہوں جو کئی دہائیاں پیشتر لکھے گئے تھے اور یا پھر موجودہ عہد کے ناول نگار ہاشم ندیم کی بات ہو۔ ان مصنفین نے نہ

صرف اپنے علاقے میں اردو نثر کی روایت قائم کی اسے آگے بڑھایا بلکہ اپنے تجربات وحوادث اور اسلوب کی شکل میں اردو زبان میں بھی خوبصورت اضافے کئے ہیں۔ ہاشم ندیم کا ذکر آیا ہے تو یہاں پر بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ بلوچستان کا یہ لکھاری آج کا ایک مقبول ترین ناول نگار ہے۔ سنجیدہ نقاد اس کی تخلیقات کو بے شک اعلیٰ ادب کے دائرے میں شامل نہ سمجھتے ہوں مگر نوجوان نسل اور اردو کا ایک عام پڑھا لکھا شخص اس کے ناولوں کو شوق اور محبت سے پڑھتا ہے۔ ہاشم ندیم کے ناول بچپن کا دسمبر میں جس طرح گھریلو زندگی اور بچپن کے حالات وواقعات کو جذباتی طور پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں بلوچستان کے مقامی عناصر جس طرح خوبصورت رنگ بھرتے ہیں وہ قاری کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتے ہیں۔ ہاشم ندیم کو جذباتی تحریر پر عبور حاصل ہے اس لئے اس کی تحریروں کی مانگ میں روز بروز اضافہ ہوتا نظر آتا ہے۔

ہاشم ندیم نے اپنے پہلے ناول میں خدا اور محبت میں جس طرح محبت کے موضوع پر لکھا وہ جذبات نگاری کی معراج کہی جاسکتی ہے۔ محبت کے موضوع کے علاوہ اس نے اس ناول میں عالمی سیاسی اور معاشرتی منظر نامہ دکھایا ہے۔ اس کا ہیرو جس طرح لندن میں ''ہولوکاسٹ'' پر بات کرتا ہے اور اسلام کی حقانیت ثابت کرتا ہے وہ

بلوچستان کے اردو فکشن میں ایک نئی چیز ہے۔ البتہ اس میں یہودی لڑکی سارہ کا اسلام قبول کرنے کے واقعے سے نسیم حجازی کے بعض ناولوں کی یاد تازہ کردیتا ہے۔ ہاشم ندیم کے ناول مقدس میں نائن الیون کے تناظر میں نیویارک میں مسلمان طلباء کو درپیش مسئلہ اٹھانا بھی ایک اہم بات ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ بلوچستان کا لکھاری کوئٹہ میں رہتے ہوئے عالمی مسائل پر نہ صرف نگاہ رکھتا ہے بلکہ ان مسائل کو اپنے فن میں کامیابی سے برت بھی سکتا ہے۔ ہاشم ندیم کے جذباتی اسلوب کی خرابی یہ ہے کہ یہ تھوڑے وقت کے لئے تو قاری پر رقت طاری کردیتی ہے مگر اسے تادیر اپنے سحر میں جکڑ نہیں سکتی جو کہ ادب عالیہ کی خصوصیت ہے۔ شاید یہی وہ خامی ہے جو مقبول عام ادب میں عام ہے اس کے برعکس کہ بڑا ادب وہ ہوتا ہے جسے بار بار پڑھا جائے اور ہر بار اس کی قرآت سے آدمی کی بصیرت میں اضافہ ہوجائے۔

مقبول عام ادب کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں سنجیدہ اور ادبی ناول لکھنے کی کوششیں بھی سامنے آتی رہی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ بلوچستان میں لکھے جانے والے ان ناولوں سے اردو کا شاید ہی کوئی نقاد آگاہ ہو۔ عام قارئین بھی بلوچستان کے اردو ناولوں سے بہت کم واقف ہیں۔ سنجیدہ ناول لکھنے کی ایک کوشش فردوس انور قاضی کے

ناول خوابوں کی بستی میں ملتی ہے۔اس کے عنوان سے اگر چہ شوکت صدیقی کے ناول خدا کی بستی کا نام ذہن میں گونجتا ہے مگر خوابوں کی بستی میں کہانی قدرے دوسرے روپ میں ملتی ہے۔ فردوس انور قاضی کے ناول کا محل وقوع بھی کراچی ہے تاہم اس کا غالب رجحان سیاست بلکہ لسانی سیاست ہے۔ وہ لسانی سیاست جو کراچی میں پچھلے تین چار عشروں میں ابھر کر سامنے آئی جس نے سیاست میں تشدد کو فروغ دیا اس ناول کا بنیادی سرکار ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ناول میں ابتداء کے قریباً سو صفحات بھرتی کے اور غیر ضروری بلکہ اس ناول پر بوجھ ہیں۔ یہ سنجیدہ ادب کے قاری پر سخت گراں گزرتے ہیں۔ یوں اس کی مصنفہ خود کو ایک اچھا یا کامیاب ناول نگار ثابت نہیں کر سکی ہیں۔اس ناول کی اہم بات وہ کہانی ہے جس میں ایک سیاسی پارٹی کے بطن سے دوسری پارٹی جنم لیتی ہے اور وہ ریاست کے مفادات کی حامی ہوتی ہے۔کراچی کی سیاست میں حالیہ دنوں میں ایم کیو ایم سے جس طرح ایم کیو ایم پاکستان نمودار ہوئی ہے۔ یہ بالکل وہی صورت ہے جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہونے والے ناول خوابوں کی بستی میں نظر آتی ہے۔اس طرح یہ ناول گویا مستقبل کی سیاست کی پیشن گوئی کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ناول نگار کا سندھ کے مقامی لوگوں کی بجائے اردو بولنے والوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ ناول کے مختلف صفحات سے واضح طور پر جھلکتا ہے۔ ناول نگار خود بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔اس لئے ان کی یہ جانب داری ناول میں بری طرح کھٹکتی ہے اور بہ طور ناول نگار ان کی غیر جانبداری پر سوال ضرور اٹھاتی ہے۔

بلوچستان میں لکھے گئے اردو ناول کی اہم ترین خوبی اس میں بلوچستان کی سیاست' سماج اور ثقافت کی عکاسی ہے۔بلوچستان کی مقامی زبانوں کے اثرات' کرداروں کے لہجے اور ناول کی زبان پر لفظیات کی صورت میں کس طرح مرتب ہوئے۔ان سب عناصر کی موجودگی بلوچستان میں لکھے گئے ناول کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

بلوچستان کی مقامیت کی حامل اور یہاں کے سماجی وثقافتی خدوخال اگر کسی ایک ناول نگار کے ہاں حاوی رجحان کے طور پر نظر آتے ہیں تو وہ آغا گل ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں بھی بلوچستان ہی کے مختلف رنگوں کی تصویر کشی کی ہے۔آغا گل کے چار مختصر ناول دشتِ وفا (یہ ناول دو بار مختلف ناموں سے شائع ہوا ہوا) بیلہ ، بابو اور فسانہء جنات کے ناموں سے وقفے وقفے سے شائع ہوئے ہیں۔ان کے ناولوں کے نہ صرف کردار مکمل طور پر مقامی بلکہ ان کی فضا اور منظر نامہ بھی بلوچستان کا ہے۔ان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ آغا گل نے بعض ناولوں میں

زیادہ بعض میں کم بلوچستان کے اردو لہجے کو پیش نظر رکھا۔ان کے ناولوں کے کردار جب آپس میں مکالمہ کرتے ہیں تو وہ وہی لہجہ بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جو بلوچستان بھر کے مختلف علاقوں میں مروج ہے اور مقامی لفظیات کے طفیل ایک انفرادیت رکھتا ہے۔اس مقامی لہجے کی مثالیں پہلے دی جا چکی ہیں۔اس لئے انہیں پھر سے یہاں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے تاہم آغا گل کا ناول بابو کے پیش لفظ میں یہ دعویٰ کہ انہوں نے کوئٹہ کی اردو کو پہلی بار تحریری شکل دی قطعاً درست نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ان سے پہلے بلکہ بہت سے مختلف لکھنے والے نظم ونثر میں کوئٹہ کے اردو لہجے کو پیش کر چکے ہیں۔مثلاً یاسمین صوفی کے ناولوں میں ایسے کئی جملے ملتے ہیں جو اس لہجے کی عکاسی کرتے ہیں۔کئی لوگ سنجیدہ اور مزاحیہ مضامین بھی اسی لہجے میں لکھتے رہے ہیں۔جن میں سے ایک نام آغا صادق حسین کا بھی ہے۔ حقیقتو یہ ہے کہ قیام پاکستان سے بہت پہلے عابد شاہ عابد اور محمد حسین عنقا نے اپنی نظموں میں اردو شاعری کو اس لہجے سے آشنا کیا جبکہ عطا شاد نے اپنے تخلیقی وفور اور لہجے کے بانکپن سے اس میں خوبصورت اضافہ کیا۔دوسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آغا گل کے ناول اپنی اس انفرادیت کے علاوہ کہ ان میں بلوچستان کا ماحول اور کرداروں کا مقامی لہجہ ملتا ہے کچھ خاص ادبی وقعت نہیں رکھتے۔ان کے ناولوں میں وہ گہرائی اور بصیرت عنقا ہے جو ناول کا لازمہ ہوتی ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ آغا گل کی نثر بھی ناول کے لئے درکار زبان کا حق ادا نہیں کرتی۔ان کا کوئی ناول ایک بار سے زائد نہیں پڑھا جاسکتا۔یہ کسی بھی ادبی تحریر کی سب سے بڑی خامی ہوتی ہے کہ وہ قاری کو بارِ دگر مطالعے پر آمادہ نہ کر پائے۔

آغا گل نے البتہ بلوچستان کے سیاسی مسئلے اور موجودہ سماجی انتشار کو ضرور اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کا انداز بیان بہت جذباتی ہوتا ہے اس لئے یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک تخلیق کار نہ ہوں بلکہ اس مسئلے سے گزرنے والا ایک کردار ہوں، جو کہ وہ نہیں ہیں۔اسی طرح ان کی تحریر میں بلوچستان کا احساس محرومی بھی صرف ظاہری اور اوپری طور پر نظر آتا ہے۔اس میں گہرائی مفقود ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ خود ذاتی طور سے بیوروکریٹ ہیں۔ان کی زندگی آسائش و آرام سے گزری ہے۔چنانچہ وہ اس احساس سے قلبی طور سے نہیں گزرے جو کسی بھی اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔اس لئے ان کے پیش کردہ ادب میں زندہ رہنے کی طاقت نہیں ہے بلکہ اس میں ایسی سطحیت پائی جاتی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معدوم ہو جاتی ہے۔

خالد اقبال جوئیہ کے ناول پڑاؤ کو اگر بلوچستان میں اردو ناول کی روایت کا حاصل کیا جائے تو بے جا نہ

ہوگا۔ یہ ناول نہ صرف یہ کہ ایک ضخیم ناول ہے بلکہ یہ ناول کے فن پر ہر حوالے سے پورا اترتا ہے۔اب تک یہ بلوچستان میں لکھا گیا واحد ناول ہے جسے ملکی سطح پر پورے اطمینان کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ پــــڑاؤ ایک نظرانداز شدہ ناول ہے یہ اردو ناقدین اور محققین کی بے پروائی اور ادب کے قومی دھارے سے شعوری لاپرواہی برتنے کا نتیجہ ہے کہ اس قدر اہم ناول کا تذکرہ اور اس پر تنقید تو رہی ایک طرف' اس ناول سے اردو کا شاید ہی کوئی اہم نقاد اور محقق آ گاہ ہو۔حد یہ ہے کہ آفتاب احمد کی کتاب اردو ناول آزادی کے بعد میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔ بلوچستان ہی کے نقاد فاروق احمد نے بجا طور پر اس کی ایک اچھے انداز میں تعریف وتوصیف کی ہے۔ پــڑاؤ ایک مکمل ناول ہے اس میں متعدد کردار متنوع طبائع اور حلیے کے ملتے ہیں،اس میں ایک کردار انگریز کا ہے۔ اس ناول میں بلوچستان کو ریاست برطانیہ کا حصہ بنانے والے سر رابرٹ سنڈیمن کا تذکرہ بھی ملتا ہے اس طرح یہ تاریخی تناظرات بھی رکھتا ہے اور مابعد نو آبادتی پس منظر بھی۔اس میں جاگیردارانہ معاشرت کی عکاسی تمام جزئیات کے ساتھ کی گئی ہے۔ناول کے اکثر مقامات کے نام فرضی ہیں اس میں بنیادی کہانی اس کیمپ کے گرد گھومتی ہے جو معدنیات کے ذخائر کی تلاش کی غرض سے لگایا گیا تھا مگر وہ بالآخر ناکام ہو جاتا ہے۔اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ بلوچستان کی معدنیات کے حوالے سے کسی کیمپ کی کہانی ہے، جو مقامی سرداروں کی ناپسندگی اور سازشوں کے باعث ناکام ہو جاتا ہے۔اس میں کئی جگہ فلسفیانہ موشگافیاں بھی ملتی ہے۔اس کی نثر سادہ' رواں مگر ایسی پختہ اور گھمبیر تا لئے ہوئے ہے جس کی بار بار قرآت کی جاسکتی ہے اور اس سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔پــڑاؤ فکر وفن کے تمام حوالوں سے ایک مکمل اور خالصتاً ادبی ناول ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ مرکزی شہر تو رہے ایک طرف کوئٹہ اور بلوچستان کے دیگر شہروں کے قارئین بھی اس کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ یہ بذات خود ایک المیہ ہے جس کی کوتاہی اس کی بار دگر اشاعت اور عام دستیابی سے دور کی جاسکتی ہے۔حق یہ ہے کہ اس کا تذکرہ پاکستان میں اردو ناول کی تاریخ اور تنقید میں ضرور کیا جانا چاہیے۔

بلوچستان کے معاصر ادبی منظر نامے پر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اب یہاں ایک تواتر سے ناول لکھے جارہے ہیں۔ان میں زیادہ تر نوجوان لکھنے والے شامل ہیں۔ یہ ناول البتہ ناول کے فنی معیار پر پورا نہیں اترتے ہیں۔چند ناول شاہ نواز علی نے تحریر کئے ہیں۔ان کے قریباً چار ناول شائع ہوئے ہیں انہیں مقبول عام ناول کہا جاسکتا ہے۔شاہ نواز علی کے ناول بھی محبت کے موضوع پر ہیں۔ان کا انداز تحریر سادہ اور بے رنگ ہے جو ادبی چاشنی نہیں رکھتا ان کے موضوعات بھی کافی محدود ہیں۔ایک ناول مجھے پاکستان سے جانا ہے ان نوجوانوں کی

کہانی ہے جو پاکستان سے باہر دیارِ غیر میں قسمت آزمائی کے لئے جاتے ہیں۔ یورپ اور آسٹریلیا کے ممالک جدید معیارِ زندگی اور سرمائے کی کثرت کے باعث نوجوانوں کے لئے انتہائی پرکشش ہیں۔ ہر سال پاکستان سے ہزاروں لوگ جائز اور ناجائز طریقوں سے دنیا کے مختلف ترقی یافتہ ملکوں کا رخ کرتے ہیں۔ مجھے پاکستان سے جانا ہے بھی ایسے نوجوان لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے مشکل گھریلو حالات کے سبب نوکری کے لالچ میں دبئی جاتی ہے اور مزید پریشانیوں میں گھر جاتی ہے۔ بڑی مشکلوں سے گزر کر کے بالآخر وہ پاکستان لوٹ آتی ہے مگر پیچھے اس کا گھر بکھر چکا ہوتا ہے۔

بلوچستان سے اکثر لوگ باہر جانے کی کوشش میں نظر آتے ہیں۔ کوئٹہ کے ہزارہ قبیلہ کے لوگ خصوصاً آسٹریلیا جانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ دیکھا جائے تو مصنف نے اس رجحان کو ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ نواز علی نے ایک ناول آدم زادیاں میں عورت کی تذلیل اور مالدار اور طاقتور حلقوں کی جانب سے اس کے جنسی اور معاشی استحصال کی داستان رقم کی۔ اس طرح وہ موضوعات کو اپنے ناول میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں مگر ناول کے فنی تقاضے پورے نہیں کرتیں ان کی نثر بھی ایسی جاندار نہیں جو قاری کو اپنے سحر میں لے سکے۔ شیر دل غیب اور خیام ثناء نے مختصر ناول لکھے ہیں، یہ مختصر ناول یونیورسٹی میں ہونے والی محبت کے بیان پر مشتمل ہیں۔ اس طرح انھیں عام سطح کی رومانی کہانیاں کہا جا سکتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ قیام پاکستان کے بعد اردو ناول کے بہ تفصیل مطالعہ کے لیے ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی کتاب آزادی کے بعد اردو ناول ملاحظہ کیجئے۔

۲۔ ابوذر ہاشمی، ''اردو کی خواتین ناول نگار؛ پاپولر لٹریچر کے حوالے سے'' مشمولہ، اردو میں پاپولر لٹریچر، مرتبین: ارتضیٰ کریم، اظہار عثمانی، اردو اکادمی، دہلی بار دوم ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۶

۳۔ بندھن ایک نایاب ناول ہے۔ مقالہ نگار کو اس کی ایک کاپی خوش قسمتی سے میسر آئی ہے۔ بلوچستان میں بھی بہت کم لوگ اس ناول کے بارے میں جانتے ہیں۔

۴۔ محمد شہی، مولابخش، بندھن، اسلامیہ پریس کوئٹہ، س ن، ص ۹۵

۵۔ بلوچستان کے محقق ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن نے مورخہ ۲۰ راگست ۲۰۱۶ء کو راقم سے گفتگو میں رضیہ فصیح احمد کے قیام کوئٹہ کے دوران میں آبلہ پا کے تحریر کیے جانے کی تصدیق کی۔ ان کے بقول رضیہ فصیح احمد کو اس ناول پر آدم جی کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔

۶۔ رضیہ فصیح احمد، آبلہ پا، اکادمی بازیافت، کراچی، ص ۱۳

۷۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو، کراچی، بار دوم ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۷

۸۔ رفعت زیبا، ناسور، قلات پبلشرز، ۱۹۶۸ء

۹۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۱۰۔ مبارکہ حمید، بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، نوید پبلیکیشنز، کوئٹہ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۱

۱۱۔ ایضاً، رواج، قلات پبلشرز، کوئٹی، بار دوم، ۱۹۷۳ء، ص ۹

۱۲۔ بخاری شاہین روحی، تیرے لیے، سعید پرنٹنگ پریس، کوئٹہ، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۰

۱۳۔ خلیل صدیقی، مشمولہ تیرے لیے، ص ۲۰۹

۱۴۔ عابد بخاری، مالا، گوشہ ادب کوئٹہ، ۱۹۶۸ء، ص ۷۲-۷۳

۱۵۔ یاسمین صوفی، چندا کا دل ٹوٹ گیا، الحمرا پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۶ء

۱۶۔ ایضاً، یہ سطریں جن صفحات سے اخذ کی گئی ہیں وہ بالترتیب یوں ہیں۔ص ۶۷، ۱۰۱، ۱۴۰، ۱۵۵، ۱۵۶

۱۷۔ یاسمین صوفی، عاطقہ، الحمرا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۶-۱۵۷

۱۹۔ یاسمین صوفی، تلاش، ص ۳۹۳-۳۲۵-۳۹۷-۳۹۸-۲۰۱

۲۰۔ مبارکہ حمید، ص ۹۴

۲۱۔ یاسمین صوفی امائمہ مکتبہ عالیہ، لاہور س۔ن (۱۹۸۳ء غالبًا) ص ۳۱۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۷۰

۲۳۔ یاسمین صوفی فریحہ الحمرا پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۵۴-۲۵۵

۲۴۔ فاروق احمد، اردو ادب، مشمولہ، بیسویں صدی میں بلوچستان کا ادب، مرتب: افضل مراد، قلم قبیلہ ادبی ٹرسٹ، کوئٹہ، ۲۰۰۰ء، ص ۲۱

۲۵۔ حمیدہ جبیں، دل کا شہر خالد اکیڈمی، راولپنڈی، سال ندارد، ص ۱۲۵

۲۶۔ ایضاً، راستے نسیم بکڈپو، لاہور، ۱۹۷۶ء ص ۲۲۷

۲۷۔ انور رومان، خانہ بدوش اصغر اسٹیشنرز، کوئٹہ، ۱۹۷۷ء ص ۹۳

۲۸۔ قاضی، فردوس انور، خوابوں کی بستی، شبل پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۶

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۳۰۔ فاروق احمد، بلوچستان میں اردو زبان و ادب، بولان اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۸۷

۳۱۔ جوئیہ، خالد اقبال، پڑاؤ بخاری ٹریڈرز، کوئٹہ، ۱۹۹۱ء ص ۵۰۰

۳۲۔ فاروق احمد، بلوچستان میں اردو زبان و ادب، ص ۱۹۴

۳۳۔ افسانہ و ناول نگار عذرا اصغر سے مقالہ نگار کی ٹیلی فونک گفتگو ۶ رمئی ۲۰۱۶ء کو ہوئی تھی۔

۳۴۔ ممتاز شفیع، مسز، یہ زر نگار وادیاں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۸ء

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ آغا گل،دشت میں سفر،روبی پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۸۶ء

۳۸۔ عطا شاد،سنگاب،سیلز اینڈ سروسز،کوئٹہ،۱۹۸۵ء

۳۹۔ عین سلام،چکیدہ،قلات پبلشرز،۱۹۶۸ء

۴۰۔ آغا گل،دشت وفا،کلاسیک،لاہور،۲۰۱۰ء،ص۷۲-۸۵

۴۱۔ آغا گل،بیلہ، مکتبہ الحمرا لاہور،۲۰۰۲ء،ص۲۳

۴۲۔ ایضاً،ص۲۷

۴۳۔ ایضاً،ص۷۳

۴۴۔ ایضاً،بابو،براہوی اکادمی،کوئٹہ،۲۰۰۴ء ص۶

۴۵۔ ایضاً،ص۵۳

۴۶۔ ایضاً،ص۸۹

۴۷۔ شاہد علی خان،مشمولہ،اب تک،ص۸۲

۴۸۔ آغا گل، فسانۂ جنات،مہر در،کوئٹہ،۲۰۱۶ء،ص۸

۴۹۔ راز محمد خان، دی ہولی سینرز غزنوی پبلشرز،کوئٹہ۲۰۰۷،ص۱۷

۵۰۔ عطاالحق قاسمی،پیش لفظ،خدا اور محبت،ص۱۰

۵۱۔ ہاشم ندیم،خدا اور محبت،دعا پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۱۱ء،ص۵۱

۵۲۔ ہاشم ندیم،ایک محبت اور سہی،علم وعرفان پبلشرز،لاہور۲۰۱۰ء،ص۱۸۰

۵۳۔ فارس مغل ہم جان زیب پبلشرز لاہور۲۰۱۲ء،ص۶۷

۵۴۔ حیدر،قرۃ العین،میرے بھی صنم خانے،سنگ میل،لاہور،۲۰۰۷ء،ص۲۹

۵۵۔ ایضاً، سفینہ غم دل، سنگ میل، لاہور، ۲۰۰۹ء

۵۶۔ فارس مغل، ہم جان ص۱۲۰ تا ۱۲۲

۵۷۔ ایضاً، ص۱۲۱

۵۸۔ غیب، شیر دل، آخری خط مہردر، کوئٹہ، ۲۰۱۶ء ص۶۹

۵۹۔ بحوالہ

۶۰۔ منہاج، شفیق بانو، سیلاب، قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۸۰ء، ص۷

۶۱۔ ایضاً،

۶۲۔ ایضاً، ص۱۰

جیسا کہ قوسین میں بتایا گیا ہے، مقالہ نگار کے پیش نظر اشاعت میں سے حوالے کے طور پر دیے گئے اس اقتباس میں ایک دو لفظ نہیں پڑھے جا سکتے، یہ مسئلہ کئی جگہ اور بھی سامنے آیا ہے۔ اس ناول کی اہمیت کی بناء پر اس کے ترجمے کو تدوین کے بعد دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

۶۳۔ خلیل صدیقی، پیش لفظ ویرانہء دل، ص۶

۶۴۔ کوثر، انعام الحق، ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ۱۹۹۴ء ص۵۱۱

۶۵۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر سے مقالہ نگار کی ٹیلی فونک گفتگو ۸ فروری ۲۰۱۴ء

۶۶۔ شاہ محمد مری، ''بلوچستان اور سبطِ حسن''، مشمولہ: سنگت شمارہ ا جلد ۲۰، دسمبر ۲۰۱۶ء مدیر شاہ محمد مری، سنگت اکیڈمی آف سائینسز، کوئٹہ، ص۶

۶۷۔ نسیم حجازی، محمد بن قاسم قومی کتب خانہ، لاہور، سال ندارد، ص۲۶۳۔۲۶۴

۶۸۔ مشتاق احمد نوری، ''اردو زبان کے فروغ میں پاپولر لٹریچر کا حصہ'' مشمولہ: اردو میں پاپولر لٹریچر مرتبین: ارتضیٰ کریم، اظہار عثمانی، اردو اکادمی، دہلی، طبع دوم، ۲۰۱۵ء ص۱۲۲

۶۹۔ اظہار اثر، ''مقبول عام ادب؛ اصول وضوابط'' مشمولہ: ایضاً، ص۹

۷۰۔ مقالہ نگار نے بڑی کوشش سے ان کتب کی تلاش میں کامیابی حاصل کی۔ان میں سے بیشتر ناولوں کا پہلی بار اس مقالے میں تفصیلی تعارف اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔اس سے پہلے مختلف کتب میں ان میں سے بعض ناولوں یا ان کے مصنفین کے صرف نام ملتے ہیں۔یہ کب شائع ہوئے،ان کا موضوع کیا ہے اور اسلوب کیسا ہے۔اس حوالے سے قبل ازیں ایک جملہ تک نہیں کہا گیا۔

۷۱۔ راشد انور راشد،''پاپولر لٹریچر اور فنون لطیفہ''مشمولہ: اردو میں پاپولر لٹریچر،ص ۶۱

باب پنجم:

بلوچستان میں اردو کی دیگر تخلیقی اصنافِ نثر

بلوچستان میں اردو افسانے اور ناول کے علاوہ دیگر اصنافِ نثر میں بھی یہاں کے ادباء مسلسل اپنی تخلیقات پیش کرتے رہے ہیں۔ اس آخری باب میں ایسی تمام دوسری اصناف نثر کا ارتقائی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہاں جن اصناف کو زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ ان میں ڈرامہ، خاکہ نگاری، آپ بیتی، یاداشتیں، سفرنامہ، مزاح اور انشائیہ نگاری شامل ہیں۔ ان تمام اصناف نثر کو الگ الگ پیش کیا جا رہا ہے۔

ا۔ بلوچستان میں اردو ڈرامے کی روایت

ڈرامہ بہ طور فن زمانہء قدیم سے ہر تہذیب میں موجود رہا ہے، یہ الگ بات ہے کہ شروع میں اس کے اظہار کی شکلیں مختلف رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتداء دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ادا کی جانے والی رسومات سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس فن میں ترقی ہوتی گئی اور آج یہ نہایت اعلیٰ صورت میں دنیا کے ہر ملک اور ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ بلوچستان میں اردو ڈرامے کا آغاز اسٹیج ڈرامے سے ہوا۔ انعام الحق کوثر کے مطابق کوئٹہ میں پہلی جنگ عظیم سے قبل ۰۹۔۱۹۰۸ء میں کوئٹہ میں اردو سٹیج ڈرامے کا سراغ ملتا ہے، جب غلام حیدر خان اور سید عزیز شاہ وغیرہ نے کوئٹہ ڈرامیٹک کلب کی بنیاد ڈالی۔ کوئٹہ میں آغا حشر کے لکھے ڈرامے بھی سٹیج کیے جاتے رہے ہیں۔ ان تمام ڈراموں کا تحریری ریکارڈ تلف ہو جانے کی وجہ سے میسر نہیں ہے۔ قیام پاکستان کے بعد انور رومان کا لکھا ڈرامہ ''مجاہد'' سٹیج ہوا، یہ کشمیر کے موضوع پر تھا۔ ریڈیو کا رواج ہونے اور کوئٹہ میں ریڈیو آنے کے بعد اس کے لیے کافی ڈرامے لکھے گئے مگر ایک تو ان کا متن دستیاب نہیں، دوسرا وہ ادبی ڈرامے کی ذیل میں نہیں آتے، جو اس مقالے کا اصل موضوع ہے۔ ادبی سطح پر صرف ایک ڈرامہ شیر بلوچستان لکھا گیا ہے۔ یہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ یہاں جن ڈراموں کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے، وہ ادبی ڈرامے نہیں، مگر کتابی صورت میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے ادبی ڈرامہ کہتے ہیں، وہ بلوچستان میں سراسر ناپید ہے۔ بہرحال ڈرامے کے نام پر شائع شدہ دستیاب کتب کا تعارف و تجزیہ پیش ہے۔

پہلی ڈرامہ نگار: شاہین روحی بخاری

شاہین روحی بخاری نے ایک ڈرامہ مکمل کتابی صورت میں لکھا ہے۔ اسے بلوچستان میں اردو کا پہلا مکمل ادبی ڈرامہ کہا جاسکتا ہے، جو ایک تاریخی شخصیت بی برک رند پر لکھا گیا ہے۔

شیر بلوچستان

شاہین روحی بخاری کا ڈرامہ ہے۔ اس کا ہیرو بی برک رند ہے جو بلوچوں کے چاکر اعظم سردار چاکر رند کا بھانجا اور خود ایک سردار تھا۔ وہ بلوچی کی کلاسیکی شاعری کا بھی ایک اہم نام ہے۔ یہ ڈرامہ بی برک رند سے منسوب بلوچ تاریخ کے چند اہم واقعات کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔[۱] شیر بلوچستان تین حصّوں پر مشتمل ہے ان تینوں حصوں کا مرکزی ہیرو بی برک رند ہے مگر ان میں مختلف کہانی ملتی ہے۔

پہلا حصّہ ''شیر بلوچستان'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں بی برک رند کی پیدائش خوبصورتی اور بہادری کا بیان ہے۔ اس میں کہانی یوں ہے کہ لاشاری قبیلے کا سردار بہرام بی برک رند کی ہمشیرہ سے ملنے رات کی تنہائی میں آتا ہے تو اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے بی برک رند بہرام لاشاری کے محل میں اس کی بیٹی ملی کے کمرے میں دو راتیں قیام کرتا ہے۔ اس موقع پر دونوں قبیلے خونی تصادم کی طرف بڑھتے ہیں، مگر پھر حالات ایسا رُخ اختیار کرتے ہیں کہ ملی اور بی برک رند کی شادی ہو جاتی ہے اور یوں قبائلی تصادم ٹل جاتا ہے۔

دوسرے حصّے ''شہزادی گراں ناز'' میں بی برک رند قندھار کے بادشاہ شاہ ارغوان کی بیٹی گراں ناز کو اس کے محل سے اغوا کر لاتا ہے۔ شاہ ارغوان ایک بڑے لشکر کے ساتھ بلوچستان پر حملہ آور ہوتا ہے۔ مگر جنگ سے ایک رات پہلے بی برک رند بہادری کا مظاہرہ کر کے اکیلا افغانی لشکر کی طرف جاتا ہے۔ وہ بادشاہ کے محافظوں کو قتل کر کے اس کے خیمے کے اندر چلا جاتا ہے۔ شاہ ارغوان کی نیند ٹوٹتی ہے تو وہ بی برک رند کو اپنے خیمے کے اندر موجود پاتا ہے پھر اس سے آنے کا مقصد دریافت کرتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران وہ بی برک رند کی بہادری سے متاثر ہو کر اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے کر خود صبح اپنے لشکر سمیت واپس ہو جاتا ہے۔

تیسرا حصّہ ''گوہر کی اونٹنی'' میں گوہر نامی عورت بہرام لاشاری کی حرکات سے تنگ آ کر چاکر خان کی پناہ میں چلی جاتی ہے۔ مگر لاشاری اس کے اونٹوں کو زخمی کر کے چاکر کے قہر کو آواز دیتے ہیں۔ دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ ہوتی ہے جس میں رند قبائل کے سات سو نوجوان ہلاک ہو جاتے ہیں پھر چاکر رند ہرات کے بادشاہ، شجاع الدین سے مدد کی درخواست کرتا ہے اس کی مدد ملنے پر لاشاری کمزور پڑ جاتے ہیں اور پنجاب کی طرف ہجرت کر

جاتے ہیں اور یوں لاشاری قبیلے کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔

شیر بلوچستان کا پلاٹ بلوچ تاریخ کے بعض تاریخی واقعات پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے میں فن ڈرامہ کے لازمی عناصر موجود ہیں، کہ اس میں منظر نگاری بھی ہے، کردار نگاری اور مکالمہ بھی ہے۔ کہانی آغاز سے ارتقاء کی طرف جاتی نظر آتی ہے۔ اس میں سسپنس بھی ہے اور کلائمکس بھی۔ یہ ڈرامہ اگرچہ فنی حوالے سے اس قدر مضبوط نہیں تاہم بعض تاریخی کرداروں کو موضوع بناتا ہے اگر یہ تصور کیا جائے کہ یہ بلوچستان جیسے علاقے میں ایک خاتون نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں لکھا تھا تو اس کی کمزوریوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

اسلوب

شاہین روحی بخاری افسانہ نگار اور صحافی ہیں۔ انھیں سادہ، رواں اور شستہ اُردو لکھنے پر عبور حاصل ہے۔ زبان کی بنیاد پر اگر دیکھا جائے تو اس ڈرامے میں کوئی خامی نظر نہیں آتی صرف ابتداء میں ایک آدھ لفظ انگریزی کا ملتا ہے مثلاً پریکٹس جو گراں گزرتا ہے۔ جس عہد کا یہ ڈرامہ ہے یعنی سولہویں صدی کا اور اس کا لوکیل سبی کا ہے۔ اس میں بی برک رند سے ایک ایسا لفظ کہلوانا مناسب نہیں۔ اس کے سوا کوئی لفظ یا جملہ قاری پر گراں نہیں گزرتا بلکہ مختلف کرداروں کے مرتبے اور سماجی حیثیت کے لحاظ سے مصنفہ نے لہجے کے اتار چڑھاؤ اور لفظیات کے انتخاب میں خاص مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ ڈرامہ بلوچستان کی ادبی تاریخ کا پہلا مکمل اردو ڈرامہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔

گرد باد

اوریا مقبول جان کا ٹی وی کے لیے لکھا جانے والا ڈرامہ ہے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔[۲] اس لیے اسے ادبی ڈرامہ نہیں کہا جا سکتا نہ ہی یہ ادبی ڈرامے کے فن پر پورا اُترتا ہے۔ اس کی کہانی بھی روایتی ہے یعنی فلموں والی۔ یہ ایک قبائلی سردار زور آور خان کی کہانی ہے جس کی شادی کے ایک عرصے یعنی قریباً دس سال کے بعد بھی کوئی اولاد پیدا نہیں ہوتی اور وہ اپنی وسیع جائیداد کا وارث نہ ہونے پر پریشان ہوتا ہے۔ زور آور خان کا چھوٹا بھائی فاروق خان علاقے میں مائن نکالنے والی کمپنی سے سردار کا حصّہ وصول کرنا شروع کرتا ہے جو اس کے بڑے بھائی زور آور خان کو اچھا نہیں لگتا اور وہ اسے پنجاب میں اپنی زمینوں کے کاغذات دے کر وہاں روانہ کر دیتا ہے۔ گویا علاقہ بدر کر دیتا ہے۔ وارث پیدا کرنے کے لیے زور آور خان دوسری شادی کرتا ہے۔ تب اس کی دونوں

بیویوں کے یکے بعد دیگرلڑکے پیدا ہوتے ہیں۔گرد باد ان دو بچوں کی آپس میں اور اپنے چچا فاروق خان کے ساتھ جائیداد کے لے ہونے والی کشمکش کی کہانی ہے۔اس ڈرامے کی اہم بات بلوچستان کا لوکیل کردار نگاری میں مقامیت کا عنصر اور کرداروں کی زبان میں مقامی لہجے کی موجودگی ہے مثلاً ایک جگہ ایک دیہاتی تانگے والے سے مخاطب ہوکر کہتا ہے،''تم ایسے ہی غم کرتا ہے''[۳] اور یا پھر فاروق خان کا اپنے بڑے بھائی سے یہ کہنا کہ ''ادا میری بات تو سنیں۔'' وغیرہ[۴]

اجنبی

منیر احمد بادینی کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے۔ یہ بھی اصل میں ٹی وی کے لیے لکھا گیا تھا مگر کسی وجہ سے اس کی ریڈیائی تشکیل نہ ہو سکی تھی۔اس بارے کتاب کے آغاز میں بتایا گیا ہے۔[۵] چونکہ یہ ڈرامہ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس لیے اس مقالے میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ورنہ یہ ایک کمزور ڈرامہ ہے۔یہ ڈرامہ ایک نوجوان لڑکے امین اور لڑکی ساحرہ کی عشقیہ داستان پر مشتمل ہے۔دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں مگر پھر ساحرہ اپنے والدین کی خواہش پر دوسری جگہ شادی کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے اور اسی پر ڈرامے کا اختتام کیا گیا ہے۔اس ڈرامے کا لوکیل لاہور ہے مگر ایک آدھ جگہ مرکزی کردار کوئٹہ جانے کا سرسری تذکرہ کرتے ہیں۔اس کی کہانی تو کمزور ہے ہی مکالمہ نگاری سطحی انداز میں کی گئی ہے۔اس لیے اس کو پورا پڑھنا بھی ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔چنانچہ اس میں کسی گہری بات کے بارے میں سوچنا یا توقع رکھنا بے جا ہے۔

۲۔ بلوچستان میں خاکہ نگاری

خاکہ دراصل کم سے کم الفاظ میں کسی شخص کے بنیادی اوصاف و معائب اس انداز میں بیان کرنے کو کہتے ہیں کہ اس سے موضوع خاکہ کی شخصیت کے اہم خدوخال نمایاں ہو جائیں۔خاکہ انگریزی لفظ سکیچ کا لفظی ترجمہ ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں۔''ادب کی جس صنف کے لیے انگریزی میں سکیچ یا پن پورٹریٹ Pen-Portriat کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔اردو میں اسے خاکہ کہتے ہیں۔''[۶]

خاکہ نگاری کو لفظوں کی مصوری بھی کہتے ہیں کہ مختصر الفاظ میں موضوع خاکہ کی تصویر دکھادی جاتی ہے۔خاکہ کا بنیادی وصف اختصار ہے مگر اس میں محاسن کے ساتھ ساتھ کسی شخصیت کے اخلاقی معائب اور اہم عادات بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔

بلوچستان میں قیام پاکستان کے ایک طویل عرصے بعد یہاں کے بعض لکھنے والوں نے اپنے دوستوں کے خاکے لکھے ہیں۔اب تک گنتی کی دو چار کتب خاکہ نگاری کی شائع ہوئی ہیں۔ان کتب کا بہ دقت نظر مطالعہ بتا تا ہے کہ ان کے مصنفین خاکہ نگاری کے بعض اہم اور بنیادی اصولوں سے واقف نہیں،انھوں نے اپنے دوستوں کے خاکے تو لکھے ہیں مگر ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' کے مصداق ان خاکوں میں شخصیات کے اہم خدوخال بہ مشکل ہی اُجاگر ہوتے ہیں مگر البتہ ان تحریروں میں کہیں کہیں خاکہ کے بعض اجزا ضرور نظر آتے ہیں۔ذیل میں بلوچستان میں خاکہ کے حوالے سے شائع ہونے والی کتب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

برعکس

وحید زہیر کے خاکوں کا پہلا مجموعہ ہے اور بلوچستان میں خاکہ نگاری کی اولین مطبوعہ کتاب ہے۔کُل ۱۰۷ صفحات کی اس کتاب میں ۳۸ خاکے شامل ہیں۔اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ مختصر خاکے ہیں۔اگر انھیں خاکے کہا جائے تو کیوں کہ یہ خاکے کی تعریف پر مکمل طور پر پورا نہیں اُترتے۔اس کتاب میں پہلا خاکہ مست توکلی پر لکھا گیا ہے جو انیسویں صدی کا بلوچی شاعر تھا۔وحید زہیر کے خاکوں میں اور تو سب کچھ ملتا ہے مگر زیر بحث شخص کی شخصیت اکثر اوقات نظر انداز ہوجاتی ہے۔تمام خاکوں میں ممدوحین کی حد سے زیادہ ستائش ملتی ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر شخصیات مختلف حوالوں سے بلوچستان کی معتبر اور نامور شخصیات میں شامل ہیں۔اگر چہ ان کی شہرت کا بنیادی حوالہ ادب ہی ہے مگر ادب کے علاوہ بھی یہ لوگ سیاسی یا سماجی حوالے سے اہم مقام رکھتے ہیں۔اس لیے مصنف ان سے کافی متاثر نظر آتا ہے۔ان تحریروں میں ممدوحین کے شخصی اوصاف میں مماثلت پائی جاتی ہے۔کسی بھی شخص کی انفرادیت کھل کر سامنے نہیں آتی۔

وحید زہیر کلاسیکی انداز کی نثر لکھتا ہے۔وہ خاکہ لکھتا ہے مگر قریباً قریباً ہر مضمون میں کئی کئی سطریں قافیہ بندی میں صرف کر جاتا ہے۔مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے۔''راہی انگریزی کے دلدادہ براہوئی کے پا پیادہ اور اردو کے دادا تھے۔''[ے] اس طرح کی قافیہ بندی میں وہ اپنے ممدوحین کے خاکوں میں ان سے انصاف نہیں کرپاتا۔نہ ہی یہ قاری کو شخصیت کے بنیادی اوصاف سے روشناس کرتے ہیں۔

برملا

وحید زہیر کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے اس میں ۳۱ خاکے شامل ہیں۔انھیں تاثراتی خاکے کہا گیا ہے۔ان

میں علامہ اقبال، شاہ لطیف بھٹائی، فیض اور یوسف عزیز مگسی کے حوالے سے مضامین کو خاکہ نہیں کہا جا سکتا۔ تاثراتی خاکوں میں بھی شعرا اور ادباء کے فن پر بات کی گئی ہے اور شعری مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو دراصل وہ تعارفی مضامین ہیں جو مختلف کتابوں کے پیش لفظ کے طور پر لکھے گئے تھے جو بعد میں خاکے کے طور پر اس کتاب میں شامل کیے گئے۔ مثلاً طاہر محمد خان کا خاکہ جو اس کتاب میں ''ماسک کے بغیر ایک دانشور'' کے عنوان سے شامل ہے، طاہر محمد خان کے افسانوی مجموعے زود پشیماں میں ''ماسک سے محروم دانشور'' کے عنوان سے موجود ہے۔ عنوان کے ایک دو لفظوں کے علاوہ دونوں تحریروں میں سرِ مو فرق نہیں۔ اس لیے انھیں مکمل طور پر تاثراتی خاکے نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ کہیں کہیں تاثراتی خاکے کے کچھ عناصر بہرحال مل جاتے ہیں۔ ان خاکوں میں ممدوحین کے حوالے سے عمومی باتیں تو ملتی ہیں مگر کسی شخص کے ذاتی اوصاف و معائب نظر نہیں آتے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ سب لوگ ایک جیسی شخصیت کے مالک تھے۔ وحید زہیر نے یہ خاکے لکھتے ہوئے بھی مقفٰی و مسجع نثر لکھنے کی سعی کی ہے۔

وفا کا تذکرہ

یہ شاہ محمد مری کا بلوچستان اور بلوچستان سے باہر کے کچھ دوستوں کے خاکوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ اس میں کل ۱۹ شخصیات کے خاکے اور تاثراتی مضامین ہیں۔ بلوچستان کے اہم لوگوں میں کوکو یعنی عالیہ اسما، طاہر محمد خان، عطا شاد اور ڈاکٹر امیر الدین شامل ہیں۔ بیرون بلوچستان کے لوگوں میں مشتاق احمد یوسفی، افتخار عارف، احمد فراز اور فخر زمان جیسے اہم لوگ ہیں۔ اس کتاب کے پہلے چار خاکے خواتین پر ہیں ان میں کوکو فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن اور شبینہ رفعت وغیرہ ہیں۔ ان خاکوں میں ایک نام علامہ عبدالعلی اخوندزادہ کا ہے۔ اسے دراصل مضمون کہنا چاہیے کہ علامہ اخوندزادہ ایک عرصہ قبل وفات پا چکے تھے کوکو انہی کی صاحبزادی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان خاکہ نما مضامین میں کم تحریریں ایسی ہیں جو خاکہ کی تعریف پر پوری اترتی ہیں کیونکہ مصنف نے بعض جگہ ان کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس وجہ سے یہ خاکے کی بجائے تنقیدی مضامین بن گئے ہیں۔ ان تحریروں میں جو مضامین، خاکے کی تعریف پر کسی حد تک پورا اترتے ہیں۔ ان میں کوکو عالیہ اسماء، مشتاق احمد یوسفی، افتخار عارف، سائمن غلام قادر اور ڈاکٹر امیر الدین کے خاکے شامل ہیں۔ شاہ محمد مری نے ان حضرات کے خاکے لکھتے ہوئے جا بجا اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ان کو پڑھ کر نہ صرف ان حضرات سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان کی محفل میں بیٹھا ہو اور ان سے اس کا ایک خاص ربط ہو۔ شاہ محمد مری زیر بحث شخصیت کے حوالے سے جملہ سازی

کی مہارت بھی رکھتے ہیں۔ افتخار عارف کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''افتخار عارف انسائیکلو پیڈیائی دماغ رکھتا ہے اسے بات کا فن آتا ہے۔ بخیل سے بخیل بیوروکریٹ بھی اس کی فائل پر اس کی منشا کے مطابق دستخط کر ڈالنے پر تیار ہوجاتا ہے۔''[۸]

اسی طرح ڈاکٹر امیر الدین کے حافظے اور ان کی شعر گوئی کے بارے میں کہتے ہیں: ''موقع کی مناسبت سے اس کی یادداشت کا کمر بند ہمیشہ اشعار کے کارتوسوں سے بھرا ہوتا ہے''۔[۹]

اس طرح کے جملے نہ صرف ان حضرات سے ان کے بے تکلف تعلقات کا ثبوت ہیں بلکہ یہ لکھنے والی کی قابلیت اور تخلیقی اپچ کی ایک خوبصورت مثال بھی ہیں۔ کتاب میں شامل وہ مضامین جو تنقیدی مطالعات کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ ان میں بھی بعض جگہ شخصیت کا احوال دلچسپ انداز میں بیان ہوا ہے۔

عشاق کا قافلہ

شاہ محمد مری کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں چار خاکے پہلے مجموعے کے بھی شامل ہیں جبکہ ۱۴ نئے خاکے ہیں۔ ان میں سے بعض خاکے تعارفی مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً انوار احمد، گوہر ملک، جاوید اختر اور محمد علی صدیقی وغیرہ پر لکھی ہوئی تحریریں خاکے کی تعریف پر پورا نہیں اُترتیں۔ اسی طرح ڈاکٹر فہمیدہ حسین، اکبر بارکزئی، واحد بشیر اور افضل توصیف پر لکھی گئی تحریریں بہت مختصر ہیں۔ یہ صرف دو دو صفحات پر مشتمل ہیں اور ان میں بھی خاکے کے عناصر بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل اہم خاکے محمد سرور، انوار احسن صدیقی، عزیز مینگل، خلیل صدیقی اور کسنڈرا بالچن کے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض میں ایک طرح کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جلدی میں ان خاکوں کو ادھورا چھوڑ دیا گیا ہو اور زیر بحث شخصیت کا پورا عکس تحریر میں درآنے سے رہ گیا ہو۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کے تعارفی مضامین کے طور پر لکھی گئی تحریروں میں بھی خاکے کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً محمد علی صدیقی کے حلیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> محمد علی صدیقی بہت زیادہ سانولے رنگ کا لحیم شحیم شخص تھا۔ ایسا چوڑا سینہ جیسے انگریزی فلموں میں ٹارزن کا ہوتا ہے۔ بڑا سا چہرہ، چشمہ کے پیچھے دو چمکتی زیرک آنکھیں ایدھی امین ٹاپ کی چیز، موغا بے جیسا شخص۔[۱۰]

اسلوب

شاہ محمد مری اردو میں رواں اور چست جملے لکھنے پر خاصی قدرت رکھتا ہے۔ اس کی تحریر میں لفظ اور جملے کی ساخت میں بے باکی کا عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ وہ کئی جگہ بلوچی اور دوسری زبانوں کے الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال بے تکلف استعمال میں لاتا ہے اور جملہ لکھنے میں اہلِ زبان کی بجائے اپنا لہجہ دریافت کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اس لیے اس کی تحریروں میں ایک الگ رنگ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے اس کا اسلوب ایک طرح کی شخصی انفرادیت رکھتا ہے جو بعض موقعوں پر تو گراں مگر اکثر اوقات بھلی لگتی ہے۔ تخلیقی نثر نہ لکھنے کے باوجود اردو کے کے لہجے کو پاکستان کی دھرتی سے آشنا کرنے میں شاہ محمد مری کے قلم کا کردار ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہی اس کی نثر کی اہم خاصیت ہے۔

رفتارِ حیات

افسانہ نگار جمیل زبیری کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل بارہ خاکے شامل ہیں۔ مصنف کا آبائی تعلق مارہرہ شریف سے ہے۔ اس لیے اس میں ابتدائی خاکے مارہرہ شریف کے لوگوں کے ہیں جن میں ان کے خاندان کے لوگ بھی ہیں مثلاً پہلا خاکہ صدیق مارہروی کا ہے جو ان کے نانا تھے اور تلمیذ داغ احسن مارہروی کے شاگرد تھے۔ باقی کے خاکے ایسے لوگوں کے ہیں جن کے ساتھ مصنف کا تعلق ریڈیو پاکستان میں ملازمت کے دوران بنا۔ یہ لوگ ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل، پروڈیوسر اور صداکار وغیرہ ہیں۔ جمیل زبیری کے اپنے خاندان کے لوگوں سے متعلق خاکے زیادہ دلچسپ نہیں۔ ان میں سے ایک خاکہ بادشاہ میاں، تو ان کے افسانوی مجموعے زرد پتے میں بعنوان 'وہ کاغذی پھول جیسے چہرے' افسانے کے طور پر شامل ہے۔ رفتارِ حیات میں شامل خاکوں میں سے طاہر شاہ، ناصر جہاں اور حسینہ بیگم کے خاکے خاصے دلچسپ ہیں۔ جن کو پڑھتے ہوئے قاری کو ان لوگوں سے ہمدردی ہو جاتی ہے اور وہ ان کو اپنی آنکھوں کے آگے چلتا پھرتا اور جیتا جاگتا محسوس کرتا ہے۔ حسینہ بیگم کے خاکے میں کوئٹہ کے لوکیل اور زندگی کی عکاسی بھی ملتی ہے۔[11] مصنف کا انداز بیان سادہ، رواں اور دلچسپ ہے۔

یہ پیارے لوگ

شاہدہ بخاری کا بلوچستان کے اہل قلم اور دیگر لوگوں کے خاکوں پر مشتمل مجموعہ ہے مگر اس میں شامل مضامین کسی طور خاکے کی تعریف پر پورا نہیں اُترتے۔ انھیں زیادہ سے زیادہ تعارفی یا سوانحی مضامین کہا جا سکتا ہے۔ ان

مضامین میں شخصیات کے تعارفی تذکرے کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی و علمی خدمات اور کتابوں کا تعارف بھی شامل ہے۔ ان میں ایک مضمون مادرِ ملت فاطمہ جناح پر بھی ہے جبکہ سجاد بخاری والا مضمون مصنفہ نے اسی کی زبانی لکھا ہے۔[۱۲]

شاہدہ بخاری اگرچہ سادہ نثر لکھتی ہیں مگر اس کی تحریر میں ادبی شان بہت کم نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس ہر مضمون کی عبارت میں تکرار اور غیر ضروری باتیں زیادہ ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین میں اس کا اسلوب خاصا غیر دلچسپ، بے ربط اور بے مزہ ہے قاری بمشکل ہی ان کی قرأت پر خود کو آمادہ کر پاتا ہے۔

۳۔ بلوچستان میں اردو آپ بیتی/یادداشتیں

دنیا بھر میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہم لوگ آپ بیتی اور یادداشتیں لکھتے رہے ہیں۔ جو نہایت ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے ادب میں آپ بیتیوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جو مستقل اہمیت اور وقعت کا حامل ہے۔ کسی بھی آپ بیتی کے مطالعے سے عام لوگوں کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ بلوچستان میں بھی بعض نہایت اہم آپ بیتیاں اور یادداشتیں لکھی گئی ہیں۔ ان کا تعارف اور تجزیاتی مطالعہ آگے بہ تفصیل پیش کیا جاتا ہے۔

کھیم کرن تا مونا باؤ

یہ کتاب امداد نظامی کی ۱۹۶۵ء کی جنگ کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ جہاں وہ جنگی رپورٹر بن کر محاذ کے اگلے مورچوں تک گئے تھے۔ امداد نظامی شاعر بھی تھے انھیں عملی صحافت میں عمر بسر کرنے کی بدولت تحریر پر استادانہ قدرت حاصل تھی۔ اس وجہ سے جنگ سے متعلق ہونے کے باوجود ان کی یہ تحریر ادبی لطف رکھتی ہے۔ امداد نظامی کو اس جنگ کے دوران میجر عزیز بھٹی شہید اور دوسرے عام فوجیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا جن کی جرات، عزم اور ہمت کی داستان انھوں نے نہایت مؤثر پیرائے میں بیان کی ہے۔[۱۳] ان یادداشتوں میں جنگ کے دوران پیش آنے والے ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جو انھوں نے خود دیکھے تھے یا جس کا احوال انھیں ان لوگوں سے ملا جن پر وہ واقعات بیتے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے اگلے محاذ پر لڑنے والے عام سپاہیوں، فوجی افسروں، صحافیوں اور عام شہریوں کی قربانیوں اور اپنے ملک و وطن کے دفاع کے لیے جان نچھاور کرنے والے شہیدوں کی داستان کو انھوں نے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کی کتاب کھیم کرن تا مونا باؤ اس حوالے سے ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں جگہ

جگہ پاکستانی فوجیوں کی جرات، ہمت اور بلند کردار کی داستان ملتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں ہندو فوجیوں کی بزدلی اور بدکرداری کے واقعات ملتے ہیں۔ اس کی تائید اور تصدیق وہ بی بی سی کے عالمی شہرت یافتہ جنگی صحافی رے میلوتی کی آراء سے کرتے ہیں جو وہ پاکستان اور انڈیا کے فوجیوں کے حوالے سے چشم دید واقعات کے طور پر کرتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے یہ مختصر یادداشتیں اپنے اندر غور و فکر کا کافی سامان لیے ہوئے ہیں۔ مصنف کا انداز بیان خاصا رواں اور دلچسپ ہے اور چونکہ وہ اس جنگ سے ایک جذباتی تعلق رکھتا ہے لہٰذا اس کی تحریر میں جذبات و احساسات کو انگیز کرنے کا ملکہ پایا جاتا ہے۔ کئی جگہ پر وہ اس بات پر شکوہ کناں نظر آتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران قوم جس طرح مستعد تھی آج نہیں ہے۔ اس یادداشت کی وجہ تحریر بھی یہی ہے کہ قوم کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے اور اس میں ایثار، اتحاد اور اتفاق کا جذبہ بیدار کیا جائے تاکہ ملک اور قوم ترقی کر سکیں۔

لٹ خانہ

عبداللہ جان جمالدینی کی تصنیف ہے اسے باضابطہ آپ بیتی یا سرگزشت نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں شامل تحریروں کو یادداشتیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ مضامین پہلے ماہنامہ سنگت کوئٹہ میں شائع ہوتے رہے۔ بعد میں ان مضامین کو کتابی شکل دی گئی۔

لٹ خانہ اگرچہ معروف معنوں میں آپ بیتی نہیں مگر اس میں آپ بیتی کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے اور دوستوں کے ایک حلقے کے ساتھ گزرنے والے پچاس سال سے زائد عرصے کو قلمبند کیا ہے۔ لٹ خانہ کیا ہے اس کی وضاحت عبداللہ جان جمالدینی نے اولین مضمون میں یوں کی ہے۔ ”لٹ خانہ داستان ہے بلوچستان میں ترقی پسندی اور روشن خیالی کی تحریک کی۔ جس کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا تھا۔ جہاں سے یہ چشمہ پھوٹا، اس کا نام لٹ خانہ پڑ گیا۔“ [۱۴]

لٹ خانہ دراصل کوئٹہ کی ایک گلی میں واقع اس چھوٹے سے مکان کا نام پڑ گیا جہاں عبداللہ جان جمالدینی اپنے ساتھیوں کمال خان شیرانی، انجم قزلباش اور ڈاکٹر خدائیداد وغیرہ کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ سب لوگ بلوچستان کی اُس پہلی نسل سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے جدید تعلیم حاصل کی۔ عبداللہ جان جمالدینی اور کمال خان شیرانی بی۔اے کرنے کے بعد اس وقت تحصیلدار ہو گئے تھے۔ ترقی پسندانہ خیالات کی بناء پر ان لوگوں نے اپنی نوکریاں چھوڑ دیں اور خود کو بلوچستان میں ایک ترقی پسند اور روشن خیال معاشرے کے قیام کے لیے وقف کر دیا۔

ایک طویل عرصہ تک یہ لوگ صرف مطالعہ کرتے اور مختلف جگہوں پر سٹڈی سرکل کرتے رہے جہاں معاشرے کے مختلف طبقوں کے ساتھ ان کی گفتگو ہوتی۔ یہ لوگوں کو ذہنی اور فکری طور پر بیدار کرنے میں منہمک رہے۔ اس دوران کیا کیا واقعات پیش آئے۔ یہ کتاب ان واقعات کی دلچسپ روداد ہے جو بار بار پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بلوچستان کی ہمعصر ادبی اور سماجی تاریخ کو سمجھنے کے لیے لٹ خانہ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اسلوب

عبداللہ جان جمالدینی شگفتہ انداز میں سادہ اور رواں نثر لکھنے پر قادر ہیں۔ جس کا عملی اظہار یہ کتاب ہے۔ یہ کتاب اس دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے جو قاری کو اس کے مطالعے پر اُکساتی ہے۔ جمالدینی کا طریقہ عبارت لکھنے کا نہیں بلکہ قصہ بیان کرنے یا داستان سنانے کا ہے۔ اس لیے اس کی قرأت میں داستان کا سا لطف ملتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف فارسی شعراء کے اشعار ملتے ہیں۔ جس سے مصنف کی کلاسیکی فارسی شاعری کی روایت سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال سے خصوصی لگاؤ کا حال اور ان کے فارسی اشعار بھی دیے گئے ہیں۔

یاداشتیں

ملک فیض محمد یوسفزئی کی تصنیف ہے۔ ملک فیض محمد بلوچستان کے معروف سماجی اور قبائلی راہنما ہیں۔ وہ قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں بلوچستان کے سماج اور سیاست میں کافی متحرک رہے۔ ان کے ہمعصروں میں بلوچستان کی تمام اہم اور بڑی شخصیات شامل ہیں۔ ان میں یوسف عزیز مگسی، عبدالعزیز کرد، غوث بخش بزنجو، صمد خان اچکزئی، محمد حسین عنقا اور گل خاں نصیر وغیرہ شامل تھے۔ فیض محمد یوسفزئی کی کتاب یاد داشتیں قیام پاکستان سے قبل بلوچستان کے سیاسی و سماجی حالات کا تذکرہ ہے۔[۱۵] انھوں نے تفصیل سے بلوچستان میں قوم پرست سیاست کے آغاز، قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی اور سیاست میں اس کی جدوجہد پر روشنی ڈالی ہے۔ اس احوال میں درج بالا شخصیات کا ذکر تو آیا ہی ہے۔ یادداشتیں کا نصف سے زیادہ حصّہ ان اور دیگر شخصیات کے انفرادی احوال پر بھی مشتمل ہے۔ یہ کتاب بلوچستان کی سیاست وسماج کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ فیض محمد یوسفزئی کا اسلوب سادہ، رواں اور شستہ ہے جس نے اس کتاب کو قرأت کے لیے دلچسپ بنا دیا ہے۔ بعض جگہ مقامی زبانوں کے الفاظ اور اردو و فارسی کے اشعار بھی ملتے ہیں۔

آپ بیتی بلوچستان بیتی

یہ محمود علی شاہ کی آپ بیتی ہے۔ان کا تعلق بلوچستان کے ضلع جھل مگسی کے علاقے گنداواہ سے ہے۔اس آپ بیتی میں انھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر بلوچستان میں ابتدائی، ثانوی اور سکینڈری تعلیم کا حال لکھا ہے۔ پھر ایم۔اے کرنے کے بعد وہ کراچی گئے وہاں جس طرح انھوں نے وقت گزارا اس کے بعد پہلے وہ بلوچستان کے مختلف کالجز میں لیکچرار لگے اور پھر بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں تعینات ہوگئے۔محمود علی شاہ نے اپنی مدت ملازمت اور اس دوران پیش آمدہ حالات و واقعات نہایت دلچسپ انداز میں لکھے ہیں۔ بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ کے مختلف وائس چانسلرز کو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جبکہ وہ اردو کے ممتاز ادیبوں ڈاکٹر احسن فاروقی اور مجتبیٰ حسین کے بھی قریب رہے۔جن کا تذکرہ انھوں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے کیا ہے۔[۱۶]

انھوں نے نہایت شگفتہ اور رواں اسلوب میں اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو سمویا ہے۔اس کے مطالعہ سے ایک خاص دور کے بلوچستان اور اس کے نہایت اہم ادارے کے بارے میں وافر معلومات ملتی ہیں۔آپ بیتی کے آخر میں بلوچستان میں تعلیم، سیاست مخلوط حکومتیں اور بلوچ معاشرے کے مختلف موضوعات پر مضامین کو بھی اس آپ بیتی کا حصّہ بنایا گیا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے

آپ بیتی، سفرنامہ، سیاحت اور حقائق سیف الدین بوہرہ کی کتاب ہے اس میں انھوں نے آپ بیتی بھی لکھی ہے اور جو سفر اختیار کیے ان کا حال بھی لکھا ہے۔اس میں بلوچستان اور پاکستان کی سیاست اور سیاسی حقائق بھی بیان کیے گئے ہیں۔اس لیے اس کتاب کا ذیلی عنوان آپ بیتی، سفرنامہ سیاست اور حقائق لکھا گیا ہے۔ایسا بھی ہوتا ہے کا ابتدائی حصّہ کوئٹہ اور بلوچستان میں مصنف نے اپنے خاندان کی آمد، پیدائش، ابتدائی تعلیم، خاندان اور پھر نوجوانی کے زمانے میں سیاست سے وابستگی کے حال تفصیل سے لکھا ہے۔سیف الدین بوہرہ ون یونٹ کے زمانے میں بلوچستان میں نیپ کے خزانچی تھے۔اس لیے گرفتار بھی کیے گئے تھے۔[۱۷] اس کتاب کا ایک حصّہ سیف الدین بوہرہ کے بعض اسفار کی یادداشتوں پر مشتمل ہے جسے انھوں نے سفرنامہ کہا ہے۔

ان یادداشتوں کو سفرنامہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ون یونٹ کے زمانے میں سخت حالات کے باعث پاکستان سے فرار ہوئے تھے۔اس میں کابل تہران اور یوگوسلاویہ سمیت یورپ کے بعض شہروں اور ملکوں کا مختصر حال ہے۔

سیاست اور حقائق کے زمرے میں آنے والی تحریروں میں پاکستان سیاست سے ایرانِ انقلاب تک تبصرے ملتے ہیں۔اس کے علاوہ اس میں قرون وسطیٰ کے انگلستان اور ترکی کے عثمانی سلطانوں کا احوال بھی دیا گیا ہے۔غرض اس کتاب کو کسی ایک موضوع سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔سیف الدین بوہرہ نے مختلف موضوعات پر لکھ کر اور انہیں ایک کتاب میں سمو کر ایک ملغوبہ بنالیا ہے۔مصنف کا انداز بیان رواں اور سادہ ہے۔مروجہ تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود وہ سادہ اور رواں نثر لکھتے ہیں اور عبارت میں کہیں جھول نہیں ہوتا۔

۴۔ بلوچستان میں اردو سفر نامہ

اردو نثر کی مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں سفر نامے بھی لکھے گئے ہیں۔بلوچستان کے ادیبوں اور صحافیوں کو جب کبھی ملک سے باہر جانے کا موقع ملا تو ان میں سے کئی لوگوں نے وطن واپسی پر اپنے سفر کا حال لکھا ہے۔یہ بات دلچسپ ہے کہ بلوچستان میں جس قدر سفر نامے لکھے گئے ہیں وہ سب ان اہل قلم کے ہیں جنھیں سرکاری وفد یا کسی این جی او کی طرف سے باہر جانے کی دعوت اور موقع ملا۔ایک بھی سفر نامہ ایسا نہیں ہے جس کے لکھنے والے نے دنیا دیکھنے کی غرض سے سفر اختیار کیا ہو اور اس کا مطمع نظر سفر نامہ نگاری ہو،یعنی کسی لکھاری نے اس صنف نثر کو شعوری طور پر اختیار نہیں کیا۔یہاں جو سفر نامے لکھے گئے ہیں ان میں ایشیاء اور یورپ کے ملکوں کے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے۔بلوچستان میں اردو سفر نامے کا ارتقائی مطالعہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

یورپ میں آٹھ ہفتے

صاحبزادہ نعمت اللہ کا سفر نامہ یورپ ہے۔نعمت اللہ شعبہ طب سے منسلک رہے ہیں۔انھیں آٹھ ہفتوں کے لیے طبی علوم کے تحقیقی سلسلے میں پاسچر انسٹی ٹیوٹ پیرس جانے کا موقع ملا۔ جہاں انھوں نے چند ہفتے اس مشہور انسٹی ٹیوٹ میں گزارے۔اس سفر نامہ میں زیادہ تر روداد فرانس کے شہر لیل جہاں یہ انسٹی ٹیوٹ قائم ہے اور پیرس کی ہے جبکہ آخری چند صفحات میں ایمسٹرڈیم اور لندن کی سیر کا مختصر احوال رقم ہے۔

مصنف نے اپنے سفر نامہ کا آغاز کوئٹہ ائیر پورٹ پر روانگی سے کیا اور کراچی میں چار روزہ قیام اور ویزے کے حصول میں باگ دوڑ کی تفصیل بھی لکھی ہے۔اس کے بعد انھوں نے کراچی سے براستہ دبئی،قاہرہ اور فرنیکفرٹ پیرس پہنچنے کی روداد تمام تر جزیات سمیت لکھی ہے جس میں مسافروں کا تعارف ان سے ہونے والی گپ شپ، طیاروں کی روانگی کے اوقات،سروس کا معیار،ائیر پورٹ سے ہوٹل تک جاتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بات

چیت، ان کے رویے اور لبارٹری میں کام کرنے والے ساتھیوں کا تعارف شامل ہے۔ ان میں سے بعض باتوں کی تفصیل غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے پیش آمدہ حالت وواقعات سے بے لاگ انداز میں بیان کیے ہیں۔ کہیں کہیں تو اس پر ایک روزنامچے کا احتمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نعمت اللہ کی مادری زبان پشتو ہے مگر بچپن میں فارسی اور عربی کی تعلیم اور پھر کراچی میں ایک عرصہ قیام کی بدولت انھیں اردو پر خاصا عبور ہے۔ ان کی تحریر میں کسی قسم کی خامی نظر نہیں آتی بلکہ اس میں جا بجا فارسی اشعار اور عربی محاورات کے استعمال سے ادبی زبان کی چاشنی ملتی ہے۔

سحر انگیز مشرق

ڈاکٹر نعمت اللہ کا دوسرا سفرنامہ ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ مشرق کے چند شہروں اور ملکوں کے احوال پر مشتمل ہے۔ یہ سفر مصنف نے ایک تعلیمی دورے کے طور پر سرکاری وفد کے ہمراہ کیا تھا۔ جس کی روداد اس سفرنامے کی صورت میں سامنے آئی۔ سحر انگیز مشرق میں جن شہروں یا ملکوں کا تذکرہ ہے ان میں بینکاک، سنگاپور، فلپائن، ہانگ کانگ، شنگھائی اور بیجنگ شامل ہیں۔ اس سفرنامے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مصنف نے صرف چشم دید حالات وواقعات بیان نہیں کیے بلکہ تمام شہروں کے بارے لکھے گئے الگ الگ ابواب میں پہلے ان شہروں کی قدیم تاریخ بھی مختصر طور پر بیان کی ہے۔ ایسے تمام حصّے تاریخ کے بیان پر مشتمل ہونے کی وجہ سے خاصے خشک ہیں۔ شاید ایسا کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تمام شہروں میں زندگی کے مختلف رنگوں کو بے کم وکاست بیان کیا ہے۔ صاحبزادہ نعمت اللہ صاحب ذوق اور شریف النفس انسان ہیں۔ وہ ہر منظر تحیر کی آنکھ سے دیکھتے اور اپنے قاری کو دکھاتے ہیں۔ ان کی زبان میں چٹخارہ نہیں ملتا۔ وہ ان شہروں کی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر افسوس کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک خاص جاذبیت پائی جاتی ہے۔ اس میں ان شہروں کے احوال سے زیادہ ان کا انداز بیان متاثر کن ہے۔ پہلے سفرنامے یورپ میں آٹھ ہفتے کے برعکس ان کی تحریر زیادہ توانا نظر آتی ہے۔ دونوں سفرناموں میں مصنف نے جابجا ان مشرقی اور یورپی شہروں کی ترقی اور اپنے دیس کی پسماندگی اور انسان رویوں میں پائے جانے والے واضح فرق کو خاص طور پر بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر نعمت اللہ کے دونوں سفرنامے پڑھنے کے حوالے سے قابل مطالعہ اور دلچسپ ہیں۔

فارس کا مسافر

نور خان محمد حسنی کا دوسرا سفر نامہ ہے جو دراصل ان کے ایران کے دو الگ الگ اوقات میں کیے گئے اسفار کے مختصر احوال پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنے سفر ایران کا حال رقم کرتے ہوئے ممتاز مسعود اور سبط حسن کی ایران سے متعلق کتب سے استفادہ کیا گیا ہے جس کا نہ صرف اپنے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے بلکہ اس کا پتہ ماضی کے جھروکے کے عنوان سے پہلے باب کی قرات سے ہوتا ہے جہاں انھوں نے ایران کی قدیم تاریخ کو بیان کیا ہے۔

نور خان نے اپنے سفر نامہ کے پہلے حصّے میں زاہدان، مشہد، تہران اور رام سر جیسے شہروں اور ان کے مشہور مقامات جیسے فردوسی کا مزار، امام رضا کا مزار وغیرہ کا حال لکھا ہے جبکہ دوسرے سفر کے احوال میں انھوں نے اصفہان اور شیراز جیسے شہروں میں اپنے قیام سے متعلق لکھا ہے۔ جہاں انھیں حافظ شیرازی کے مزار اور تخت جمشید کو دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ مصنف فارسی زبان جانتا ہے اس لیے وہ اہل ایران سے بہ آسانی گفت وشنید کرتا ہے۔ وہ نہ صرف ایران کے شہروں اور لوگوں کے متعلق قاری کو معلومات مہیا کرنے کی کوششیں کرتا ہے بلکہ انقلاب سے پہلے اور بعد کے ایران کا تجزیہ لوگوں سے کی گئی گفتگو سے کرتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انقلاب سے پہلے لوگ ایران کے مظالم کے باوجود اقتصادی طور پر زیادہ خوشحال اور آسودہ تھے۔ جبکہ اب انھیں سخت مہنگائی کا سامنا ہے۔

نور خان اپنے سفر نامے میں اپنے احساسات کے ساتھ ساتھ وہاں سفر کے ذرائع اور اپنی آمد ورفت کے خرچ کا حساب بھی قاری کو دیتا ہے۔ وہ مختلف اوقات میں رقم بچا کر خوشی محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک کم خرچ میں گھومنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

نور خان کا انداز بیان سادہ اور رواں ہے۔ کہیں کہیں اس کی تحریر میں شوخی اور برجستگی بھی نظر آتی ہے مگر اس کی تحریر کا بیشتر حصّہ سنجیدگی لیے ہوئے ہے۔ وہ جا بجا ایران کے شہروں بالخصوص زاہدان اور شمال کے علاقے کا موازنہ اپنے علاقے یعنی بلوچستان سے بھی کرتا ہے۔ اسے ایرانی علاقے زیادہ ترقی یافتہ نظر آتے ہیں۔ تب اس کا احساس محرومی اُجاگر ہوتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ بلوچستان بھی ایران کے سرحدی شہروں جیسی ترقی کرے۔ مصنف اپنے خیالات کو بے لاگ انداز میں لکھنے پر قادر ہے۔ اگرچہ یہ سفر نامہ ادبی چاشنی سے تہی ہے مگر پھر بھی اسے قابلِ مطالعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہمہ یاراں بہشت

یہ نور خاں محمد حسنی کا سفر نامہ ترکمانستان ہے۔ ترکمانستان سابقہ سویت یونین سے الگ ہونے والا وسط ایشیا کا ملک ہے۔ مصنف ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد کے علاوہ جن علاقوں میں گھومنے جاتا ہے ان میں ماری شہر تاریخی، شہر مہرو کے آثار اور ان کے مضافات میں مختلف دیہات شامل ہیں۔ ان علاقوں میں مختلف بلوچ قبائل کے لوگ آباد ہیں۔ مصنف دراصل ان بلوچوں کی زبان، ثقافت اور بلوچ طرز زندگی کا مطالعہ کرنے کے مقصد سے جاتا ہے۔ اس سفر نامے کو سٹڈی ٹور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں ترکمانستان کے دیگر شہروں کا حال نہیں ملتا نہ ہی مصنف نے سیاحت کی غرض سے یہ سفر نامہ لکھا ہے۔ اس کے مطالعہ سے قاری کے سامنے ترکمانستان کی ایسی تصور نہیں ابھرتی جس سے قاری میں اس ملک کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو یا اسے گھر بیٹھے ترکمانستان کے بارے کم از کم معلومات مل جاتی ہیں۔ اس کتاب کا بیشتر حصّہ ماری اور اس کے اردگرد دیہات میں رہنے والے بلوچ لوگوں سے شناسائی اور ان کے گھر مہمان بننے کی روداد پر مشتمل ہے۔ جن لوگوں سے مصنف کو ملنے کا موقع ملا۔ ان کا تعارف اس میں دیا گیا ہے۔ کتاب میں جابجا ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں لکھی گئی ہیں جو عموماً سفر ناموں میں نہیں لکھی جاتیں۔ مثلاً کئی جگہ چندرویوں کی بحث کا احوال لکھنا وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ سادہ اسلوب میں لکھی گئی یہ کتاب سفر نامے کی تعریف پر بمشکل پورا اترتی ہے۔ اس کا انداز تحریر غیر دلچسپ ہے اور یہ مصنف کے دنیا دیکھنے کے سطحی انداز کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں البتہ ترکمانستان کے بلوچوں کے ان رواج ورسوم کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے جو ان میں اور بلوچستان کے بلوچوں میں مشترکہ ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں بعض ایسی رسمیں ابھی پائی جاتی ہیں جو بلوچستان میں متروک ہو چکی ہیں۔ کئی جگہ گمان ہوتا ہے کہ مصنف ترکمانستان کو بلوچوں کے ایک وطن کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس سے اس کی تحریر میں بلوچ قوم پرستی کی ایک لہر سی محسوس ہوتی ہے۔

سمندر جزیزہ میں

یہ عبدالفتح پشتون کا سفر نامہ یورپ ہے۔ وہ اپنے سفر کا آغاز کوئٹہ سے کرتا ہے اور چمن کے راستے افغانستان کے شہر قندھار اور پھر وہاں سے ایران اور ترکی سے گزرتے ہوئے یورپ میں داخل ہوتا ہے۔ یورپ کے جن ممالک میں وہ مختصر قیام کرتا ہے ان میں یوگوسلاویہ، مشرقی اور مغربی جرمنی (واضح رہے اس وقت دیوار برلن قائم تھی) شامل ہیں۔ وہاں سے وہ برطانیہ کے شہر لندن پہنچتا ہے۔ پہلے باب میں اس سفر کی دلچسپ روداد کا آغاز کوئٹہ میں ایک

کو جوان سے بات چیت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد مصنف جس شہر یا ملک سے گزرتا ہے اس کے لوگوں اور ان کے طرزِ زندگی کا باریک بینی سے جائزہ لیتا ہے اور اسے بلاکم و کاست اپنے رواں اور دلچسپ اسلوب میں لکھتا چلا جاتا ہے۔ وہ دورانِ سفر پیش آمدہ ناخوشگوار واقعات بھی لکھتا ہے اور حسین و جمیل چہروں کے حسن و خوبصورتی کی داد بھی دیتا ہے۔ اپنے مختصر قیام کے دوران وہ جن لوگوں سے ملتا ہے ان کی تصویر کشی خوبصورت انداز میں کرتا ہے اور بے تکلفی سے نہ صرف کلب میں مخلوط رقص کرنے کا حال سناتا ہے بلکہ جام شراب پینے اور حسین لڑکیوں سے اختلاط کا حال بھی رقم کرتا ہے۔ اس طرح وہ مصنوعی طور پر نیک و پارسا بننے کی بجائے قاری کے آگے تمام حجابات اٹھا دیتا ہے مگر اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے طرز بیان میں کہیں بھی شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتا۔

دوسرے باب میں مصنف لندن پہنچ کر وہاں قیام کر لیتا ہے اور یہ قیام غالباً سات برسوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کتاب کے باقی تقریباً سو صفحات اس کے لندن شہر میں رہنے کی کتھا بیان کرتے ہیں۔ اس طرح یہ عام سفر ناموں سے مختلف ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئٹہ کے دونو جوانوں سے لندن میں ملنے کا مختصر حال بھی ہے جو مصنف کو بعض نچلی سطح کی ملازمت کی پیش کش کرتے ہیں جنھیں وہ رد کر دیتا ہے حالانکہ بعد کے صفحات میں وہ اسی طرح کی ملازمت کرتا نظر آتا ہے۔ یعنی بیرا بننا یا کوئلہ اٹھانا وغیرہ۔

مصنف نے لندن میں پاکستان سے جا کر بسنے والوں کے سماجی مسائل کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یعنی وہ جس طرح لندن پہنچتے ہی بدل جاتے ہیں مثلاً ایک شادی شدہ خاتون نذیراں جو اپنے شوہر کو چھوڑ دیتی ہے اور نوری بن کر نہ صرف آزاد خیال لڑکی بن جاتی ہے اور کلب میں رقص و سرور میں مشغول ہوتی ہے بلکہ آخر میں ایک ہندو ڈاکٹر شرما سے بیاہ کر لیتی ہے۔ اسی طرح خود مصنف ایک انگریز طالبہ سوزی سے مراسم بنا لیتا ہے نہ صرف وہ دونوں ساتھ گھومتے ہیں، سینما جاتے ہیں بلکہ بوس و کنار میں مشغول بھی نظر آتے ہیں۔ وہ سوزی کے گھر روزانہ جانے لگتا ہے جہاں اس کے والدین سے گھل مل جاتا ہے وہ اسے اپنے ساتھ باہر پکنک پر بھی لے جاتے ہیں اور گھر میں ہر طرح کی آزادی دیتے ہیں۔ مصنف سوزی کے والد رچرڈ سے طویل مباحثے کرتا ہے۔ ان میں وہ مغرب کی صنعتی اور ٹیکنالوجی کی برتری کو تسلیم کرتا ہے مگر وہ اسے روحانی طور پر بیمار قرار دیتا ہے۔ اسے مغرب کی بے جا آزادانہ اور جنسی بے راہ روی بہت کھٹکتی ہے۔ حالانکہ وہ خود اسی آزادی کے باعث رچرڈ کی بیٹی سے بلا روک ٹوک نہ صرف ملتا ہے بلکہ اُسے

اپنے ساتھ لے کر سارے لندن میں گھومتا ہے۔ سوزی کے والدین سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی بیٹی سے شادی کرے گا مگر مصنف آخر میں اسی بات پر شاید سوزی سے بگاڑ لیتا ہے اور واپسی کی راہ لیتا ہے۔ یہ سفرنامہ روایتی سفرناموں سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ اس میں ناول کا سا لطف پایا جاتا ہے۔ مصنف نے تو اسے سفرنامہ بھی نہیں کہا۔ اس کے دیباچے میں رئیس امروہوی نے بھی یہ بات کہی ہے۔ ان کے بقول:

> عبدالفتح پشتون نے یورپ اور انگلینڈ کا سفر شاعرانہ تاثر کے ساتھ کیا ہے اور یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کسی مسافر کی ڈائری کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ ایک خوبصورت ناول سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ [۱۸]

عبدالفتح پشتون کا اسلوب بہت رواں، سشتہ اور دلچسپ ہے۔ اسے اردو زبان لکھنے کی مہارت حاصل ہے۔ اس لیے نہ صرف اس کی تحریر میں کوئی غلطی نظر نہیں آتی بلکہ اسے پڑھتے ہوئے ادبی تحریر کی قرأت کا لطف آتا ہے۔ اس کی تحریر میں اردو محاورے، روزمرہ اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی ملتی ہیں جو اس کی اردو زبان سے گہری واقفیت کی دلیل ہیں۔ مصنف ایران کے حوالے سے ایک جملے میں گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیتا ہے۔ جب وہ لکھتا ہے کہ: ''طہران میں جب شاہ کے محل پر نگاہ پڑی تو یوں محسوس ہوا جیسا کہ سرمایہ دار ایران کے تیل کے چشمے فقط شاہی محل میں بہہ رہے ہوں۔'' [۱۹]

رچرڈ اس سے مسلمانوں کے متعلق مختلف سوالات کرتا ہے۔ پاکستان کے حوالے سے بھی وہ کئی باتیں پوچھتا ہے اور بلوچستان کے بارے میں بھی مصنف سے کئی باتیں جاننا چاہتا ہے۔ رچرڈ کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان سب معاملات پر گہری نظر رکھتا ہے۔

اس طرح مصنف نہ صرف اپنے سماجی شعور کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ ایک جملے میں یوگوسلاویہ اور ایران کی سماجی اور معاشی حالت کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اسی طرح یوگوسلاویہ میں جہاں وہ رہتا ہے اس گھر کی مالکن اسے پاکستان سے سونا لانے کو کہتی ہے تو مصنف کو ایک سوشلسٹ ملک کے شہری کی سرمایہ دارانہ ذہنیت پر تعجب ہوتا ہے۔

رفت گزشت: بلوچستان سے امریکہ تک

مجید اصغر کا سفرنامہ امریکہ ہے جو ۲۲۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ مجید اصغر ایک کہنہ مشق صحافی ہیں۔ انھوں نے

امریکہ کا یہ سفر نائن الیون سے بہت پہلے۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران کیا تھا۔ وہ امریکہ کے سرمایہ کاروں کو بلوچستان میں سرمایہ کاری کی ترغیب دینے کے لیے جانے والے بلوچستان انوسٹمنٹ مشن کے ساتھ بطور صحافی گئے تھے۔ انھوں نے کوئٹہ میں اس سفر کے آغاز سے لے کر امریکہ پہنچنے اور پھر وہاں کی زندگی کا نہایت باریک بینی سے معاشرہ کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ سفر نامہ کل ۱۲۵ابواب پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے باب بعنوان تھینک یو امریکہ کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے:

کوئی اسے بزرگ مانتا ہے اور کوئی شیطان بزرگ۔
مگر سب مانتے ہیں کہ امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔
اوپر اللہ نیچے امریکہ۔
بندے پر مصیبت آئے تو اوپر والا یاد آتا ہے۔
حکومتوں پر برا وقت آئے تو امریکہ کو یاد کرتی ہیں۔ [۲۰]

محولہ بالا اسطور سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے سفر امریکہ کا حال شگفتہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ مجید اصغر نے قیام امریکہ کے دوران پیش آمدہ واقعات اور اس معاشرے کو روزانہ کی خبروں کے حوالے سے بھی جانچا ہے۔ امریکی عورت ترقی یافتہ تو ہے مگر کسی طرح عریانی کا شکار ہے اور کن سماجی مسائل کا سامنا کرتی ہے۔ بوڑھی اور جوان نسلوں کے درمیان جنریشن گیپ کن انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔ امریکہ میں باہر سے آنے والے مسلمانوں بالخصوص پاکستانی نوجوانوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ کس طرح ہر پاکستانی کو دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی نائن الیون کا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے امریکہ کی تاریخ کو بھی مختصراً اپنے سفر نامے میں پیش کیا ہے مگر یہ تذکرہ مختصر ہے اور قاری کو امریکی تاریخ کی بعض بنیادی باتوں سے آگاہ کرتا ہے۔ مجید امجد امریکہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے واقعات کے طویل سلسلوں میں کھونہیں جاتے بلکہ جلد ہی واپس آج کے امریکہ کی تصویر گری کرنے لگتے ہیں۔ وہ واشنگٹن کے زیر زمین میٹرو سیکشن کے ساتھ ساتھ وہاں کی ریڑھیوں کا حال بھی سناتے ہیں۔ امریکہ میں صحافت کی کیا صورت حال ہے۔ کون سے بڑے اخبارات ہیں اور ان کی کھپت کتنی ہے۔ یہ رائے عامہ بنانے میں کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی قیمت کیا ہے؟ مجید اصغر نے صحافی ہونے کے ناطے اس طرح کی تمام بنیادی معلومات مہیا کی ہیں۔ انھوں نے امریکی معاشرے اور عوام کے طرز زندگی کے بارے جو کچھ دیکھا بلا کم و کاست اسے اپنی تحریر کا حصّہ بنایا ہے چونکہ وہ عملی صحافت میں نصف

صدی سے سرگرم ہیں۔ لہٰذا کفایت لفظی ان کی تحریر کی نمایاں پہچان ہے کہیں تکرار نہیں ملتی۔ مجید اصغر نے اپنے سفر نامے کو اس شگفتہ پیرائے میں لکھا ہے کہ قاری پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس سفر نامے میں نہ صرف کئی دلچسپ واقعات و حالات ملتے ہیں بلکہ یہ ادبی تحریر کی چاشنی سے مملو ہے۔

انجانے دیس میں

شاہدہ بخاری کا مختصر سفر نامہ ہے۔ انھیں ۱۹۹۳ء میں نیپا کے ایک ٹور کے سلسلے میں روم، وینس اور ایتھنز میں قریباً دو ہفتے گھومنے کا موقع ملا تھا۔ یہ سفر نامہ اس سفر کی داستان ہے جو کوئٹہ سے روانگی سے لے کر واپس کوئٹہ پہنچنے تک ہے۔ وہ ایک سرکاری وفد کے ساتھ اس دورے پر گئی تھیں لہٰذا انھوں نے اپنے وفد کے ہمراہ ان شہروں میں پاکستان کے کمرشلز کونسلرز کی راہنمائی میں اہم جگہوں کی سیر کی۔ انھیں روم اور ایتھنز کے ائیر پورٹ اپنی وسعت چمک دمک اور صفائی سے ورطہ حیرت میں ڈالتے ہیں۔ یہ سفر دراصل ایک سٹڈی ٹور تھا۔ اس لیے انھیں ہر شہر میں مختلف اہم سرکاری عمارات لے جایا جاتا اور اس کے بارے بریفنگ دی جاتی۔ شاہدہ بخاری روم پہنچنے کے باوجود وہاں کے ہوٹل میں چائے نہ ملنے پر اداس ہو کر اپنے وطن کو یاد کرنے لگتی ہیں۔ [19] اسی طرح لفٹ نہ ہونے کی وجہ سے پانچویں منزل تک چڑھنے کی شکل ہو یا اپنے ہوٹل سے باہر نکل کر رستہ بھول جانے کا قصہ وہ اپنے قاری کے ساتھ ہر بات شیئر کرتی ہیں۔ انھیں باقی شہروں کی نسبت وینس بہت پسند آتا ہے اور اس کی اہم بات اس شہر کی خاموشی ہے جس کے بارے میں وہ حیرت کا اظہار کرتی ہیں۔ شاہدہ بخاری رواں اور سلیس نثر لکھنے کا ملکہ رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کی تحریر میں کہیں کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا۔ مگر ان میں ادبی نثر کا لطف بہر حال نہیں ملتا۔

اللّٰھمّ لبیك

شاہین روحی بخاری کا سفر نامہ ہے جس میں انھوں نے اپنے عمرہ پر جانے کا حال بیان کیا ہے۔ اس میں گھر سے روانگی سے لے کر پہلے مدینہ اور پھر وہاں سے مکہ پہنچنے کی تفصیل رقم کی ہے۔ مقامات مقدسہ میں عمرہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان جگہوں کی تاریخی اہمیت بھی بیان کرتی ہیں جو ظاہر ہے تاریخی کتابوں سے اخذ کی گئی ہے۔ عمرہ کے واجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ شاہین روحی بخاری نے وہاں خرید و فروخت کی صورت حال عرب پولیس کا زائرین سے رویہ اور وہاں بھیک مانگنے کا دھندہ کرنے والے پاکستانیوں کا تذکرہ بھی اپنے سادہ اور رواں اسلوب میں کیا ہے۔ اللھم لبیك چونکہ ایک مذہبی سفر یعنی عمرے کی روداد ہے اس لیے اس میں روایتی سفر نامے کی بو باس

نہیں ملتی۔ کتاب کے آخر میں نماز جمعہ کی فضیلت، پرہیز گاروں کی صفات اور اللہ تعالیٰ پر توکل جیسے موضوعات پر مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔

چین آشنائی

شاہ محمد مری کا سفرنامہ چین ہے۔ وہ پاکستانی ادیبوں کے وفد کے ہمراہ چین گئے تھے۔ اس سفر میں ان کے ہمراہ مشتاق احمد یوسفی، ڈاکٹر سلیم اختر، محمد اظہار الحق اور داور خان داؤد تھے۔ یہ کتاب اس سفر کی شگفتہ روداد ہے جو شاہ محمد مری نے اپنے منفرد اسلوب میں لکھی ہے۔ بہ طور سفرنامہ چین آشنائی چین پر لکھے گئے سفرناموں میں اپنی الگ خاصیت رکھتا ہے۔ شاہ محمد مری چین کی سیر کے دوران چین کو دیکھتے ہی نہیں بلکہ وہ اس ملک کو جیتے ہیں جیسے اس میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اس جینے کے عمل میں قاری کو شریک کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک سوشلسٹ ہیں۔ اس لیے وہ چین کو نئے سرمایہ دارانہ عہد میں درپیش چیلنجز اور تبدیل ہوتے دیکھ کر اپنا رواں تبصرہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے چین کی تاریخ کو بھی جا بجا اپنے اس سفرنامے میں لکھا ہے مگر بالکل مختلف انداز میں یعنی وہ اسے طبقاتی حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ چین آشنائی سولہ ابواب میں تقسیم ہے۔ شاہ محمد مری چین کے مختلف شہر دیکھتے ہیں مگر انھیں وہاں بھی بلوچستان نظر آتا ہے بلکہ سن یاسن نامی رہنما کے روپ میں وہ بزنجو کو بھی دیکھتے ہیں۔[20] شاہ محمد مری کا اسلوب منفرد اور شگفتہ تو ہے ہی وہ جا بجا بلوچی لفظیات، تراکیب اور ضرب الامثال بھی لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کئی ابواب کے عنوانات یا ذیلی عنوانات بھی بلوچی میں ہیں۔ چین آشنائی کی قرأت سے اردو سفرنامے میں ایک نئے ذائقے کا احساس ہوتا ہے۔ شاہ محمد مری کا ایک قدم چین جبکہ دوسرا بلوچستان میں ہوتا ہے۔ وہ ایک بات چین کے بارے میں اور دو باتیں بلوچ یا بلوچستان کے حوالے سے کر جاتے ہیں مگر اس طرح کہ بات کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا۔ اس انداز نے اس سفرنامے کو بار بار مطالعے کی چیز بنا دیا ہے۔

دوستوں کے درمیان

امداد نظامی کا سفرنامہ ہے جو چین کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔ انھیں پاکستانی ادیبوں کے ساتھ چین جانے کا موقع ملا تھا۔ اس سفر میں خاطر غزنوی، سحر انصاری، یونس جاوید، مستنصر حسین تارڑ، منشا یاد، ڈاکٹر ریاض مجید، علی اکبر عباس اور سلیم کیانی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اپنے سفرنامے میں امداد نظامی نے اپنی چین جانے کی خواہش کے بارے میں بھی آغاز میں لکھا ہے اور پھر اسلام آباد سے بیجنگ پہنچنے وہاں کے بازاروں کی سیر، دیوار چین کو دیکھنے کا

تجربہ، بیجنگ کے مشہور تیان فن سکوائر اور اس کے قریب واقع پیلس میوزیم کی سیر کا حال بھی لکھا ہے۔[۲۱] بیجنگ کے علاوہ اس سفرنامے میں چین کے دیگر شہروں سیان، شنگھائی، بانگ چواور دیہی علاقے تھیان چین کی سیاحت کا حال بھی ملتا ہے۔امداد نظامی ان شہروں کا آنکھوں دیکھا حال بلاکم و کاست بیان کرتے ہیں۔ وہ صرف سیر کا حال اور چینی ادیبوں سے ہونے والا مکالمہ ہی نہیں لکھتے بلکہ جابجا چین کی تاریخ اور اس کے ارتقائی سفر کی داستان بھی سناتے ہیں۔چینی خواتین کس طرح مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتی ہیں اور ملک کی ترقی میں اپنا حصّہ ڈال رہی ہیں۔امداد نظامی اس پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔کتاب میں چین میں بنائی گئی تصویریں بڑی تعداد میں شامل ہیں۔امداد نظامی سادہ اور سلیس اردو نثر لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ان کی تحریر میں ایک خاص طرح کی روانی اور چابکدستی نظر آتی ہے۔اس وجہ سے وہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

عزم و حوصلے کی سرزمین

یعقوب شاہ غرشین کا سفرنامہ جاپان ہے۔یہ ضخیم سفرنامہ ۴۳۷ صفحات پر مشتمل ہے۔افسانہ نگار یعقوب شاہ غرشین کی یہ کتاب اس سفر کی داستان ہے جو انھوں نے جاپان کی بین الاقوامی تعاون کی ایجنسی جائیکا JICA کی دعوت پر دیگر سول افسران کے ساتھ کیا تھا۔اس سفرنامے میں مصنف نے اپنے سفر کا آنکھوں دیکھا حال تو رقم کیا ہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ مختلف موقعوں پر جاپان کی ادبی علمی اور ملکی تاریخ بھی بیان کی ہے۔تاریخ کے اس تذکرے کی وجہ سے ہی اس سفرنامے کی ضخامت میں اضافہ ہوا ہے۔ ورنہ مصنف کے مشاہدے کی روداد کم صفحات میں نبٹ سکتی تھی۔

سفرنامہ جاپان کا دلچسپ حصّہ بھی وہی ہے جو مصنف نے اپنی سیر کے دوران مشاہدہ و مطالعہ کا حاصل بیان کیا ہے چونکہ یہ سفر ایک سرکاری پروگرام کا حصّہ تھا۔لہٰذا ان کے طعام و قیام کی ذمہ داری جاپانی حکومت کے سپرد تھی۔ مصنف کو مختلف موقعوں پر جاپان کے سرکاری اہل کاروں سے ملنے، بریفنگ دینے، پاکستان و جاپان کے تعلقات مزید بہتر کرنا جیسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کا موقع بھی ملا مگر اس کی ابتداء جاپانی زبان کے سیکھنے سے ہوئی۔ یعقوب شاہ نے جو ابتدائی جاپانی زبان سیکھی اس کا احوال اور لفظیات بھی درج کی ہیں۔اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہونے والی گپ شپ اور بے تکلفی کا بھی کھلا اظہار کیا ہے۔ جاپانی طرز معاشرت ہو یا بازاروں کا احوال، لوگوں سے ملنے کے آداب ہوں یا تعلیم و تجارت کی صورت حال، پارکوں اور سیر گاہوں کا تذکرہ ہو یا پھر ساری رات چلنے والے

عشرت کدے اور جنسی معاملات یعقوب شاہ کا قلم ان تمام معاملات کو بے باکی سے رقم کرتا ہے۔ وہ تحریر میں کسی لگی لپٹی کا قائل نہیں اس لیے اپنے سفر کی تمام روداد دلچسپ انداز میں قاری کے گوش گزار کرتا ہے۔ یعقوب شاہ کو اپنے کسی ساتھی کا رویہ تکلیف دیتا ہے تو وہ اس کا حال بھی سناتے ہیں۔ کسی جاپانی دوشیزہ کی راہنمائی ملتی ہے تو شکریے کے ساتھ ساتھ اس کے حسن کی تعریف میں بھی کوتاہی نہیں کرتے۔ کسی وقت اکیلے سیاحت کے لیے نکل پڑتے ہیں تو جو جو مناظر سامنے آتے ہیں دیکھتے اور اپنے قاری کو دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ مصنف کی زندہ دلی اور خوش مزاجی کا ثبوت اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ یویوگی پارک میں موسیقی سے متاثر ہو کر ناچنے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔[۲۴] یعقوب شاہ کو اس سفر کے دوران جاپان کے مشہور شہروں ٹوکیو، یاکوہاما اور ناگاساکی جانے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ان شہروں کے ساتھ واقع سیر گاہوں کی سیاحت بھی کی۔ ناگاساکی میں ایٹم بم کی تباہ کاریوں کا احوال بھی انھوں نے رقم کیا ہے۔ بعض جگہ جاپانی شاعروں کے تراجم بھی دیے ہیں بالخصوص جاپانی صنف ہائیکو کے۔ یعقوب شاہ افسانہ نگار بھی ہے اس لیے اسے تحریر پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اس نے اس سفر کی سرگزشت دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔ اس کا اپنا انداز کئی جگہ نمایاں ہوتا ہے۔ اسے ایک اچھا سفر نامہ کہا جا سکتا ہے۔

دیوتا دیس کے درشن

زیب النساء غرشین کا دوسرا سفر نامہ ہے جو نیپال پر لکھا گیا ہے۔ مصنفہ کو بطور صحافی کھٹمنڈو میں چار دن کی صحافتی ٹریننگ کا موقع ملا تھا۔ یہ کتاب اس سفر کی روداد ہے مگر یہ سفر نامے سے زیادہ نیپال کے ماضی کی تاریخ، وہاں کی زبان و ثقافت، مذہبی عقائد، تہوار، مہاتما بدھ کی زندگی کا احوال اور نیپال میں ذرائع ابلاغ کی تاریخ وغیرہ کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ مصنفہ چار دن میں ان سب چیزوں کے بارے میں سب کچھ نہیں جان سکتی تھی۔ اس لیے یہ سارا مواد نیپال پر لکھی گئی تاریخ کی کتابوں اور سفر ناموں سے اخذ کیا گیا ہے۔ جن کا پتہ کتاب کے آخر میں نیپال کے چار سفر ناموں کو ماخذات کی مد میں درج کرنے سے چلتا ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں کھٹمنڈو کا قدرے مختصر تذکرہ ہے اور پھر آٹھواں باب میں نیپال گھومنے کی بات مختصراً کی گئی ہے۔ البتہ وہاں کے برنس سینٹر میں ملنے والی خاتون بشنو کا تذکرہ قدرے دلچسپ ہے۔[۲۵] دیباچوں میں مجید اصغر اور جاوید چوہدری نے جس طرح مصنفہ کے سفر نامے کی تعریف کی ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ ہر دو حضرات نے اسے پڑھے یا توجہ سے پڑھے بغیر دیباچے لکھے ہیں۔

اسلوب:

زیب النساء رواں اور سادہ نثر لکھتی ہے جس میں اس کا ذاتی رنگ کئی جگہ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ وہ فیض احمد فیض کے انداز میں اپنے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتی ہے۔ بلوچستان کے ایک پسماندہ علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کی اردو میں کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ وہ پوری صفائی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

چلتن سے چین تک

زیب النساء غرشین کا سفر نامہ چین ہے جو کل ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ بلوچستان کے کسی لکھاری کا چین کا تیسرا سفر نامہ ہے۔ زیب النساء غرشین بنیادی طور پر صحافی ہیں انھیں ۲۰۰۹ء میں وزارت امورِ نوجوانان پاکستان کے توسط سے ایک وفد کے ساتھ دس روز کے لیے چین جانے کا موقع ملا۔ یہ کتاب اس سفر کی داستان ہے۔ زیب النساء نے اپنے سفر نامے کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کا آغاز کوئٹہ سے اسلام آباد اور پھر وہاں سے کوہ قراقرم کو عبور کرتے ہوئے چین کے شہر یورومچی پہنچنے کے احوال سے ہوتا ہے اور پھر آگے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے مگر مصنفہ نے صرف اپنے شاہدات ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ چین کا جغرافیہ تاریخ کنفوشس کے نظریات اور چیئرمین ماؤ کی جدوجہد بھی بیان کی ہے۔ یہ سب معلومات اس کتاب میں اضافی معلوم ہوتے ہیں۔ ویسے بھی یہ تمام معلومات چین پر لکھے گئے ان درجن بھر سے زائد سفر ناموں سے اخذ کی گئی ہیں جن کی فہرست مصنفہ نے اپنے سفر نامے کے آخری صفحے پر مہیا کی ہے۔[۲۶] اس سفر نامے کا وہی حصّہ بھرپور ہے جو مصنفہ کی اپنی کارگزاری اور آنکھوں دیکھے احوال پر مشتمل ہے۔ اس میں چین کے مختلف سیاحتی مراکز اور بازاروں کا حال بھی شامل ہے اور مختلف تعلیمی اداروں کا تذکرہ بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں چین میں خواتین کی ترقی اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ایک لازمی عنصر کے طور پر دیوار چین کی سیر کا احوال بھی دیا گیا ہے۔

بلوچستان دیس سے بنگلہ دیش تک

نوجوان لکھاری خالد میر کا ۷۷ صفحات پر مشتمل مختصر سفر نامہ ہے جو ایک این جی او کے زیر اہتمام ڈھاکہ میں ورلڈ سوشل فورم میں شمولیت کی غرض سے بنگلہ دیش کے سفر کی روداد ہے۔ یہ کتاب چار ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ مصنف نے اس سفر کی دعوت اور کوئٹہ میں رقم کا بندوبست کرنے سے اس کتاب کا آغاز کیا ہے۔ پھر ڈھاکہ پہنچنے

کانفرنس میں شرکت کی روداد بنگلہ دیشی نوجوانوں سے مکالمے کی تفصیلات، ڈھاکہ یونیورسٹی کا حال، بنگلہ دیش میں تعلیم کی بہتر صورت حال اور خواندگی کی کیفیات کے ساتھ ساتھ مختلف نزدیکی علاقوں میں گھومنے پھرنے کا احوال بے کم و کاست رقم کیا ہے۔ اس مختصر سفر نامے میں ٹیگور کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اقبال، فیض اور جالب کے اشعار بھی حسب حال دے دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں واپسی کا احوال ملتا ہے۔ خالد میر رواں، سادہ اور آسان نثر لکھتا ہے جس سے ایک عام قاری لطف لے سکتا ہے۔ اس کی تحریر میں بعض جگہ کچھ اداروں کے نام یا دو چار جملے انگریزی کے بھی ملتے ہیں۔

چمن سے دہلی تک

نصیب اللہ اچکزئی کا مختصر سفر نامہ بھارت ہے جو صرف ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مختصر سفر نامے کو بھی انیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مصنف وکیل ہے اور اسے سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے بعض وکلا کے ساتھ ۲۰۱۱ء میں دہلی میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل جوڈیشنل کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ یہ مختصر کتاب اس سفر کی روداد ہے۔ مصنف کے ساتھ پاکستان کے اہم وکلا میں عاصمہ جہانگیر اور علی احمد کرد بھی شامل تھے۔ نصیب اللہ نے اپنے سفر نامے کا آغاز کوئٹہ سے لاہور پہنچنے اور پھر واہگہ بارڈر سے امرتسر اور پھر دہلی جانے کا حال مکمل تفصیلات کے ساتھ رقم کیا ہے۔ اس میں گورنر پنجاب کی طرف سے لاہور میں دیے گئے عشائیے کا ذکر بھی ہے۔ دہلی میں ہائی کمیشن آف پاکستان میں ۲۳ / مارچ کی تقریب میں شرکت یٰسین ملک اور سید علی گیلانی جیسے کشمیری رہنماؤں سے ملاقات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ [۲۷] جبکہ کانفرنس میں شرکت کا احوال بھی ساتھ ہی مرقوم ہے جو اس دورے کا اصل مقصد تھا۔ نصیب اللہ اچکزئی سادہ اور رواں نثر لکھتے ہیں جبکہ کہیں کہیں ان کی تحریر میں پشتو الفاظ اور محاورے بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ مثلاً تربور (کزن) اور خرناٹ (بڑی توپ چیز) وغیرہ۔

وحشت ناک سفر

وحشت ناک سفر کہنے کو تو سفر نامہ ہے مگر دراصل یہ ایک نوجوان کی ترکِ وطن کی روداد ہے۔ اس میں پاکستان سے انڈونیشیاء اور پھر وہاں سے کشتی کے ذریعے غیر قانونی طور پر آسٹریلیا پہنچنے کے واقعات درج ہیں۔ یہ واقعات آغا جان پر اس سفر میں گزرے مگر انھیں عبدالعلی عبدل کے قلم نے لکھا۔ عبدالعلی اس حوالے سے لکھتا ہے۔ ''یہ کتاب آغا جان کے سفرِ آسٹریلیا کی وہ دردناک کہانی ہے جس کو قلم بند کرنے کے لیے مجھ سے گزارش کی گئی

ہے، یعنی کہانی آغا جان کی اور قلم میرا۔''۲۸

آگے وہ اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔''یہ کتاب [سفرنامہ] صرف اور صرف آغا جان کے جملوں پر مشتمل ہے۔''۲۹ گویا مصنف نے من وعن وہی تحریر کیا جو قصہ سنانے والے نے بیان کیا۔ وحشت ناک سفر کا راوی اگرچہ آغا جان نامی شخص ہے مگر اس کا مصنف عبدالعلی عبدل ہی قرار پاتا ہے۔ کوئٹہ میں آغا جان ایک عام لقب ہے جو سید قبیلے کے ہر نوجوان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

جیسا کہ اس کتاب یا سفرنامے کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں ایک پُرصعوبت سفر میں پیش آمدہ حالات و واقعات مرقوم ہیں۔ آغا جان اپنی تحریر کا آغاز کوئٹہ میں قیام اور اپنے گھر کے مشکل حالات کے تذکرے سے کرتا ہے۔ وہ کوئٹہ کے ہزارہ قبیلے کا ایک فرد ہے اور آسٹریلیا جانے کے لیے بمشکل چند لاکھ کا بندوبست کر کے پہلے کراچی اور پھر وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز انڈونیشیا پہنچتا ہے۔ یہاں تک آتے آتے اس کی تمام رقم ختم ہو جاتی ہے اور یہیں سے مشکلات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ انڈونیشیا میں گرفتار ہو جاتا ہے اور پھر ایک دوست کے ذریعے رشوت دے کر خلاصی پاتا ہے۔ وہ رہا ہونے کے بعد مزید قرضہ لے کر سمندری کشتی سے آسٹریلیا روانہ ہوتا ہے۔ سات دنوں اور سات راتوں کے انتہائی کٹھن اور نامساعد حالات سے دوچار ہونے کا بعد وہ بالآخر آسٹریلیا پہنچنے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ اس دوران وہ کئی بار یقینی موت کا سامنا کرتا ہے، اور اپنے ایک ساتھی کو وحشت ناک موت کا شکار ہوتے دیکھتا ہے۔ سمندر کی بے رحم موجیں کشتی کو کیسے اچھالتی ہیں اور خطرے کے وقت لائف جیکٹ کے لیے کیسے سب ایک دوسرے سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سفرنامہ اس قسم کے واقعات سے پُر ہے۔ آخر کار آسٹریلیا پہنچ کر آغا جان پہلے کچھ وقت کیمپ میں قید کاٹتا ہے۔ اور پھر رہائشی ویزہ ملنے پر شہر میں ایک جگہ نوکری کرتا ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ دولت بھی کما لیتا ہے اور قسمت اچھی ہونے پر اس کی لاٹری بھی نکل آتی ہے۔ یوں وہ آسٹریلیا میں ایک کامیاب زندگی گزارتا ہے، کبھی کبھی پاکستان بھی آتا ہے۔ اس کا یہ کتاب لکھنے کا مقصد آخر میں کھلتا ہے جب وہ نوجوانوں سے ملتمس ہوتا ہے کہ وہ غیر قانونی طور پر آسٹریلیا جانے کا ہرگز نہ سوچیں کہ اس میں جان جا سکتی ہے۔ آغا جان نے نیک مقصد کے لیے یہ کتاب لکھوائی ہے، تاہم اس کی سفری داستان سے بلوچستان کے اردو سفرنامے کی روایت میں ایک اہم اور دلچسپ کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک خوش آئند بات ہے۔

سفرنامہ بیلہ، آواران

سفر نامہ بیلہ، آواران اس سفر کی روداد ہے جو اس کا اللہ داد بیلوی اپنے علاقے بیلہ سے آواران تک کرتا ہے۔ یہ سفر اس نے ۱۹۹۷ء میں تب کیا تھا، جب اس کے ماموں نے آواران میں وفات پائی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ ماموں کے گھر گیا تھا۔ اس وقت پختہ سڑکیں نہ تھیں، راستہ کچا اور خراب تھا اور ٹریفک بہت کم یعنی کئی گھنٹوں کے بعد ایک بس مل پاتی تھی۔ اس کے علاوہ آتے اور جاتے ہوئے مصنف کی بس دونوں مرتبہ خراب بھی ہوئی۔ اس لیے اسے جانے میں ۳۵ اور واپس آنے میں ۲۵ گھنٹے لگے۔ اللہ داد نے اس سفر کی روداد نہایت تفصیل سے لکھی ہے۔ بس خراب ہونے پر اسے ایک چھپر ہوٹل میں رکنا پڑا، جہاں صاف اور اچھا کھانا پینا تو دستیاب ہونا ایک طرف رہا، وہاں بیٹھنے کی آرام دہ جگہ تک نہ تھی۔ اسے رات کو سخت اور کھردری زمین پر سونا پڑا۔ اس موقع پر اس کی دوسرے مسافروں کے ساتھ مختلف بلوچ قبائل کی تاریخ اور مکران کے ذکری فرقے کے حوالے سے طویل بحث ہوئی، جو اس نے بلا کم و کاست رقم کی ہے۔ اس موقع پر اپنے ساتھ موجود خواتین کے حوالے سے اللہ داد بیلوی نے جو لکھا، اس میں اس علاقے میں مسافروں کی بے چارگی اور بے بسی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ہمیں اپنی فکر نہیں ہے لیکن ان عورتوں اور بچوں کی پریشانی کا احساس زیادہ ہے۔ یہ اپنی بکریاں ایسی جھگی میں نہیں باندھتی ہیں اور آج رات کو یہاں خوار ہیں۔ یہاں اس اندھیری رات میں، اس جھگی میں بغیر بستر کے پڑے ہیں، ان کالے پتھروں پر سویا بھی نہیں جا سکتا۔[۳۰]

اب شاید یہ راستہ بن چکا ہو اور حالات بدل گئے ہوں، مگر جس وقت یہ سفر کیا گیا تھا، اس وقت بلوچستان کے اکثر علاقوں کی یہی صورتحال تھی۔ اس سفرنامے میں مصنف نے ایک خاص زمانے میں اپنے علاقے کی تصویر پیش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے بلوچستان ہی میں ایک مختصر سفر کی روداد اردو میں لکھی ہے۔ یہ ایک طرح سے بلوچستان کی ادبی روایت میں ایک نئی چیز ہے۔ یہ امکان ہے کہ ہر دو حوالوں سے اللہ داد بیلوی کی کتاب کی قدر و قیمت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوگا۔

۵۔ بلوچستان میں مزاح نگاری

بلوچستان میں اردو مزاح نگاری کے حوالے سے جو چند کتب اب تک شائع ہوئی ہیں۔ ان کا تعارف اور تجزیہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

تبسمات

آغا صادق (۱۹۰۹ء۔۱۹۷۷ء) کا طنز و مزاح پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔آغا صادق بلوچستان میں اردو کے استاد، شاعر اور نقاد کی حیثیت سے معروف رہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہے۔ان مضامین کو اس مجموعے میں اکٹھا کیا گیا ہے۔اس میں کل بیس مضمون شامل ہیں۔آغا صادق زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے طنز اور مزاح کا نشانہ بناتے ہیں۔مزاح لکھتے ہوئے وہ اپنی ذات کو بھی نہیں بخشتے۔اس مجموعے کے تین مضامین آغا صادق؛ سوانح حیات بقلم خود، خانہ بدوش اور خدا بخشے بہت سی خامیاں تھیں، سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، ان میں انھوں نے اپنی ذات کے مختلف پہلوؤں کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔آغا صادق اپنی تحریر میں مزاح کا عنصر کس طرح تاریخی عناصر کے استعمال سے پیدا کرتے ہیں۔یہ جاننے کے لیے ان کے مضمون ''صوفی صاحب کا جوتا'' سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔وہ صوفی صاحب کے جوتے کی مختلف صفات گنواتے اور اس کی مضبوطی ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ابھی اس کا عالم شباب ہی تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی، چھ سال کیا کیا انقلاب آئے ہٹلر ختم ہوا۔مسولینی ختم ہوا، ہیروشیما اور ناگاسا کی صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے مگر اللہ اللہ اس جوتے کا دم خم، یہ جوں کا توں قائم رہا۔[۳۱]

آغا صادق کے مزاحیہ مضامین کی خاص بات ان میں کوئٹہ کے مختلف سماجی عناصر کی موجودگی ہے، جو یوں تو اکثر مضامین میں موجود ہے؛ مگر ان کی نمایاں مثال ان کے دو مضامین ''لاریوں پر شعر'' اور ''یہ کوئٹہ ہمارا'' ہے۔آغا صادق کا اسلوب شگفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی ادبی شان بھی رکھتا ہے، جو اُردو کے اعلیٰ مزاح نگاروں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔

مکھن

معین الحق کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں درج ذیل سترہ مضامین ہیں:

۱۔بھینس اور آدمی ۲۔ ملاگریز–میرا میزبان ۳۔ میرا گھر میری جنت
۴۔بہترین خدمت کی بہترین مثال–ہسپتال ۵۔ نام کا مسئلہ ۶۔ مکھن
۷۔دیوار ۸۔ اگر مگر ۹۔قلم ۱۰۔ تسخیر معدہ

۱۱۔تیرہ دن کی موت ۱۲۔ مکان بنوایئے خودکوآزمایئے ۱۳۔ جزوقتی کاروبار
۱۴۔کیاآپ انٹیلیکچول وماڈرن ہیں ۱۵۔ٹھکانہ ۱۶۔ تنزلہ
۱۷۔ انٹرویو

معین الحق واقعہ سے واقعہ پیدا کرتے ہوئے مزاح لکھتے ہیں۔ان کی تحریروں میں کہیں کہیں طنز کا عنصر بھی پایا جاتا ہے مگر اس کی نوعیت زیادہ گہری نہیں ہوتی۔ وہ مختلف کرداروں کو سامنے لا کر بھی واقعہ میں مزاح کا عنصر پیدا کرتے ہیں۔ان کے اکثر کردار بلوچستان یا کوئٹہ کے مقامی کردار نظر آتے ہیں جو مقامی لہجہ بولتے ہیں۔معین الحق مقامی لہجے سے اپنے اسلوب میں انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔مثلاً ایک درخواست گزار اپنی درخواست پر نام کے ساتھ جب کم ترین محمد حسین لکھتا ہے تو اس پر کلرک اس طرح کا نوٹ لکھتا ہے۔''ترین پٹھانوں کا معزز قبیلہ ہے۔یہ کم ترین کیا ہے؟لوکل نان لوکل یا ڈومیسائل؟''[۳۲] مگر ان تحریروں میں قباحت یہ ہے کہ اس سے صرف بلوچستان کے رہنے والے ہی لطف لے سکتے ہیں۔معین الحق اپنی تحریروں میں صیغہ واحد متکلم کی صورت موجود رہتے ہیں۔اس سے ان کی تحریریں شخصی تجربے کی روداد معلوم ہوتی ہیں کہیں کہیں انشائیہ کے عناصر بھی ملتے ہیں۔

۶۔ بلوچستان میں اردوانشائیہ

انشائیہ بظاہر ایک آسان مگر دراصل ایک مشکل صنف نثر ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ بلوچستان میں اردو انشائیہ کے خدوخال بالکل نہیں ملتے۔اردو اخبارات کے ادبی صفحات پر انشائیہ کے نام سے ایسی تحریریں ملتی ہیں جنھیں انشائیہ نہیں کہا جاسکتا۔انشائیہ کی کتب تو بالکل نہیں ہیں۔اب تک اردو انشائیہ کی صرف ایک کتاب ابو الانشاء کے انشائیے کے نام سے سامنے آئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس میں شامل تحریریں بھی انشایئے کے فنی تقاضوں پر پورا نہیں اترتیں۔ذیل میں اردو انشایئے کی اس واحد کتاب کا تعارف وتجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

ابوالانشاء کے انشائیے

یہ صاحبزادہ حمید اللہ کی تصنیف ہے۔ جو بقول ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔مصنف نے اپنے طویل دیباچے میں انشایئے کے فن پر لکھی گئی کتب سے استفادہ کرتے ہوئے خاصی گفتگو کی ہے۔اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ انشائیہ کے بنیادی اجزاء سے واقف ہیں مگر ان کی کتاب میں لکھے گئے انشایئے فنی حوالے سے بہت کمزور ہیں۔انھیں انشائیہ تو نہیں البتہ شگفتہ اور مزاحیہ تحریریں کہا جاسکتا ہے۔ان کے ان لطیف نثر پاروں میں تاریخی عناصر

اور شخصیات کا حوالہ بھی ملتا ہے اور مطالعہ بھی۔ اس لیے اس مجموعے میں شامل مضامین کو انشائیہ قرار دینا مشکل ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ بعض مضامین میں وہ کسی جگہ انشائیہ کا لطف نظر آتا ہے۔ مثلاً صاحبزادہ حمید اللہ اپنے مضمون ''تقریب رونمائی'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''تقریب رونمائی یا تعارفی تقریب وہی منہ دکھاوا ہے جو کسی زمانے میں دلہن سے مخصوص تھا۔۔۔ مگر چونکہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔۔۔ اس لیے دلہن کی جگہ کتاب نے لے لی ہے۔'' [۳۳]

حمید اللہ مرصع نثر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی تحریر میں اُردو محاورات، روزمرہ ضرب الامثال اور کہاوتیں تو ملتے ہیں۔ کہیں فارسی اور عربی کے جملے، مصرعے، اشعار اور ضرب الامثال بھی استعمال کرتے ہیں۔

مجموعی جائزہ

بلوچستان کے اہل قلم نے اردو نظم ونثر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے اپنے احساسات و جذبات کوتحریری شکل دی ہے۔ بلوچستان میں لکھے جانے والے ادب کا جائزہ اگر لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہاں کے ادیبوں کی زیادہ تر توجہ شاعری پر مرکوز رہی ہے اور شاعری میں بھی ان کی دلچسپی کا میدان غزل ہے۔ غزل نے اپنی ہیئت اور ایک مضبوط روایت کے طور پر یہاں کے شعراء کو زیادہ متوجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ غزل لکھنا دوسری اصناف خصوصاً نثری اصناف کے مقابلے میں نسبتاً آسان ہے۔ اس لئے مطبوعہ کتب کی صورت میں غزل ہی کے مجموعے مقدار میں زیادہ شائع ہوئے ہیں۔ غزل کے مقابلے میں نظم بھی بہت کم لکھی گئی ہے اور الگ سے نظمیہ مجموعوں کی اشاعت کا رجحان تو اکیسویں صدی میں ہی نظر آتا ہے۔ بلوچستان میں تخلیق ہونے والا ادبی سرمایہ بہ لحاظ مقدار اردو شاعری میں زیادہ ہے۔ اردو نثر بالخصوص تخلیقی نثر یہاں کم لکھی گئی ہے۔ بلوچستان میں اردو نثر کے ارتقائی مطالعے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف تک یہاں اردو نثر نگاروں نے صحافت اور تاریخ کے موضوعات کو زیادہ توجہ دی ہے بلوچستان میں لکھی جانے والی اولین کتب مقامی زبان یعنی بلوچی کی تدریس اور یہاں کی تاریخ کے موضوع پر ہیں۔ بیسیویں صدی کے آغاز میں یہاں اردو صحافت کا بھی آغاز ہوا ہے اردو میں مختلف اخبارات جاری ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ایک اخبار میں روزمرہ کی سیاسی اور سماجی زندگی کا منظر نامہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں کے اہل قلم نے اپنے عوام کی فلاح و بہبود اور ان کے سیاسی شعور میں اضافے کے لئے صحافت کو ایک ذریعہ بنایا۔ یوسف عزیز مگسی، عبدالصمد خان اچکزئی اور محمد حسین عنقا وغیرہ نے انہی اخبارات میں اپنی اولین تحریریں لکھیں۔ اس طرح مقامی خبروں کے علاوہ مختلف موضوعات پر سنجیدہ مضامین بھی لکھے گئے۔ ان حضرات کی دلچسپی کا محور چونکہ سیاست تھی اس وجہ سے تخلیقی نثر ان کے ہاں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان تک بلوچستان میں اردو نثر نہ ہونے کے برابر لکھی گئی ہے۔

قیام پاکستان سے کچھ پہلے یعنی تحریک پاکستان کے دنوں میں یہاں اول اول نسیم حجازی نے اپنے ابتدائی تاریخی ناول لکھے۔ اس کے بعد ہی مقامی اہل قلم بھی اس طرف راغب ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سنجیدہ اور ادبی ناول نہ لکھ پائے۔ انہوں نے جو ناول لکھے ان کا شمار مقبول عام ادب میں ہوتا ہے۔ ناول کے ساتھ ساتھ اردو افسانہ بھی بلوچستان میں لکھا گیا اور حق بات یہ ہے کہ اردو افسانہ ناول کی نسبت بہتر لکھا گیا۔ افسانوں میں کچھ فنی

کمزوریاں دکھائی دیتی ہیں مگر یہ سنجیدہ ادب یا ادب عالیہ کی نمائندگی بہرحال کرتا ہے افسانے اور ناول کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے اہلِ قلم نے دیگر نثری اصناف کو اپنی تخلیق کا ذریعہ بنایا۔ چاہے وہ ڈرامہ ہو یا خاکہ، سفرنامہ ہو یا آپ بیتی، مزاحیہ یا سنجیدہ مضامین ہوں کہ انشائیہ نگاری۔ لکھنے والوں نے قریباً ہر صنف میں کمی بیشی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ان کے معیار پر البتہ بات ہوسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں تحقیق وتنقید بھی لکھی جانے لگی لیکن چونکہ تحقیق وتنقیدی نثر ادب میں شمار نہیں ہوتی اس لئے اس مقالے میں ان پر بات نہیں کی گئی۔

جہاں تک نثری ادب کا تعلق ہے بلوچستان میں افسانہ اور ناول کے مقابلے میں دیگر اصناف میں کم کم لکھا گیا ہے۔ اس باب میں انہی اصناف کا الگ الگ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بلوچستان میں قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں سٹیج ڈرامے کی روایت کا سراغ ملتا ہے۔ یہاں ایسے لوگ تھے جو سٹیج ڈرامہ لکھتے یا دوسروں کے لکھے ہوئے ڈراموں کو سٹیج پر پیش کرتے تھے۔ مختلف کرداروں کا رنگ بھی بھرا جاتا اور انہی کی طرح مکالمے بھی ادا کیا جائے۔ فضل الرحمٰن قاضی نے اپنی کتاب بلوچستان میں اسٹیج ڈرامے کی روایت میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ خود بھی چونکہ ان میں بطور اداکار شامل ہوتے رہے ہیں، اس لئے انہوں نے ان اداکاراؤں اور ڈرامہ نگاروں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ ان کے بقول اب یہ ڈرامے تحریری شکل میں موجود نہیں ہے۔ چونکہ اس وقت پیش کئے جانے والے ڈراموں کا متن دستیاب نہیں ہے اس لئے ان پر بات نہیں کی گئی۔ بلوچستان میں جو اردو ڈرامے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں اور موجود ہیں وہ بہت ہی کم ہیں غالباً کل تین ڈرامے ہیں۔ ان میں سے پہلا ڈرامہ شاہین روحی بخاری کا شیرِ بلوچستان ہے۔ یہ تاریخی ڈرامہ بلوچستان کی تاریخ کے ایک اہم کردار بی برک رند کی عاشقانہ زندگی اور جنگی معرکوں پر لکھا گیا ہے۔ بلوچستان کے بعض اہلِ قلم نے اس ڈرامے میں پیش کردہ واقعات پر اعتراضات بھی کئے ہیں۔ ان کے بقول اس میں اس عظیم بلوچ رہنما کی زندگی کی صحیح عکاسی نہیں کی گئی اور اس کی زندگی کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تک تاریخی واقعات کا تعلق ہے تو یہ بات ہر لکھنے والا جانتا ہے کہ ناول یا ڈرارمے میں کسی بھی تاریخی شخصیت کو ہو بہو پیش نہیں کیا جاتا۔ کسی بھی تاریخی موضوع پر لکھنے والا اس میں کچھ نہ کچھ رنگ آمیزی ضرور کرتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ لکھنے والا کسی تاریخی کردار کو بعینہ پیش کرے جیسا کہ وہ تاریخی کتب میں مذکور ہے یا کسی علاقے کے لوگوں میں اس کی جو ذہنی تصویر محفوظ ہے۔ اگر وہ اس طرح کرے تو اس کی تحریر تاریخی مضمون کہلائے گی۔ ہر لکھاری اور مصنف لکھتے ہوئے کئی طرح کی معلومات حاصل کرتا ہے، خود مطالعہ کرتا ہے اور پھر جیسے اسے مناسب لگتا ہے، وہ کسی کردار کی بناوٹ اور اٹھان اسی طرح کرتا ہے۔ فکشن کو فکشن ہی لینا چاہیے

اسے تاریخی حقائق سے گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے۔ شاہین روحی بخاری نے ایک خاتون ہوتے ہوئے بڑی عمدگی سے اس ڈرامے کو لکھا ہے اس کا پلاٹ، کردار اور مکالمے بہت مضبوط اور اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کسی جگہ واقعے کو اس طرح نہ دکھایا گیا ہو جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی تحریر ایک ادبی ڈرامے کے تمام لوازمات پر پورا اترتی ہے اور یہ ایک کامیاب ڈرامہ ہے ایک ایسا ڈرامہ جس کی دوسری مثال بلوچستان کی ادبی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

اس کے علاوہ جو دیگر ڈرامے کتابی شکل میں دستیاب ہیں یعنی گرد باد اور اجنبی یہ دونوں ٹیلی ویژن کے لئے لکھے گئے ہیں۔ یہ ڈرامے چونکہ کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اس لئے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ڈرامے ادبی ڈرامے کی تعریف پر پورا نہیں اترے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے ایک ڈرامے یعنی گرد باد میں جس جاگیردارانہ معاشرت اور اور کردار نگاری کی عکاسی کی گئی ہے وہ بلوچستان کے منظر نامے سے متعلق ہے۔ یوں اس میں بلوچستان کا سماج اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جبکہ کرداروں کی زبان اور لب و لہجہ بھی بعض جگہ مقامی اثرات لئے نظر آتا ہے۔ تاہم جیسا کہ کہا گیا ہے یہ ڈرامہ ادبی ڈرامے کے معیار پر پورا نہیں اترتا ہے اور یہی صورت منیر بادینی کے ڈرامے اجنبی کی ہے۔

بلوچستان میں خاکہ نگاری کے ضمن میں کل دو چار کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں سے دو تو وحید زہیر کی ہیں۔ وحید زہیر کے خاکے تاثراتی خاکوں پر مشتمل ہیں۔ ان کے تمام خاکے بلوچستان کی معروف شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں عطا شاد اور شاہ محمد مری بھی شامل ہیں جن سے خاکہ نگار کا قریبی تعلق رہا ہے اور مست توکلی اور یوسف عزیز مگسی بھی ہیں جو بالترتیب انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں گزرے ہیں۔ اس لئے ان کو خاکہ کہنا ایک مشکل امر ہے۔ وحید زہیر کی تحریر کی سب سے بڑی خامی قافیہ آرائی ہے۔ وہ کسی بھی شخص پر لکھتے ہوئے قافیہ در قافیہ اپنے خیالات کو لکھتے جاتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے نثر میں شاعری کی ہے مگر اس سے نہ صرف خاکہ کا تصور مجروح ہوتا ہے بلکہ موضوع خاکہ کے متعلق وہ تمام ذاتی اور شخصی معلومات نہیں ملتیں جن کی توقع ایک خاکے سے ہوتی ہے۔ وحید زہیر خاکہ لکھتے ہوئے اگر ایک نظر جدید خاکے کو دیکھ لیتے تو وہ یقیناً اچھے اور بہتر خاکے لکھ سکتے تھے۔ ان کی دونوں کتابوں عکس اور برملا کی ادبی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے البتہ اس کے مطالعے سے بعض شخصیات کے متعلق کچھ بنیادی معلومات بہر حال مل جاتی ہیں۔

وحید زہیر کے علاوہ شاہ محمد مری نے بھی اپنے دوستوں اور شناساؤں کو خاکے کے لباس میں پیش کیا ہے۔ شاہ محمد مری نے خاکہ لکھتے ہوئے موضع خاکہ کے متعلق زیادہ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ انہوں نے جن شخصیات کو قریب سے اور جس ''آن میں'' دیکھا اسے اپنے مرقعوں میں اسی طرح پیش کر دیا۔ ان کا قلم تیز کاٹ رکھتا ہے۔ اس لئے جملہ لکھتے ہوئے وہ بعض اوقات اپنے ممدوح کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس پر تنقید بھی کر جاتے ہیں اس سے پڑھنے والے کو تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی اہم تحریروں میں کوکو عالیہ اسماء سائمن غلام قادر اور ڈاکٹر امیر الدین کے خاکے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مشتاق احمد یوسفی اور افتخار عارف پر بھی تاثراتی خاکے لکھے ہیں۔ ان میں اگرچہ ممدوحین کی تعریف وتوصیف ملتی ہے مگر ان کی شخصیات کے کچھ رنگ بہرحال قاری کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اردو میں خاکہ نگاری کے حوالے سے اب تک یہی دو لوگ سامنے آئے ہیں یعنی وحید زہیر اور شاہ محمد مری۔ ان میں سے شاہ محمد مری کے خاکے حقیقت کے زیادہ قریب اور خاکے کے فنی پیمانوں پر پورا اترتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کا خاکہ بھی سوانح مضمون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

آپ بیتی بھی خاکے ایسی صنف نثر ہے جس میں شخصیت کے اور حالات و واقعات تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ آپ بیتی اکثر مصنفین خود لکھتے ہیں جبکہ سوانح عمری عموماً دوسرے لوگ لکھتے ہیں۔ اردو میں مولانا الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی نے تنقید کے ساتھ ساتھ سوانی عمری لکھنے کی رسم بھی ڈالی۔ ان کے بعد اردو میں بہت سوانح نگار سامنے آئے ہیں۔

اردو ادب میں سوانح نگاری اور خود نوشت سوانح نگاری بھی آپ بیتی کی ایک مضبوط روایت قائم ہو چکی ہے بلوچستان میں بھی بعض مصنفین نے اپنی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ ان میں انہوں نے اپنی پیدائش سے لے کر بچپن اور جوانی کے حالات، ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے مراحل اور پھر زندگی کے اہم حالات و واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے والا اگر کوئی مصنف ادیب ہو اور سیاسی وسماجی حوالے سے وہ اہم عہدوں پر فائز رہا ہو تو اس کی زندگی دلچسپ واقعات کا مرقع ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کی آپ بیتیاں نہ صرف بہت دلچسپ ہوتی ہیں بلکہ ان میں قاری کے لئے سیکھنے اور تربیت پانے کو بہت سارا مواد پایا جاتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کی شخصیت جتنی اہم اور متحرک ہو اس کی تحریر اس قدر زیادہ وقیع ہوتی ہے اور اس سے ہر طبع کے لوگ لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کی بہتر تفہیم حاصل کر سکتے ہیں۔

بلوچستان میں جو چند ایک آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں۔ وہ ایسے ہی اہم اور اہل علم حضرات نے تصنیف کی

ہیں۔عبداللہ جان جمالدینی کی آپ بیتی لٹ خانہ ،فیض محمد یوسف زئی کی یاداشتیں اورانور رومان کی یاداشتیں ۔یہ تینوں لوگ بلوچستان کے سماج' سیاست اور علمی دنیا کے اہم ترین لوگ ہیں۔ان تینوں کی طویل اور ان تھک خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے۔عبداللہ جان جمالدینی اور فیض محمد یوسفزئی بلوچستان میں ترقی پسند سیاست اور عوامی شعور کی بیداری کی مہم میں اپنا حصہ ڈالتے رہے ہیں۔عبداللہ جان جمالدینی تو ایک دانشور اور استاد بھی ہیں اور بلوچستان سیاست میں بہت متحرک رہے ہیں۔ان کے مقابلے میں انور رومان تاریخ کے استاد ہی نہیں بلکہ ایک مورخ کا درجہ رکھتے ہیں ان کی بلوچستان کی تاریخ پر اہم کتب ہیں۔وہ ماہر تعلیم بھی ہیں اور ان کا تعلق دائیں بازو کی سیاست ودانش سے جڑا ہے۔وہ خود کو تحریک پاکستان کا ایک اعلیٰ رکن سمجھتے ہیں اور اسی کے لئے ان کی زندگی وقف رہی ہے۔اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک صاحب طرز منصف ہیں جن کا اپنا ایک انفرادی اور خوبصورت اسلوب ہے۔

عبداللہ جان جمالدینی کی کتاب لٹ خانہ دراصل بلوچستان میں ساٹھ اور ستر کی دہائی میں سیاست اور عوامی شعور کی بیداری کے لئے عملی جدوجہد کی داستان ہے انہوں نے اپنے بعض رفقا سائیں کمال خان شیرانی ،ڈاکٹر خدائیداد اور انجم قزلباش وغیرہ کے ساتھ کوئٹہ کے ایک مکان سے جو تحریک شروع کی۔اس نے اپنے زمانے میں کافی لوگوں کو متاثر کیا۔یہ لوگ نہ صرف بائیں بازو کا ادب پڑھتے بلکہ کمیونزم کے عملی نفاذ کے لئے بھی نوجوانوں کو آمادہ اور تیار کرتے۔لٹ خانہ اس گزرے دور کی ایک خوبصورت اور دل گداز روداد ہے ان حضرات کی اہم بات یہ ہے کہ تمام تر مارکیست کے باوجود ان میں سے اکثر لوگ نہ صرف مذہب سے جڑے رہے بلکہ عملی طور پر اس پر تا آخر کاربند بھی رہے۔یہ ایک ایسی عجیب چونکا دینے والی بات ہے جس سے بیرون بلوچستان بہت کم لوگ واقف ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ لوگ اس عہد یعنی پچاس پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں پاکستان کا واحد کمیونسٹ طبقہ تھا جن میں مذہب بیزاری بالکل نہیں ملتی۔یہ بجائے خود ایک عجیب بات ہے۔اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بلوچستان کا قبائلی معاشرہ ہے جس میں انسان اپنے رسم ورواج اور مذہب کو ترک نہیں کرسکتا۔یہی رستہ ان لوگوں نے اختیار کیا۔یہ لوگ کبھی کسی کے خلاف نہ ہونے بلکہ انہوں نے ہمیشہ انعام الحق کوثر اور انور رومان جیسے مذہبی اور تحریک پاکستان سے جڑے ہوئے لوگوں سے اپنے روابط استوار رکھے اور ضرورت پڑنے پر انہیں بھی اپنی محفلوں میں شریک کیا اور خود بھی ان کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ ماضی کے بلوچستان میں بھائی چارے کی اپنی ہی فضا قائم تھی۔ان لوگوں میں آپس میں بیر اور عداوت بالکل نہ تھی۔بلوچستان کے تمام صحافی' ادیب شاعر اور اساتذہ مل جل کر رہتے تھے۔یہ وہ

رویہ ہے جسے آج کے نوجوان ادیبوں کو سیکھنا چاہیے، لٹ خانہ اور یاداشتیں ایسی کتب ہیں جن سے یہ سبق بخوبی سیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے اور انتشار زدہ بلوچستان میں ایک بہتر اور صحت مند معاشرے کی تشکیل ممکن ہوسکتی ہے۔

بلوچستان کی مختلف نثری اصناف کے جائزے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ افسانے اور ناول کے بعد جس نثری صنف میں زیادہ لکھا گیا ہے وہ سفر نامہ ہے۔ سفر نامہ وہ سفری دستاویز ہوتی ہے جس مین کوئی بھی مصنف یا ادیب اپنے سفر کے دوران پیش آمدہ حالات، واقعات اور نئی دنیا دیکھتے ہوئے اپنی ذاتی احساسات رکھتا ہے۔ سفر نامے کو پڑھنے والا قاری گھر بیٹھے مختلف ملکوں کی سیر کر لیتا ہے نہ صرف وہاں کے موسم اور منظر دیکھتا بلکہ ان معاشروں کے لوگوں کی زندگی اور ثقافت سے بھی آگاہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے دنیا بھر کی زبانوں میں سفر نامے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

بلوچستان کے جن ادیبوں اور صحافیوں کو صوبے یا ملک سے باہر جانے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے واپسی پر مذکورہ ملک کا سفر نامہ لکھ دیا۔ اس حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ بلوچستان کے کسی سفر نامہ نگار نے اپنا سفر طرف دنیا دیکھنے اور اس کے حالات بیان کرنے یعنی سفر نامہ لکھنے کی غرض سے نہیں کیا جیسا کہ اردو میں عصر حاضر کی ایک اہم مثال مستنصر حسین تارڑ کی ہے جن کے اولین سفر نامے کا نام ہی نکلے تری تلاش میں ہے۔ اس عنوان سے ظاہر ہے کہ لکھنے والا کسی شے کی جستجو میں ہے وہ ملک کے لوگوں کا طرز حیات بھی ہوسکتا ہے اور دنیا دیکھنے کا جذبہ بھی ۔ بلوچستان کے سفر نامہ نگاروں کا جہاں تک تعلق ہے یہ سارے لوگ دراصل کسی اور مقصد کے لئے ملک سے باہر گئے مثلاً ٹریننگ پانے، کسی ملک کی دعوت پر مطالعاتی دورے یا اپنے محکمے سے متعلق کوئی کورس، یا پھر صحافت کے حوالے سے صحافیوں کے ہمراہ دورہ۔ ان لوگوں نے اولین فرض کے طور سے اپنی ٹریننگ مکمل کی، تربیت پائی۔ اس دوران انھیں خود گھومنے کا موقع ملا یا میز بانوں نے انہیں جہاں جہاں گھمایا۔ وہاں کے حالات واقعات اور اس سفر کی داستان انہوں نے واپسی پر سپرد قلم کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر سفر ناموں میں ان کی ذات کا بیان زیادہ ملتا ہے جبکہ میز بان ملک کا نظارہ کم کم۔ کئی سفر ناموں میں مصنف ایسی باریک تفصیلات بھی لکھ جاتا ہے جو عموماً سفر ناموں میں نہیں ملتی مثلاً ٹکٹ کی قیمت، باتھ روم کا حال اور نماز وغیرہ پڑھنے ایسی ذاتی مصروفیات، تاہم کچھ سفر نامے اچھے بھی لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک چین آشنائی شاہ محمد مری کے قلم سے ہے۔ اس میں آج کے جدید چین کا

آنکھوں دیکھا حال اور لمحہ بہ لمحہ کیفیت خوبصورت انداز میں بیان ہوتی ہے۔ مصنف چین کے مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے کئی جگہ اپنے علاقے اور صوبے کو تقابلی انداز میں بھی یاد کرتا ہے اس کی تحریر میں مقامی رنگ بطور خاص اجاگر ہوتا ہے۔ شاہ محمد مری کے ہاں کچھ مقامات پر تاریخ کا تذکرہ اور جدید چین کے معاشی نظام پر تنقید بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ مجید اصغر کا امریکہ کا سفرنامہ رفت گذشت اور یعقوب شاہ غرشین کے سفرنامہ جاپان عزم و حوصلے کی سرزمین بھی اچھے سفرنامے لکھے جاسکتے ہیں ان میں نہ صرف ان ملکوں کا دلچسپ احوال ملتا ہے بلکہ مصنفین کی ذاتی دلچسپیاں اور شوخی تحریر بھی نمایاں ہوتی ہے مجید اصغر روزنامہ جنگ کوئٹہ کے مدیر کے طور پر امریکہ گئے جبکہ غرشین ایک افسانہ نگار ہیں ان دونوں کو نہ صرف نثر لکھنے پر مہارت حاصل ہے بلکہ ان کی نثر ایک خاص طرح کی شگفتگی بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس لئے یہ سفرنامے اب تک لکھے گئے سفرناموں میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ بلوچستان کی ایک خاتون صحافی زیب النساء غرشین نے بھی بیرون ملک سفر کئے اور ان کا حال اپنی دو کتابوں دیوتا دیس کے درشن یہ نیپال کا سفرنامہ ہے اور دوسری چلتن سے چین تک میں لکھا ہے۔

زیب النساء بلوچستان کی پہلی سفرنامہ نگار نہیں ہیں ان سے پہلے شاہدہ بخاری کا سفرنامہ انجانے دیس میں شائع ہو چکا ہے۔ طرز نگارش اور تفصیلات سفر کے حوالے سے البتہ زیب النساء کے سفرنامے زیادہ بہتر کہے جاسکتے ہیں۔ بلوچستان میں اب تک صرف انہی دو خواتین کے سفرنامے شائع ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک قبائلی سماج کے باعث بلوچستان کی بہت خواتین نہ صرف تعلیم حاصل نہیں کر پاتیں بلکہ انہیں باہر جانے کا موقع بھی کم ہی ملتا ہے۔ اب تک تو یہ ایک روایت رہی ہے کہ صرف حج بیت اللہ اور علاج کی غرض سے ہی خواتین باہر جاتی رہی ہیں۔ اب نئی صدی میں البتہ لڑکیاں پڑھنے کی غرض سے بھی ترقی یافتہ ملکوں کی جامعات میں داخلہ رہی ہیں۔ شاید اس سے کچھ فرق پڑے اور آنے والے سالوں میں مزید کسی خاتون کا سفرنامہ سامنے آئے۔ بلوچستان میں کچھ مختصر سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں یہ ایسے نوجوانوں نے لکھے جنہیں چند دن کے لئے دہلی یا ڈھاکہ جانے کا موقع ملا اور اس سفر کی روداد انہوں نے واپسی پر لکھ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی کتب سفرنامے کی بجائے رپورتاژ کا احساس ہوتا ہے۔ مگر لکھنے والوں نے انہیں سفرنامہ قرار دے دیا۔ حالانکہ ان میں رپورتاژ کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جبکہ ان میں سفرنامے کے رنگ بہت کم ملتے ہیں۔

نثر میں مزاح لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو مزاح کے مجموعی منظرنامے پر بھی صرف چند نام ہی

جگمگاتے ہیں۔ بلوچستان میں بھی صرف ایک آدھ کتاب ایسی ملتی ہے جس میں مزاحیہ مضامین شامل ہیں یہی کیفیت اردو انشائیے کی ہے۔ انشائیہ بھی یہاں نہیں لکھا گیا بعض لکھنے والوں نے اپنی بعض تحریروں کو انشائیہ قرار دیا ہے مگر درحقیقت وہ انشائیے کی تعریف پر پورا نہیں اترتے۔ رب نواز مائل نے البتہ کچھ انشائیے لکھے ہیں جو اوراق میں شائع ہوئے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ بخاری،شاہین روحی، شیرِ بلوچستان ،بلوچی اکیڈمی،کوئٹہ،۱۹۸۰ء

۲۔ یہ ڈراما پاکستان ٹیلی ویژن سینٹر کوئٹہ سے نشر ہو چکا ہے۔

۳۔ اوریا مقبول جان، گرد باد ،زمرد پبلیکیشنز،کوئٹہ،۱۹۹۴ء ص ۵

۴۔ ایضاً،ص ۱۰

۵۔ بادینی،منیر احمد، اجنبی ، نیو کالج پبلیکیشنز،کوئٹہ، ۲۰۰۱ء ص ۴

۶۔ حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف ،اسلوب،لاہور،۲۰۱۵ء ص ۱۲۱

۷۔ وحید زہیر، برعکس، براہوی ادبی سوسائٹی،کوئٹہ،۲۰۰۱ء،ص ۲۸

۸۔ مری،شاہ محمد، وفا کا تذکرہ ،مہردر ،کوئٹہ،۲۰۱۱ء ص ۱۷۴،۱۷۵

۹۔ ایضاً،ص ۱۷

۱۰۔ ایضاً، عشاق کا قافلہ ،سنگت اکیڈمی آف سائنسز،کوئٹہ،۲۰۱۶ء ص ۱۸

۱۱۔ جمیل زبیری،رفتارِ حیات ،مکتبہ دانیال،کراچی،۲۰۰۳ء،ص ۳۷

۱۲۔ شاہدہ بخاری،یہ پیارے لوگ شاد پبلیکیشنز،کوئٹہ،۲۰۰۶ء،ص

۱۳۔ امداد نظامی، کھیم کرن تا مونا باؤ،وجدان پبلیکیشنز،کوئٹہ،۲۰۰۳ء،ص ۲۹

۱۴۔ جمالدینی،عبداللہ جان، لٹ خانہ ،سنگت اکیڈمی آف سائنسز،کوئٹہ،۲۰۱۳ء بار دوم ص ۱۴

۱۵۔ یوسفزئی،فیض محمد،ملک،یاداشتیں پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن بلوچستان،کوئٹہ،۱۹۹۷ء،ص ۸۸

۱۶۔ محمود ولی شاہ،ڈاکٹر،آپ بیتی ، بلوچستان بیتی ،کلاسیک،لاہور،۲۰۰۸ء ص ۱۱۵۔۱۱۸

۱۷۔ بوہرہ،سیف الدین، ایسا بھی ہوتا ہے شاد پبلیکیشنز،کوئٹہ،۲۰۰۵ء،ص ۱۰۰

۱۸۔ پشتون،عبدالفتح، سمندر جزیرہ میں رضا پرنٹرز،کراچی،۱۹۸۳ء،ص ۸

۱۹۔ ایضاً،ص ۷۷

۲۰۔ مجید اصغر، رفت گزشت الحمد، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰-۲۱

۲۱۔ شاہدہ بخاری، انجانے دیس میں، قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱

۲۲۔ مری، شاہ محمد، چین آشنائی سانجھ، لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۴۵

۲۳۔ امداد نظامی، دوستوں کے درمیان وجدان پبلیکیشنز، کوئٹہ، ۲۰۰۲ء، ص ۴۳

۲۴۔ غرشین، یعقوب شاہ، عزم و حوصلے کی سرزمین قلات پبلیکیشنز، کوئٹہ، ۲۰۰۷ء، ص ۴۵

۲۵۔ غرشین، زیب النساء، چلتن سے چین تک گوشہ ادب، کوئٹہ، ۲۰۱۲ء ص ۱۸۰

۲۶۔ ایضاً، دیوتا دیس کے درشن مہردر، کوئٹہ، ۲۰۱۴ء، ص ۴۲

۲۷۔ اچکزئی، نصیب اللہ، چمن سے دہلی تک گوشہ ادب، کوئٹہ، ۲۰۱۵ء، ص ۴۳

۲۸۔ عبدل، عبد العلی، وحشت ناک سفر دار الشعور، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۵

۲۹۔ ایضاً، ص ۶

۳۰۔ بیلوی، اللہ داد، سفرنامہ بیلہ، آواران پبلشرو پریس ندارد، حب [بلوچستان]، ۲۰۰۵ء

۳۱۔ آغا صادق، تبسمات بولان مسلم پریس، کوئٹہ، ۱۹۷۱ء، ص ۴۸

۳۲۔ معین الحق، مکھن محمدی پبلشنگ کمپنی، کوئٹہ، ۱۹۸۳ء، ص ۲۳

۳۳۔ حمید اللہ، صاحبزادہ، ابو الانشاء کے انشائیے قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۰۸ء، ص ۴

حاصل مطالعہ

بلوچستان میں مہر گڑھ کی صورت جو تاریخی اور تہذیبی آثار موجود ہیں، وہ یہاں انسان کے ابتدائی تمدن کی داستان سناتے ہیں۔ برصغیر کے یہ قدیم آثار ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیق کے منتظر ہیں تا کہ جامع اور مکمل مطالعے کے بعد ان کی صحیح قدر و قیمت اور زمانہ متعین ہو سکے۔ عہد پارینہ کی یہ باقیات قدیم زمانے میں بلوچستان کی اہمیت ثابت کرتی ہیں۔ بلوچستان قدیم ادوار میں اہم فوجی لشکروں کی گزرگاہ رہا ہے۔ سکندر اعظم نے اپنی فتوحات کے بعد واپسی بلوچستان ہی کے راستے کی تھی۔ یہاں سے گزرتے ہوئے اسے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام برصغیر میں سندھ کی بجائے پہلے پہل بلوچستان کے مختلف علاقوں میں پھیلا تھا۔ محمد بن قاسم کے آنے سے پہلے ہی اسلام یہاں پہنچ گیا تھا۔ محمد بن قاسم بھی سندھ یا دیبل فتح کرنے سے پہلے یہاں آیا تھا۔ اس نے اپنی فوج کے ساتھ دو چار مہینے یہاں قیام کیا تھا۔ اس کے بعد وہ بحری کی بجائے خشکی کے راستے بلوچستان سے ہوتا ہوا دیبل پہنچا تھا۔

صوبہ بلوچستان اگرچہ اردو زبان و ادب کے اہم مراکز سے طویل مکانی فاصلے رکھتا ہے مگر فارسی کی اولین شاعرہ رابعہ خضداری کی صورت برصغیر کی قدیم ترین ادبی روایت کا اعزاز بہرحال اسے حاصل ہے۔ رابعہ خضداری تقریباً ہزار سال قبل یہاں فارسی میں شعر کہتی رہی ہے۔ وہ فارسی کے اولین بزرگ شاعر رودکی کی ہمعصر تھی۔

بلوچستان کی ادبی روایت مختلف زبانوں براہوئی، بلوچی، پشتو اور فارسی کے ادبیات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر زبان میں نظم و نثر کا ایک بڑا اور وقیع سرمایہ موجود ہے جو سنجیدہ تحقیق و تنقید کا تا ہنوز منتظر ہے۔ بلوچستان میں اُردو کا تدریسی اور دفتری نفاذ اگرچہ یہاں انگریزوں کے قبضے کے بعد ہوا مگر بلوچستان میں اُردو کا پہلا شاعر محمد حسن براہوئی انگریز کی آمد سے نصف صدی قبل اُردو میں اپنا دیوان مرتب کر چکا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں انگریز منتظم رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ آنے والے ہتورام نے یہاں اُردو میں اولین کتب گل بہار اور بلوچی نامہ تصنیف کیں جبکہ اس کی آخری کتاب تاریخ بلوچستان ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ اردو زبان میں بلوچستان کی اولین تاریخ ہے۔ ہتورام کا اسلوب داستانوی ہے۔ یہ انیسویں صدی کے اردو لکھاریوں جیسا پر تکلف، پر تصنع اور دفتری اردو سا ہے۔ بلوچستان پر انگریز قبضے کے تناظر میں ان کتب کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کتب کے علاوہ بھی بلوچستان میں اردو مکاتیب کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ دفتری اور نجی خطوط پر مشتمل ہے جو مختلف تنقیدی رجحانات کے تناظر میں الگ الگ مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس مقالے کی تحدید کے پیش نظر یہاں ان سب کا

سرسری جائزہ ہی پیش کی جاسکا ہے۔ بلوچستان میں انگریز عہد میں مقامی اور غیر مقامی پڑھے لکھے لوگ مختلف عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف اردو جانتے تھے بلکہ اردو تحریر پر بھی عبور رکھتے تھے۔ ایک ایسی مثال پشین سے تعلق رکھنے والے قاضی جلال الدین خان کی ہے۔ انھوں نے اردو میں ایک رپورٹ بعنوان رپورٹ بندوبست پشین ۱۸۹۹ء میں تحریر کی تھی۔ اس غیر مطبوعہ رپورٹ کی بازیافت اور اس کا تجزیاتی مطالعہ پہلی بار اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ قاضی جلال الدین خان کو اُردو نثر لکھنے پر خاصی قدرت حاصل تھی۔ اس رپورٹ کی تحریر سے اس کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ ابتداء ہی سے ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ لوگ یہاں اُردو شعر وسخن کی محفلیں سجاتے رہے ہیں اور یوں بلوچستان میں اُردو زبان میں تخلیق ہونے والا اولین ادبی سرمایہ وجود میں آیا۔ اس کی ایک مثال عابد شاہ عابد کا شعری مجموعہ گلزار عابد ہے جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ قیام پاکستان سے قبل کے زمانے میں یوسف عزیز مگسی کے اُردو مکاتیب اپنے خوبصورت اسلوب اور متنوع سیاسی وسماجی موضوعات کے حوالے سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے نہ صرف اس زمانے کے سیاسی حالات سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ ان میں ایسے دانش آمیز نکات موجود ہیں جن کی پڑھت سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یوسف عزیز مگسی کا اسلوب نہایت پختہ اور منجھا ہوا ہے۔ اس سے ان خطوط کی ادبی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ بلوچستان کے ادبی اور علمی حلقوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اردو میں کلاسیک کا درجہ پانے والے ناول امراؤ جان ادا کی تخلیق یہاں ہوئی تھی۔ اس مقالے میں دلائل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ اگرچہ مرزا محمد ہادی رسوا بلوچستان میں ۱۸۸۵ء میں ریلوے لائن بچھانے کے دوران ملازمت کرتے رہے ہیں مگر وہ یہاں صرف چھ ماہ قیام پذیر رہے۔ انھوں نے امراؤ جان ادا یہاں سے واپس جانے کے بعد ۱۸۹۹ء میں لکھا تھا۔ اس لیے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ امراؤ جان ادا بلوچستان میں ہرگز نہیں لکھا گیا۔

بلوچستان میں اُردو میں تخلیقی نثر کی شروعات کب ہوئیں اور اردو کے اولین مصنفین کون ہیں؟ یہ اب تک ایک متنازعہ سوال رہا ہے۔ کوئی محقق یا نقاد اس سوال کا قطعی جواب نہیں دے سکتا۔ بلوچستان میں عام طور پر یوسف عزیز مگسی کی ایک تحریر ''تکمیل انسانیت'' کو اُردو کا پہلا افسانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس مقالے میں پہلی بار اس کے متن کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اسے بہ طور افسانہ رد کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں اردو کے پہلے افسانے کے ضمن میں ضیاء الرحمٰن کی تحقیق ''ایک سربستہ راز کا انکشاف یا غیبی امداد'' کو بھی فنی نقطہء نظر سے بہ طور افسانہ رد کیا گیا ہے۔ اس ساری بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ قیام پاکستان سے قبل بلوچستان کے بعض لکھاریوں نے افسانہ

لکھنے کی کوشش کی ہے مگر افسانے کے فن کی باریکیوں سے آگاہ نہ ہونے کے سبب وہ افسانہ لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی تحریروں میں مافوق الفطرت کرداروں کی موجودگی، بیانیہ کی عدم موجودگی اور غیر افسانوی انداز بیان انھیں کسی طور افسانہ ثابت نہیں کرتا۔

یہی صورتحال پہلے اردو ناول کے بارے میں ہے۔ قیام پاکستان سے قبل لکھے گئے اولین اردو ناول کا تذکرہ بھی انعام الحق کوثر کی کتاب بلوچستان میں اردو میں ملتا ہے۔ حالانکہ یہ ناول دستیاب ہے نہ ہی اس کا تذکرہ اردو ناول کی تنقیدی کتب میں ملتا ہے۔ پھر اس کا عنوان ''محبت کا دیوتا عرف برابر کی چوٹ'' اس بات کی علامت ہے کہ یہ ہرگز سنجیدہ ناول نہیں ہوسکتا البتہ ایک عامیانہ، رومانوی قصہ ضرور ہوسکتا ہے جو شاید ہی ناول کی تعریف پر پورا اُترتا ہو لیکن جب تک کوئی محقق اس ناول کی دستیابی کو ممکن نہیں بناتا۔ ایک ادبی ناول کے طور پر اس کا وجود تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے بہ طور ناول اس کے امکان کو رد کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ بلوچستان میں اردو کا پہلا ناول نسیم حجازی کا داستان مجاہد ہے۔ نسیم حجازی کوئٹہ میں ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۹ء قیام پذیر رہے۔ وہ یہاں ایک اخبار تنظیم کے مدیر تھے۔ انھوں نے بلوچستان میں تحریک پاکستان کے حوالے سے بھی سرگرم کردار ادا کیا۔ یاد رہے کہ تنظیم بلوچستان میں تحریک پاکستان کے ایک راہنما جعفر خان جمالی کا اخبار تھا۔ نسیم حجازی تحریک پاکستان کے دیگر راہنماؤں سے بھی مراسم رکھتے تھے اور انھوں نے بلوچستان کی پاکستان میں شمولیت کے حوالے سے کافی کام کیا۔ بہت کم لوگ نسیم حجازی کے اس کردار سے آگاہ ہیں۔ نسیم حجازی نے کوئٹہ میں قیام کے دوران داستان مجاہد کے علاوہ جو دیگر ناول لکھے ان میں محمد بن قاسم، شاہین، آخری چٹان اور ایک مزاحیہ کتاب سو سال بعد لکھی تھی۔ دستیاب شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلوچستان میں لکھا جانے والا اُردو کا پہلا ناول نسیم حجازی کا داستان مجاہد ہے اور جیسا کہ نسیم حجازی کے دوسرے ناول ہیں، اس ناول کا رجحان بھی اسلامی اور تاریخی ہے۔ بلوچستان کے اُردو ادب سے متعلق تنقیدی کتب میں نسیم حجازی کا تذکرہ ملتا ہے، نہ ہی ان کے بلوچستان میں لکھے گئے ناولوں کے بارے میں لوگ آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کے بعض ادیب یہ سمجھتے ہیں: ''بلوچستان کی زمین ایسی ہے کہ یہاں نسیم حجازی نہیں اُگتے''۔ اگر چہ یہ جملہ ایک خاص سیاسی سوچ کو ظاہر کرتا ہے مگر یہ اس بات کی علامت ہے کہ لکھنے والے کو حقائق سے پوری آگاہی نہیں۔ نسیم حجازی بے شک بلوچستان میں پیدا نہ ہوئے ہوں مگر بطور ناول نگار انھوں نے بلوچستان ہی میں جنم لیا ہے۔ اور انھیں اپنے تخلیقی کام کے دوران بعض بلوچستان اکابرین کی مدد اور معاونت حاصل رہی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

قیام پاکستان سے قبل بلوچستان میں اُردو میں تخلیقی نثر قریباً مفقود ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بلوچستان کی اس نئے ملک میں شمولیت کے بعد جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں خاطر خواہ ترقی اور نشوونما ہوئی ، نئے تعلیمی ادارے کھلے، پہلے سے موجود تعلیمی اداروں کواَپ گریڈ کیا گیا اور نئے مضامین میں پہلے بی۔اے اور بعد میں ایم۔اے سطح کی تعلیم کا آغاز ہوا یوں ہر شعبہ زندگی اور سماج میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے۔اس کا مثبت اثر یہاں اُردو زبان وادب کے ارتقاء پر ہوا۔ یہاں کے مقامی اور غیر مقامی لوگ اُردو میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کھل کر کرنے لگے۔ بلوچی اور پشتو زبان بولنے والے اپنی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی ذریعہ ابلاغ بنانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان میں آج بھی ذواللسان ادیب کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بلوچستان میں اُردو کا پہلا باقاعدہ افسانہ نگار انور رومان ہے جس نے اولین طور پر یہاں متعدد افسانے مثلاً ویری ناگ، آوازوں کا جلوس، اور دیگر بہت سے افسانے لکھے۔ بعد کے زمانے یعنی ۱۹۶۳ء میں انور رومان نے اردو میں نثری نظمیں بھی لکھیں جو شاید بلوچستان بلکہ پاکستان میں اولین نثری نظمیں ہیں۔اس کے علاوہ بھی انور رومان نے بلوچستان کی تاریخ وثقافت اور اردو ترجمے میں خاصا کام کیا ہے۔وہ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ومترجم ہیں۔ انور رومان کے بعد اہم افسانہ نگار سید خلیل احمد ہیں جن کا افسانہ مجموعہ خمار زہر آلود ۱۹۶۸ء میں کوئٹہ سے شائع ہوا تھا۔ یہ بلوچستان کا پہلا مطبوعہ افسانوی مجموعہ ہے۔ ستر اور اسی کی دہائی میں بلوچستان میں اُردو افسانے کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جب لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی۔ یہ لوگ جدید تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ انھوں نے اُردو ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ لہٰذا ان کی تحریریں اُردو افسانہ کے کم از کم معیار پر پورا اترتی ہیں۔ان میں فردوس انور قاضی، خادم مرزا، طاہر محمد خان، معین الحق اور آغا گل وغیرہ شامل ہیں۔ان لکھنے والوں کے ہاں نہ صرف موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے بلکہ انھیں زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ان کے موضوعات میں غربت، کسمپرسی، عدم مساوات اور طبقاتی تفریق نمایاں ہے۔ ان کی تحریروں میں مقامی سماج وثقافت کا عنصر بھی ملتا ہے۔کئی افسانوں میں کردار بھی مقامی ہیں اور ان کا لہجہ بھی، یعنی زبان کی سطح پر بھی مقامیت کا رجحان ملتا ہے۔ان تخلیق کاروں کا سیاسی وسماجی شعور بلند سطح رکھتا ہے۔اس لیے ان کی تحریروں میں فنی اور فکری پختگی جھلکتی ہے۔آغا گل کے سب سے زیادہ مطبوعہ افسانوی مجموعے ہیں اور اس کا غالب رجحان سیاست ہے۔آغا گل کے افسانوں میں کردار، مقام اور زبان کا لہجہ کا مقامی ہے۔اس کے ہر افسانے میں بلوچستان کسی نہ کسی حوالے سے اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ بلوچستان کا احساس محرومی اور سیاسی ابتری اس کے افسانوں

میں زیادہ نظر آتی ہے۔اس کے افسانوں میں بعض فنی کمزوریاں البتہ پائی جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان اکثر افسانوی مجموعوں کے باوجود اسے ملکی سطح پر نمایاں مقام نہیں مل سکا۔ ان مرد افسانہ نگاروں کے پہلو بہ پہلو بلوچستان کی خواتین افسانہ نگار بھی اپنے تخلیقی وجود کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ بلوچستان کی ان اولین خاتون افسانہ نگاروں میں رفعت زیبا، شاہین روحی بخاری اور فردوس انور قاضی کے نام اہم ہیں۔ یہ خواتین افسانہ نگار بھی افسانے کے کم از کم فنی تقاضے پورے کرتی ہیں۔ان کے موضوعات میں وسعت اور انداز بیان پختہ اور دلچسپ ہے۔ان میں سے بعض نے نہایت نازک موضوعات پر بھی اپنا قلم اٹھایا ہے۔مثلاً شاہین روحی بخاری کا افسانہ ''فتنے منہ'' ماں بیٹے کے جنسی تعلق کے موضوع پر ہے۔ بلوچستان جیسے علاقے کی ایک خاتون کے قلم سے تحریر شدہ اس افسانے پر حیرت ہوتی ہے۔ مصنفہ نے کمال مہارت سے اپنے موضوع کو نبھایا ہے۔ستر اور اسی کی دہائی میں لکھے گئے افسانوں میں جو نسوانی کردار نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر مقامی کردار ہیں۔ یہ کردار بڑے بھرپور اور زندگی سے سرشار ہیں اور مختلف رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کرداروں کی نسائی یا تانیثی پڑھت ابھی تک نہیں کی گئی جو بلوچستان کی ثقافتی اور سماجی اقدار کی تفہیم میں مدد دیتی بلکہ یہ اردو تنقید میں ایک اہم اضافہ ہوسکتی ہے۔

اس دور کے بعد بھی کئی اچھے لکھنے والے سامنے آئے۔اس ضمن میں یعقوب شاہ غرشین کا نام مثال کے طور پر لیا جاسکتا ہے جس کے افسانوں میں شہری اور دیہی ہر دو طرح کے کردار ملتے ہیں۔غرشین کا اسلوب پختہ اور رواں ہے اسے اُردو نثر لکھنے پر دسترس حاصل ہے۔غرشین بلوچستان کی دیہی ثقافت اور دیہات کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتا ہے۔ بلوچستان کی نوجوان نسل اکیسویں صدی میں اُردو افسانے کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔مثلاً عابد میر، اسرار شاکر اور زیب لونی وغیرہ۔ان میں سے عابد میر کے تین جبکہ دوسروں کے ایک ایک افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ یہ نوجوان نسل سیاسی اور سماجی طور پر زیادہ باشعور ہے جو اپنی کہانیوں کا بیشتر مواد اپنے گردوپیش سے حاصل کرتی ہے اور اسے خوبی کے ساتھ کہانی کے روپ میں پیش کردیتی ہے۔ان میں سے بہتر ادب تخلیق کرنے والے کا فیصلہ مستقبل میں ہوگا۔

بلوچستان کے اردو افسانے میں ایک اہم مسئلہ کرافٹ کا ہے۔ یہاں کے افسانہ نگار افسانہ لکھنے کے لیے درکار محنت نہیں کرتے وہ سیدھے سبھاؤ، کہانی لکھتے چلے جاتے ہیں۔بعض لوگ تو شاید ایک بار کہانی لکھنے کے بعد نظر ثانی کی زحمت نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں بعض اوقات کچا پن نظر آتا ہے۔افسانے لکھتے ہوئے کئی افسانہ نگار جملے کی ساخت اور بنت پر توجہ نہیں دیتے۔اس وجہ سے بعض اوقات اچھا خاصا جملہ بے رنگ اور

بے ذائقہ ہو جاتا ہے۔ ایک سنجیدہ قاری ان کی تحریروں سے وہ انبساط حاصل نہیں کر پاتا جس کی توقع اعلیٰ ادب سے کی جاتی ہے۔ اگر توجہ اور محنت سے کرافٹ کی ان کمزوریوں کو دور کر دیا جائے تو ان کے افسانے بدرجہا بہتر روپ میں اپنے پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ تعجب اور حیرت یہ ہے کہ نئے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ یہ بات بعض بزرگ افسانہ نگاروں پر بھی صادق آتی ہے۔

بلوچستان میں اگرچہ اُردو میں ناول بہت لکھے گئے ہیں مگر خالصتاً ادبی ناول یہاں ابھی تک ناپید ہے۔ ایسا ناول جو فکر وفن اور اسلوب کی سطح پر مکمل ہو اور جس کا تذکرہ اُردو ناول کے خالصتاً ادبی زمرے میں ہو نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی سطح پر ہونے والے ناول کے تنقیدی مطالعات میں بلوچستان کا ایک ناول بھی نظر نہیں آتا۔

اس تحقیق میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں اُردو کا پہلا ناول مولا بخش محمد شہی کا بندھن ہے جو اصلاحی و اخلاقی رجحان رکھتا ہے۔ یہ نیم ادبی اور نیم کمرشل ناول کے زمرے میں آتا ہے۔ اس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ یہ پچاس کی دہائی میں شائع ہوا۔ یہ قیاس ناول کے متنی مطالعے، ہندو مسلم کردار، بعض مقامات کے پرانے ناموں اور اس میں پیش کردہ زندگی کے منظر نامے کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ اس ناول کے بعد جتنے ناول سامنے آتے ہیں، قریباً وہ سب ہی کمرشل ناول کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان ناولوں کی تخلیق کار بھی زیادہ تر خواتین ہی ہیں۔ ان میں رفعت زیبا، یاسمین صوفی اور حمیدہ جبیں وغیرہ شامل ہیں۔ ان ناولوں کے موضوعات گھریلو نوعیت کے ہیں اور ان میں پیش کردہ معاملات بھی اسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ بعض ناولوں میں البتہ کہیں کہیں نیم فلسفیانہ نکات ملتے ہیں اور مقامی سماج وثقافت کے اہم عناصر بھی۔ فردوس انور قاضی کا ناول خوابوں کی بستی اگرچہ سیاست کے موضوع پر ہے مگر اس کے ابتدائی سو صفحات خاصے غیر دلچسپ اور طویل اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ بعد کے صفحات میں کرداروں میں زندگی کے آثار بھی ملتے ہیں اور کہانی کا ارتقاء اور اختتام بھی کسی حد تک اچھے انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ ناول کراچی کے تناظر میں لسانی شناخت یا سیاست کو موضوع بناتا ہے۔ ہاشم ندیم نے کئی ناول لکھے ہیں یہ سب اگرچہ کمرشل ناول کے دائرے میں آتے ہیں۔ ۔ جو بات اہم ہے وہ یہ کہ مصنف کو اردو زبان پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ اس کے اسلوب میں جذباتیت کا عنصر وافر پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے ناول قاری پر ایک طرح کی رقت طاری کر دیتے ہیں۔ ہاشم ندیم کا موضوع بھی عام طور پر محبت ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے ناول آج ملک بھر میں شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

راز محمد خان کا ناول دی ہولی سینز جنس کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس میں فلسفیانہ طور پر جنسی عمل

کی حمایت ملتی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جنس گناہ کا استعارہ نہیں ہے۔ ناول میں فرائیڈ، ڈیکارٹ اور کافکا کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور شعور لاشعور کی بحث بھی۔ کوئٹہ میں لکھے گئے اس ناول کا لوکیل لاہور ہے، مگر بیانیہ سطح پر اس ناول میں وہ گہرائی و گیرائی نہیں ملتی جس کی ایک اچھے ناول سے اُمید کی جاتی ہے۔ حالیہ سالوں میں بلوچستان کے بعض نئے لکھنے والوں کے چند ناول سامنے آئے ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ سنجیدہ ناول کے زمرے میں نہیں آتے اور ان کا شمار کمرشل ناول میں ہوتا ہے۔ ایسے تمام ناول محبت کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔

افسانے اور ناول کے علاوہ بلوچستان میں تخلیقی نثر کی دیگر اصناف کے تحت بھی ادب لکھا گیا ہے۔ ناول اور افسانے کے مقابلے میں یہ مقدار اور معیار کے لحاظ سے کم ہے۔ اردو نثر کی قریباً سبھی اصناف میں لکھا گیا ہے چاہے وہ ڈرامہ ہو، خاکہ ہو، سفرنامہ، آپ بیتی اور یا پھر انشائیہ نگاری۔ مختلف لکھنے ولوں نے ہر میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔

اگر بلوچستان میں اردو ڈرامے کی بات کی جائے تو یہاں سٹیج اور ریڈیو کے لیے کافی ڈرامے لکھے گئے ہیں مگر اب وہ ناپید ہیں۔ کتابی صورت میں صرف تین ڈرامے دستیاب ہیں۔ ان میں سے بھی دو ڈرامے ٹی وی کے لیے لکھے گئے تھے۔ صرف ایک ڈرامہ شیر بلوچستان ادبی ڈرامے کی صورت لکھا گیا ہے۔ یہ بلوچ تاریخ کے اہم کرداروں چاکر رند اور بی برک رند کو موضوع بناتا ہے۔ گویا یہ ایک تاریخی ڈرامہ ہے۔

خاکہ نگاری میں دو چار کتابیں ملتی ہیں۔ اگرچہ ان کے لکھنے والوں نے خاکہ لکھنے کی کوشش کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے لکھے ہوئے مضمون خاکے کی تعریف پر پورا نہیں اُترتے۔ زیادہ تر یہ مضامین خاکے سے زیادہ تعارفی مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض مضامین میں البتہ خاکے کے اجزاءضرور ملتے ہیں۔

آپ بیتی/یادداشتیں اہم صنف نثر شمار ہوتی ہے۔ بلوچستان میں اس نوع کی کئی اچھی اور اہم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں لٹ خانہ از عبداللہ جان جمالدینی، رومانیے از انور رومان اور یادداشتیں از ملک فیض محمد یوسفزئی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین نے بلوچستان میں علم وادب کی ترویج اور سیاسی شعور کے پروان چڑھانے میں اپنی عمر گزاری ہے۔ ان کی اپنے وقتوں میں اہم لوگوں سے شناسائی اور رابطے ہوئے۔ اس کا دلچسپ احوال ان تمام یاداشتوں میں ملتا ہے۔ یہ کتب بلوچستان کی معاصر تاریخ کو سمجھنے کا بھی ایک اہم ذریعہ ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کوئٹہ کی ادبی، سماجی اور سیاسی صورت حال کی عکاسی ان میں ملتی ہے۔ جبکہ لکھنے والوں کا انداز بیان بھی خاصا دلچسپ ہے۔

سفرنامہ یہ وہ صنف نثر ہے جس میں افسانے اور ناول کے بعد سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ بلوچستان کے سفرنامہ لکھنے والوں کی کتب سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بیشتر بلکہ قریباً سارے سفر کسی خاص مقصد کے لیے اختیار کیے گئے۔ مختلف النوع مقاصد کے اسفار کے بعد واپسی پر یہ سفرنامے سفر لکھے گئے۔ ایک بھی سفرنامہ ایسا نہیں ملتا جس میں کسی نے سیاحت کی غرض سے سفر کیا ہو۔ جتنے سفرنامے بھی لکھے گئے وہ کسی سرکاری دورے، کسی این جی او کے تحت یا کسی دیگر مطالعاتی دورے کی عطا ہیں۔ اس لیے ان میں تقریباتی سرگرمیوں کا احوال بھی شامل ہے اور جانے کے لیے محکمانہ اجازت اور ٹکٹوں کی دستیابی بھی کا ذکر بھی۔ ایسے سفرناموں میں مذکورہ ممالک کی تاریخ بھی ملتی ہے جو پڑھنے والوں پر گراں گزرتی ہے۔ ظاہر ہے جب چار دن کے سفر کے بعد پوری کتاب جتنا سفرنامہ لکھا جائے گا تو اس ملک کی کتب تاریخ سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی کتاب کا مواد بھرا جائے گا۔ یہ صورت حال بلوچستان میں اُردو سفرنامے کے باب میں حوصلہ شکن ہے۔ شاہ محمد مری کے سفرنامہ چین آشنائی میں البتہ مصنف کی چشم تماشا دلچسپ انداز میں اپنی کتھا سناتی نظر آتی ہے۔ اس پر ان کا اسلوب اس کتاب کو پڑھنے کی خاص شے بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ان کا سفرنامہ بلوچ ساحل و سمندر ہے جو بلوچستان کے ایک علاقے گوادر کے بارے میں بڑی اہم معلومات دلچسپ انداز میں بہم پہنچاتا ہے۔

سنجیدہ مزاح لکھنا ایک دشوار امر ہے یہی وجہ ہے کہ بہت کم لکھنے والے اس میدان کا رخ کرتے ہیں۔ بلوچستان میں اُردو میں طنز و مزاح کے باب میں چند ہی کتب سامنے آئی ہیں۔ ان کے لکھنے والوں میں آغا محمد صادق اور معین الحق کے نام شامل ہیں۔ آغا محمد صادق کے مزاح میں مقامیت کا عنصر خاصا واضح نظر آتا ہے۔ وہ زبان، کردار اور واقعے کے مناظر میں مزاح پیدا کرنا جانتے ہیں۔ معین الحق کی مزاحیہ تحریریں بھی اس فن کے کم از کم معیار پر پورا اُترتی ہیں۔

بلوچستان میں اردو نثر کی عمر قریباً ساٹھ ستر سال ہے۔ اس کم عرصے میں جو ادب یہاں لکھا گیا وہ اگرچہ اتنا اعلیٰ نہیں کہ اپنے میدان میں ملکی سطح پر لکھے جانے والے ادب کا مقابلہ کر سکے۔ یہ بات حوصلہ افزا ضرور ہے کہ بلوچستان کے اہل قلم نے تمام تر مشکلات کے باوجود اُردو زبان کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا اور اپنے جذبات و احساسات کو ممکنہ حد تک خوبصورتی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُردو کے اہم ادبی مراکز سے طویل فاصلے کے باوجود تخلیق ہونے والا یہ ادب اس قابل ضرور ہے کہ اسے قومی ادب کے دھارے میں شامل سمجھا جائے، اس کی تنقیدی پڑھت کی جائے اور اُردو کی معاصر ادبی تاریخوں میں اس کا ذکر کیا جائے۔ اس تخلیقی ادب کو نظرانداز کرنا کسی طور مناسب

نہیں کہ اس سے علاقائی تفریق اور مغائرت میں اضافے کا اندیشہ ہے جو قومی یکجہتی کے باب میں زہرِ مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ بلوچستان کے مصنفین جس سماج اور ثقافت میں رہتے ہوئے اُردو میں لکھتے ہیں۔اس کے لیے بڑی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ جب تعلیمی اداروں میں اُردو کا چلن کم سے کم ہو اور سماجی سطح پر بلوچی براہوئی اور پشتو کا عام رواج ہو۔ عام لوگ اپنی زبانوں کے ادب اور وہ بھی صرف شاعری سے زیادہ لگاؤ رکھتے ہوں۔ ایسے ماحول میں اُردو نثر لکھنا واقعی کارے دارد ہے۔ بلوچستان کے مصنفین جس سطح کا ادب بھی لکھتے ہوں کیا یہ سوال کم اہم ہے کہ وہ لکھ رہے ہیں۔ وہ لکھے ہوئے لفظ کی قدر اور اہمیت سے آگاہ ہیں اور مقامی سطح پر انھیں پڑھا جاتا ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایسے قلم کاروں کے لیے سہولیات بہم پہنچائی جائیں تاکہ انھیں اپنی خامیوں پر قابو پانے کا موقع ملے اور وہ زیادہ بہتر سے بہتر ادب تخلیق کرسکیں۔

سفارشات

بلوچستان میں اُردو زبان و ادب اور تحقیق کے فروغ کے لیے درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ اس مقالے میں مذکور غیر مطبوعہ رپورٹ کی تدوین و اشاعت کی جائے۔

۲۔ ناول بندھن اور دوسری طبع شدہ نایاب کتب کی تدوین کے بعد از سرِ نو اشاعت کی جائے۔

۳۔ بلوچستان کی افسانہ اور ناول نگار خواتین کے کام کا جامعاتی سطح پر الگ الگ مطالعہ کیا جائے۔۔

۴۔ بلوچستان کی ادبی روایت کے تناظر میں اردو ادباء و شعراء کے کام پر تحقیقی و تجزیاتی مطالعوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۵۔ بلوچستان میں اردو تحقیق اور تنقید کی روایت کا الگ الگ مطالعات کی ضرورت ہے۔

۶۔ اردو میں پاپولر ادب کے پس منظر میں بلوچستان کی پاپولر خواتین ناول نگاروں کے تخلیقی کام کی اہمیت کا مطالعہ کیا جائے۔

۷۔ بلوچستان کے ادب میں پیش کردہ عورت کا مطالعہ بہ حوالہ صنف کیا جائے اور اس میں صنفی امتیاز اور استحصال کی نشاندہی کی جائے۔

کتابیات

☆ ابن حنیف، سات دریائوں کی سر زمین فکشن ہاؤس ،لاہور،۱۹۹۷ء

☆ اچکزئی،نصیب اللہ،چمن سے دہلی تک گوشہءادب،کوئٹہ،۲۰۱۵ء

☆ احمدزئی،آغااحمدخان، تاریخ بلوچ و بلوچستان، جلد اول بلوچی اکیڈمی،کوئٹہ،۱۹۸۸ء

☆ ارتضٰی کریم،اظہارعثمانی، اردو میں پاپولر لٹریچر اردواکادمی،دہلی،طبع دوم،۲۰۱۵ء

☆ اسلم آزاد،محمد،Silent Love عاصم پبلشرز،کراچی،س ن

☆ امدادنظامی،دوستوں کے درمیان وجدان پبلیکیشنز،کوئٹہ،۲۰۰۲ء

☆ امدادنظامی، کھیم کرن تا مونا بائو وجدان پبلیکیشنز،کوئٹہ،۲۰۰۳ء

☆ امرت مراد، گیلا کاغذ مہردر،کوئٹہ،۲۰۱۶ء

☆ انواراحمد،ڈاکٹر ، اردو افسانہ ؛ایک صدی کا قصہ مثال پبلشرز،فیصل آباد،۲۰۱۰ء

☆ انوررومان ، کوئٹہ قلات کے براہوی مترجم؛انعام الحق کوثر،قریشی پبلیکیشنز،کوئٹہ،۱۹۸۷ء

☆ انوررومان،قمقمے قلات پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۷۷ء

☆ انوررومان،خانہ بدوش اصغراسٹیشنرز،کوئٹہ،۱۹۷۷ء

☆ انوررومان،انوارئیے سیرت اکادمی بلوچستان،کوئٹہ،۲۰۰۰ء

☆ انوررومان،رومانیے ایضاً، ۲۰۰۱ء

☆ اوریامقبول جان، گرداب زمرد پبلیکیشنز،کوئٹہ،۱۹۹۴ء

☆ آغاصادق ، تبسمات بولان مسلم پریس،کوئٹہ،۱۹۷۱ء

☆ آغاگل ،پرندہ مہردر،کوئٹہ،۲۰۱۲ء

☆ آغاگل، پہاڑ اور محبت ٹی اینڈٹی پبلشرز،لاہور،۲۰۱۴ء

☆ آغاگل، دشتِ وفا کلاسیک،لاہور،۲۰۱۰ء

☆ آغا گل، بابو مکتبہ الحمراء ، لاہور، ۲۰۰۴ء

☆ آغا گل، بیلہ مکتبہ الحمراء، لاہور، ۲۰۰۲ء

☆ آغا گل، پرتھوی غوری دعائے حق پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

☆ آغا گل، آکاش ساگر عالمی ادارہ ادب وثقافت، لاہور، ۲۰۰۱ء

☆ آغا گل، دشت میں سفر روبی پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۸۶ء

☆ آغا گل، راسکوہ مکتبہ الحمراء ، لاہور، ۲۰۰۲ء

☆ آغا گل، گوانکو مکتبہ الحمراء، لاہور، ۲۰۰۵ء

☆ آغا گل، گوریچ دی ٹائمز پریس، کراچی، ۱۹۹۴ء

☆ بادینی، منیر احمد، اجنبی ، نیو کالج پبلیکیشنز، کوئٹہ، ۲۰۱۰ء

☆ بخاری، روحی شاہین ، آ نیلے گگن تلے مکتبہ روحی، کوئٹہ، ۱۹۶۹ء

☆ بخاری، روحی شاہین، اللھم لبیك الکریم پرنٹنگ، کوئٹہ، ۲۰۰۶ء

☆ بخاری، روحی شاہین، تیرے لیے سعید پرنٹنگ پریس، کوئٹہ ۲۰۱۰ء

☆ بخاری، روحی شاہین، شیرِ بلوچستان بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ۱۹۸۰ء

☆ بخاری، روحی شاہین، کاغذ کا بدن قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۸۱ء

☆ براہوی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، اردو اور براہوی کا تقابلی مطالعہ براہوی اکیڈمی، کوئٹہ، ۲۰۰۶ء

☆ براہوی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، براہوی زبان و ادب کی مختصر تاریخ مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۸۲ء

☆ براہوی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر، بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور ان کی حکومتیں زمرد پبلیکیشنز، کوئٹہ، ۱۹۹۰ء

☆ بریلوی، مصطفٰے علی، سید، انگریزوں کی لسانی پالیسی اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی، ۱۹۷۰ء

☆ بلوچ،سردارخان، بلوچ قوم کی تاریخ مترجم؛انوررومان،نساءٹریڈرز،کوئٹہ،۱۹۸۰ء

☆ بلوچ،محمدسعید،ملک، بلوچستان ما قبل تاریخ بلوچی اکیڈمی،کوئٹہ،۱۹۷۱ء

☆ بوہرہ،سیف الدین ، ایسا بھی ہوتا ہے شادپبلیکیشنز،کوئٹہ،۲۰۰۵ء

☆ بیگ،عرفان احمد ، گتے کے پہلوان الحمدپبلیکیشنز،لاہور،۲۰۰۱ء

☆ بیلوی،اللہداد، سفرنامہ بیلہ ، آواران پبلشروپریس ندارد،حب[بلوچستان]،۲۰۰۵ء

☆ پرتوروہیلہ، مترجم ومرتب؛ کلیات مکتوبات فارسی غالب نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد ،۲۰۰۸ء

☆ پریشان خٹک، پشتون کون پشتواکیڈمی،پشاور،۲۰۰۵ء

☆ پریم چند،مضامین پریم چند مرتب؛قمررئیس،یونیورسٹی پبلشرز،علی گڑھ،۱۹۶۰ء

☆ پشتون،عبدالفتح، سمندر جزیرہ میں رضاپرنٹرز،کراچی،۱۹۸۳ء

☆ پوٹنگر،ہنری، سفر نامہ سندھ و بلوچستان مترجم؛انوررومان،نساءٹریڈرز،کوئٹہ،۱۹۸۳ء

☆ جمالدینی،عبداللہ جان، لٹ خانہ سنگت اکیڈمی آف سائینسز،کوئٹہ،۲۰۱۳ء

☆ جمیل زبیری ، زرد پتے مکتبہ اربابِ قلم،کراچی،۱۹۷۸ء

☆ جمیل زبیری، رفتار حیات مکتبہ دانیال،کراچی،۲۰۰۲ء

☆ جمیل زبیری، لمحوں کی دہلیز دانیال،کراچی،باردوم،۱۹۹۱ء

☆ جوئیہ،خالداقبال، پڑاؤ بخاری ٹریڈرز،کوئٹہ،۱۹۹۱ء

☆ حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف اسلوب،لاہور،۲۰۱۵ء

☆ حمیداللہ،صاحبزادہ، ابو الانشاء کے انشائیے قلات پبلشرز،کوئٹہ،۲۰۰۱ء

☆ حمیدبلوچ، مکران سید ہاشمی ریفرنس لائبریری،کراچی،۲۰۰۹ء

☆ حمیدہ جبیں، دل کا شہر خالداکیڈمی،راولپنڈی،سال ندارد

☆ حمیدہ جبیں، راستے نسیم بکڈپو، لاہور، ۱۹۷۶ء

☆ حمیدہ جبیں، شاخِ بریدہ مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۹۹ء

☆ حمیدہ جبیں، گیت یہ میرے ایضاً

☆ حنیف خلیل، پشتو زبان و ادب کی مختصر تاریخ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،

☆ خادم مرزا، سات رنگ اور ایک گیان، ناشاد پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۹۷ء

☆ خلیل احمد، سید ، خمار زہر آلود قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۶۸ء

☆ خیام ثناء، ڈھائی دن محبت کے ساچ پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۱۴ء

☆ دانیال طریر، بلوچستانی شعریات کی تلاش پائلٹ ایجوکیشنل پروڈکٹس، لاہور، ۲۰۰۹ء

☆ ڈیمز، لانگ ورتھ، اے ٹیکسٹ بک آف دی بلوچی لینگویج بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ۱۹۹۱ء

☆ راز محمد خان، دی ہولی سینرز، غزنوی پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۰۷ء

☆ راکھی چوہدری، خواہش علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۶ء

☆ رفعت زیبا، رواج مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۷۳ء

☆ رفعت زیبا، چاند کا زہر قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۷۳ء

☆ رفعت زیبا، ناسور مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۶۷ئس

☆ زکریا، خواجہ محمد، مرتب: کلیات مجید امجد الحمد پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

☆ زیب لونی، جلتے خواب العارف پرنٹنگ پریس، کوئٹہ، ۲۰۱۶ء

☆ سلیچ، منیر احمد، ڈاکٹر، وفیاتِ ناموران پاکستان اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء

☆ شاکر، اسرار احمد، میرے بھی کچھ افسانے مہردر، کوئٹہ، ۲۰۱۵ء

☆ شاہدہ بخاری، ارمان جلے دل کے محسن پبلشرز، ملتان، س ن

☆ شاہدہ بخاری، انجانے دیس میں قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۰۴ء

☆ شاہدہ بخاری، یہ پیارے لوگ شاد پبلیکیشنز، کوئٹہ، ۲۰۰۶ء

☆ شاہدہ بیگم، سندھ میں اردو اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۰ء

☆ شیر دل غیب، تیرے فراق میں مہر در، کوئٹہ، ۲۰۱۵ء

☆ شیر دل غیب، آخری خط مہر در، کوئٹہ، ۲۰۱۶ء

☆ طاہر محمد خان، بلوچی زبان وادب قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۰۴ء

☆ طاہر محمد خان، زدو پشیماں قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۲۰۰۴ء

☆ ظہیر فتح پوری، ڈاکٹر، رسواؔ کی ناول نگاری حرف، راولپنڈی۔ ۱۹۷۰ء

☆ عابد بخاری، مالا گوشہ ادب، کوئٹہ، ۱۹۶۸ء

☆ عابد میر، جدائی کا پیش لفظ سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۰ء

☆ عابد میر، جنگ، محبت اور کہانی مہر در، کوئٹہ، ۲۰۱۱ء

☆ عابد میر، سرخ حاشیے ایضاً، ۲۰۱۳ء

☆ عابدہ رحمان، صرف ایک پُل مہر در، کوئٹہ، ۲۰۱۶ء

☆ عابدی، رضا علی، ریل کہانی سنگ میل، لاہور، ۱۹۹۷ء

☆ عابد، عابد شاہ، گلزار عابد سیرت اکادمی بلوچستان، کوئٹہ، ۲۰۰۰ء

☆ عارف ضیاء، اندر کا آدمی کوثر بک ڈپو، کوئٹہ، ۲۰۱۰ء

☆ عبدالحق، مولوی، مرتب؛ باغ و بہار انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۵ء

☆ عبدل، عبدالعلی، وحشت ناک سفر دارالشعور، لاہور، ۲۰۱۲ء

☆ عطاءاللہ، شیخ، مرتب؛ اقبال نامہ اقبال اکیڈمی، لاہور

☆ عنقا، محمد حسین، رحیلِ کوہ ادارہ حرف و قلم، کوئٹہ، ۲۰۰۶ء

☆ غرشین، زیب النساء، چلتن سے چین تک گوشہ ادب، کوئٹہ، ۲۰۱۲ء

☆ غرشین،زیب النساء، دیوتا دیس کے درشن ،مہردر،کوئٹہ،۲۰۱۴ء

☆ غرشین،یعقوب شاہ، آخری آنسو قلات پبلشرز،کوئٹہ،۲۰۰۳ء

☆ غرشین،یعقوب شاہ، باز گیر ایضاً،۲۰۰۴ء

☆ غرشین،یعقوب شاہ،عزم و حوصلے کی سر زمین ایضاً،۲۰۰۷ء

☆ فارس مغل، ہم جان زیب پبلشرز،لاہور،۲۰۱۲ء

☆ فاروق احمد،ڈاکٹر،بلوچستان میں اردو زبان و ادب قلات پریس،کوئٹہ۔۱۹۹۸ء

☆ فاروق سرور، ندی کی پیاس تھرڈ ورلڈ پبلیکیشنز،کوئٹہ،۱۹۹۶ء

☆ فردوسی،ابوالقاسم، شاہنامہ فردوسی وزارت فرہنگ والارشاد اسلامی،تہران،۱۳۸۳ھ

☆ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر، اردو نثر کا ارتقاء

☆ فریدی،نور احمد خان،بلوچ قوم اور اس کی تاریخ قصر الادب نور محل،ملتان،۱۹۶۸ء

☆ قانع،میر شیر علی، تحفتہ الکرام مترجم؛ اختر رضوی،سندھی ادبی بورڈ،جامشورو،۲۰۰۲ء

☆ قاضی،فردوس انور، خوابو ں کی بستی شبل پبلیکیشنز ،کراچی،۱۹۹۰ء

☆ قاضی،فردوس انور،آخری ٹرین ابلاغ پبلشرز،لاہور،۲۰۰۱ء

☆ قاضی،فضل الرحمٰن، وغیرہ وغیرہ شہزاد،کراچی،۲۰۰۵ء

☆ قاضی،اختر واحد، مرتب: وادیء بولان میں جے جی اسٹیشنرز،کوئٹہ،۱۹۵۵ء

☆ قدرت نقوی،سید، مرتب؛ ہنگامہ دل آشوب انجمن ترقی اردو،کراچی،۱۹۶۹ء

☆ قدوسی،اعجاز الحق، تاریخ سندھ مرکزی اردو بورڈ،لاہور،۱۹۷۱ء

☆ کامل القادری، مہمات بلوچستان گوشہء ادب،کوئٹہ،بارسوم ۲۰۰۸ء

☆ کامل القادری،قدیم بلوچستان بولان بک ڈپو،کوئٹہ،۱۹۷۱ء

☆ کوثر،انعام الحق،ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو ایضاً،۱۹۹۴ء

☆ کوثر،انعام الحق،ڈاکٹر، بلوچستان ایک مطالعہ ایضاً ،۲۰۷ء

☆ کوثر،انعام الحق،ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۸۶ء

☆ کوثر،انعام الحق،ڈاکٹر، بلوچستان میں فارسی شاعری بلوچی اکیڈمی،کوئٹہ،۱۹۶۸ء

☆ کوثر،انعام الحق،ڈاکٹر، بلوچستان ، چند پہلو ادارہ تصنیف وتحقیق،کوئٹہ،۲۰۰۵ء

☆ کوثر،انعام الحق،ڈاکٹر، جوئے کوثر بابر سٹیشنری مارٹ،کوئٹہ،۱۹۸۶ء

☆ کوثر،انعام الحق،ڈاکٹر، علامہ اقبال اور بلوچستان اقبال اکادمی،لاہور،۱۹۹۸ء

☆ کوثر،انعام الحق،ڈاکٹر،جد و جہد آزادی میں بلو چستان کا کردار ادارہ تحقیقات پاکستان،لاہور،۱۹۹۱ء

☆ مبارکہ حمید، بلوچستان میں اردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ نوید پبلیکیشنز،کوئٹہ، ۲۰۰۱ء

☆ مجید اصغر، رفت گزشت الحمد پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۰۴ء

☆ محسن سلطان، خود سے چھپا اداس آدمی ناشاد پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۹۳ء

☆ محمد حسنی،نورخان، فارس کا مسافر قلات پبلشرز،کوئٹہ،۲۰۰۲ء

☆ محمد حسنی،نورخان، ہمہ یاراں بہشت

☆ محمود ولی شاہ،ڈاکٹر، آپ بیتی ، بلوچستان بیتی کلاسیک،لاہور،۲۰۰۸ء

☆ مری،شاہ محمد، عشاق کا قافلہ ایضاً

☆ مری،شاہ محمد، بلوچ ساحل اور سمندر سنگت اکیڈمی آف سائینسز،کوئٹہ،۲۰۱۶ء

☆ مری،شاہ محمد، چین آشنائی سانجھ،لاہور،۲۰۰۷ء

☆ مری،شاہ محمد، سورج کا شہر ایضاً،۲۰۱۴ء

☆ مری،شاہ محمد، وفا کا تذکرہ مہردر،کوئٹہ،۲۰۱۱ء

☆ مری،شاہ محمد، میر یوسف عزیز مگسی سنگت اکیڈمی آف سائینسز،کوئٹہ،۲۰۰۹ء

☆ مری،شاہ محمد،بلوچ قوم ، قبائلی اور جاگیرداری عہد گوشہءادب،کوئٹہ،۲۰۱۴ء

☆ مری،شیر محمد، بلوچی زبان و ادب کی مختصر تاریخ بلوچی اکیڈمی،کوئٹہ،س ن

☆ مصطفٰے شاہد، آخری صفحہ ہزارگی اکیڈمی،کوئٹہ،۲۰۰۹ء

☆ معین الحق، تاریکیاں محمدی پبلشنگ کمپنی،کوئٹہ،۱۹۸۲ء

☆ معین الحق، مکھن ایضاً،۱۹۸۳ء

☆ نسیم جاوید، واپسی کا سفر بزم خسرو پاکستان،کوئٹہ،۲۰۱۵ء

☆ نسیم حجازی، داستانِ مجاہد قومی کتب خانہ،لاہور،۱۹۸۳ء

☆ نسیم حجازی، سوسال بعد قومی کتب خانہ ،لاہور،۱۹۸۹ء

☆ نسیم حجازی، شاہین قومی کتب خانہ،لاہور،۱۹۸۶ء

☆ نسیم حجازی، محمد بن قاسم قومی کتب خانہ،لاہور،۱۹۸۴ء

☆ نسیم حجازی، آخری چٹان قومی کتب خانہ،لاہور،۱۹۸۷ء

☆ نصیر،گل خان، بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں نساءٹریڈرز،کوئٹہ، ۱۹۸۲ء

☆ نصیر،گل خان، تاریخ بلوچستان قلات پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۷۹ء

☆ نصیر،گل خان، کوچ و بلوچ قلات پبلشرز،کوئٹہ،۱۹۸۳ء

☆ نعمت اللہ،صاحبزادہ، برملا قلات پبلشرز ،کوئٹہ،۲۰۰۳ء

☆ نعمت اللہ،صاحبزادہ، یورپ میں آٹھ ہفتے مکتبہ ہم زبان،کراچی،۱۹۸۷ء

☆ نعمت اللہ،صاحبزادہ،سحر انگیز مشرق اسامہ ٹریڈرز،کوئٹہ،۱۹۹۴ء

☆ وحیدزہیر، برعکس براہوی ادبی سوسائٹی،کوئٹہ،۲۰۰۱ء

☆ وقارعظیم، فن افسانہ نگاری ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۹۷ء

☆ ولایت حسین، عشقِ مجسم دعا پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۱۵ء

☆ ہاشم ندیم، مقدس علم وعرفان پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۱۳ء

☆ ہاشم ندیم، ایک محبت اور سہی علم وعرفان پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۱۰ء

☆ ہاشم ندیم، بچپن کا دسمبر ایضاً،۲۰۱۴ء

☆ ہاشم ندیم، پری زاد ایضاً

☆ ہاشم ندیم، خدا اور محبت دعا پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۱۱ء

☆ ہاشم ندیم، صلیب عشق ایضاً،۲۰۱۱ء

☆ ہاشمی،ظہورشاہ، نازک مترجم؛غوث بخش صابر،اکادمی ادبیات،اسلام آباد،

☆ ہتورام،لالہ، تاریخ بلوچستان سنگ میل،لاہور،۱۹۸۵ء

☆ ہتورام،لالہ، کتاب بلوچی نامہ مطبع مفید عام،لاہور،۱۸۹۶ء

☆ ہتورام،لالہ، گل بہار بلوچی اکیڈمی،کوئٹہ،۱۹۸۲ء

☆ ہروی،نعمت اللہ، تاریخ جہانی و مخزن افغانی مترجم: محمد بشیر حسین،مرکزی اردو بورڈ،لاہور، ۱۹۶۸ء

☆ یاسمین صوفی، تلاش، مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۷۸ء

☆ یاسمین صوفی، امائمہ مکتبہ عالیہ،لاہور،س ن

☆ یاسمین صوفی، عاطقہ،الحمراء پبلشرز،لاہور،۱۹۸۱ء

☆ یاسمین صوفی، فریحہ الحمراء پبلشرز،لاہور،۱۹۷۱ء

☆ یعقوب عامل، گل اندام دیدگ پبلیکیشنز،پنجگور،۲۰۰۹ء

☆ یوسفزئی،فیض محمد،ملک، یاداشتیں پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن بلوچستان،کوئٹہ،۱۹۹۷ء

ضمیمہ جات

ضمیمہ نمبرا: عکسی نقول غیر مطبوعہ رپورٹ تحصیل پشین۔ یہ مقالے کے باب دوم میں مذکور ہے۔ دیکھئے حواشی و کتابیات، حوالہ نمبر۲۷، صفحہ نمبر۱۰۴

ضمیمہ نمبر۲: عکسی نقول افسانہ تکمیل انسانیت از یوسف عزیز مگسی، مشمولہ: اخبار بلوچستان جدید، کراچی۔ یہ مقالے کے باب دوم میں مذکور ہے۔ دیکھئے حواشی وکتابیات، حوالہ نمبر۴۲، صفحہ نمبر۱۰۵

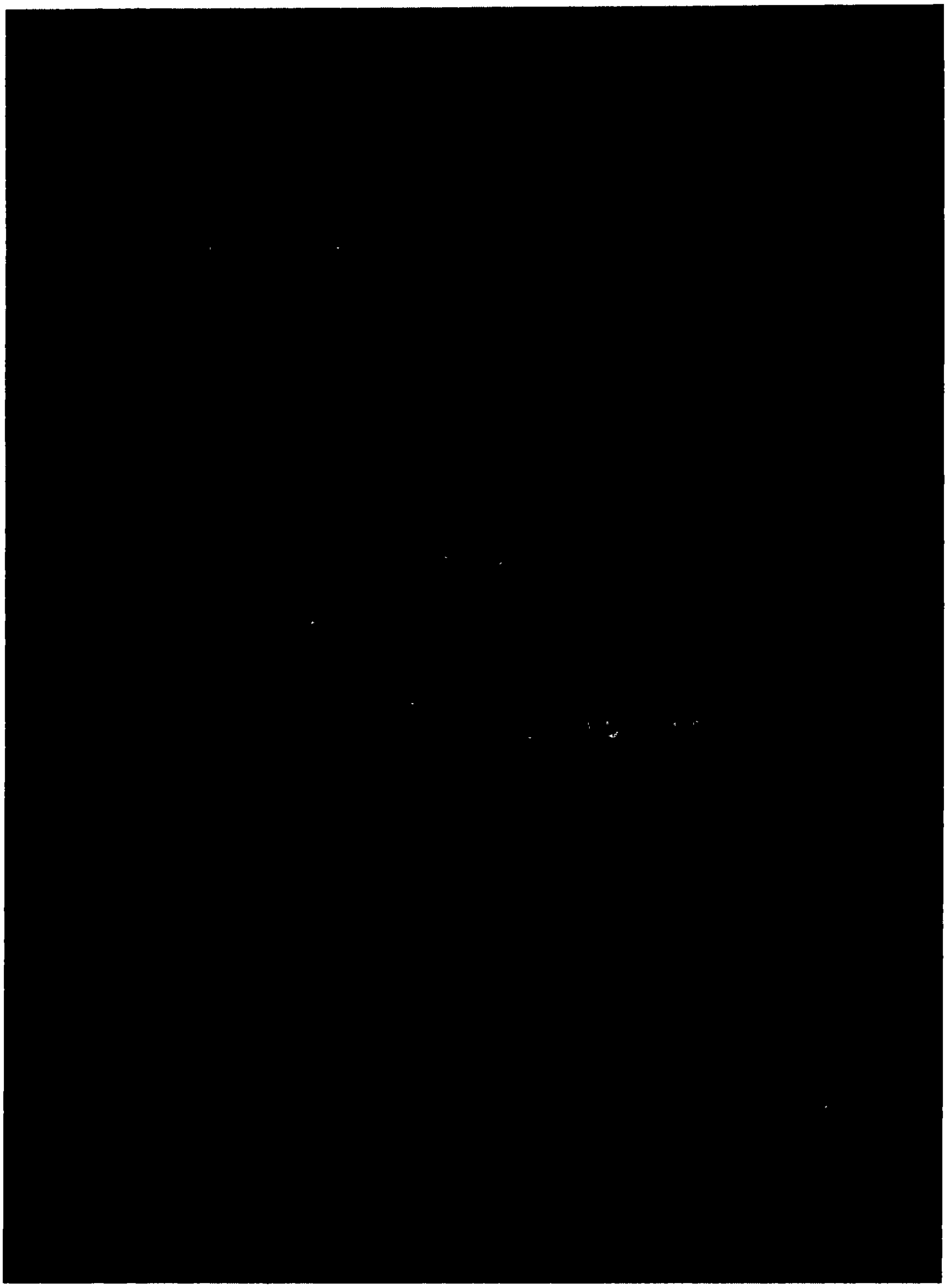

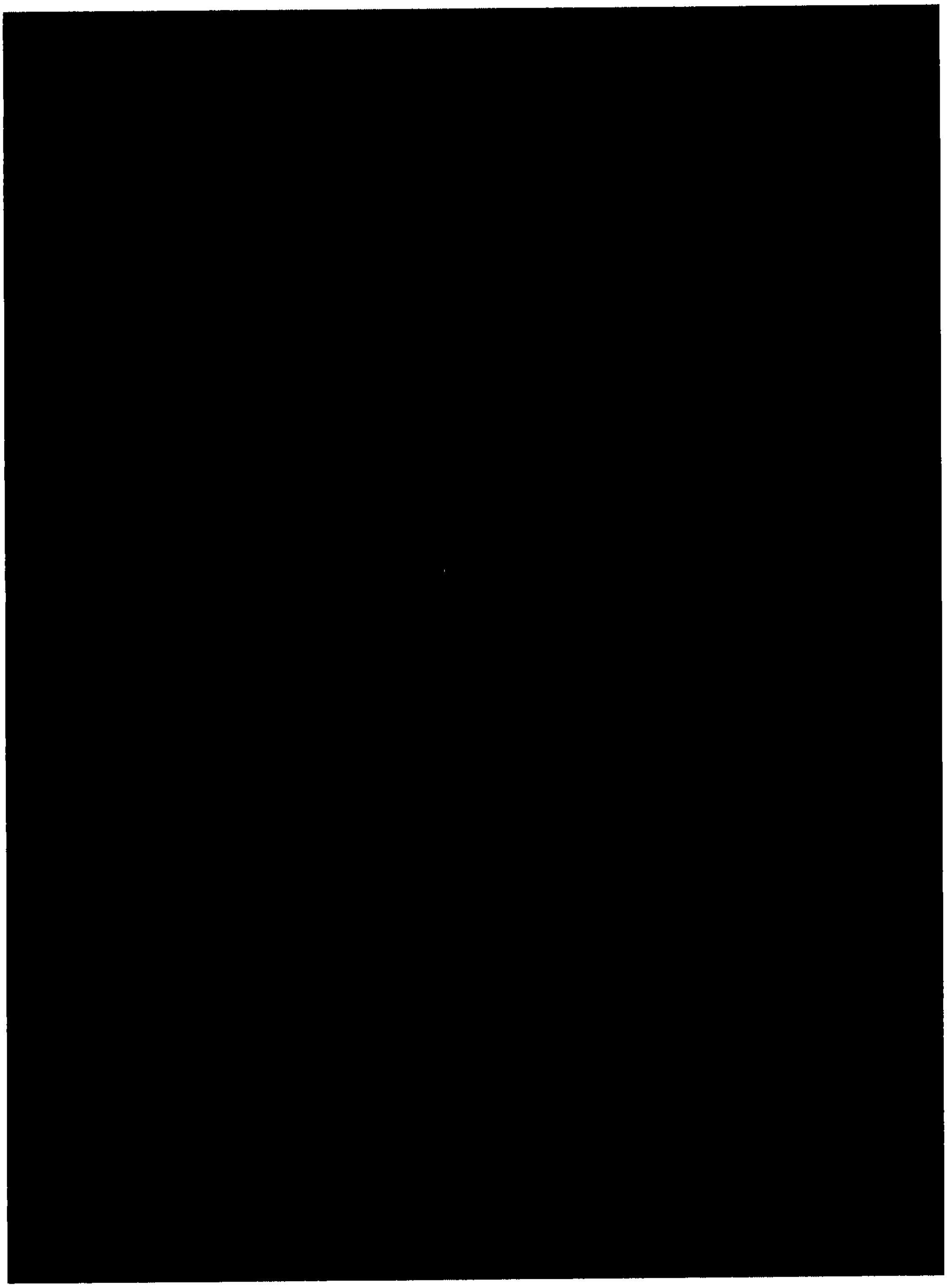

رجسٹر نمبر ایس 533

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اللہ اکبر

ہفتہ وار

بلوچستان جدید

الہیات

(حدیث)

وطنیات

(اقبال)

گورنمنٹ سے ... بیس روپیہ

محمد حسین ... پیر بخش نسیم تلوی ... ایڈیٹر

جلد ۱ | یوم شنبہ ۱۸ محرم الحرام ۱۳۵۳ھ مطابق یکم مئی سنہ ۱۹۳۴ | شمارہ ۷

بلوچستان کے اسرار

یہ ہم سے پوچھ لیں اگر بلوچستاں کے اسرار — بلوچستاں کی باتیں بھلا سمجھیں گے کیا اغیار
ہماری نسل کی اور دین کی کرتے نہیں ہیں جانچ — اگر یہ دیکھتے ہیں تو فقط عشرت زدہ سردار
وہ غول بھی ہے بلوچستان میں جس نے کیا پیدا — امان اللہ سا شاہ و جبری و عاقل و خود دار
وہ خون بھی ہے بلوچستان میں جس نے جسے کیا پیدا — رضا شاہ پہلوی سا ایک ماہر فن سپہ سالار
وہ خون بھی ہے بلوچستان میں جس نے کیا پیدا — عمر فاروق سا اسلام کا نامی علمبردار
بلوچستانیوں نے تفرقہ کے بت کو توڑا ہے — پہنچنا اب نہیں ہے منزل مقصود تک دشوار
بلوچ افغان برادری نام دے کر خوش رہنا — مسلمان ہیں پسند انکو نہیں تفریق نا ہنجار
کیا ہے ضبط اپنے کو بہت پر اب نہیں ہوتا — یہ انکا جانب کو یہ دیتا ہے بہت آزار

ستارہ جلد چمکیگا بلوچستان کا عنقا

کئے دیتا ہوں میں تو آج سے غیروں پہ یہ اظہار

پیر بخش پرنٹر و پبلشر نے ... پریس ... میں چھپوا کر دفتر بلوچستان جدید ... سے شائع کیا۔

Scanned by CamScanner

تکمیلِ انسانیت

طبعزاد افسانہ

(از محمد یوسف مسلی عزیز کمسی)

(۱) عزیز احمد شاہ کی ، عالموں کو تجسس لیے قدر گئی آنکھوں بدرین ... اور غزلی گرطف والا عزیز احمد ... برابر میں قدم رکھنے والا تھا ۔ کہ والد کے سایہ سے محروم ہوگیا ۔

ضلع کرتدامت پرست رئیسوں کا خیمہ ہے ...

[illegible]

... تقریباً پنتالیس برس تھی ۔ اور یہ سوتیلی ماں سے تھے ۔ چونکہ بڑے صاحبزادے ہونے کی حیثیت سے والد کی مسند کے جانشین ہونے والے تھے ۔ اسلئے چھوٹے ...

[illegible]

... تقسیم جائداد کے متعلق ... یوں دیا کہ نواب اشفاق احمد ...

[illegible]

غزل

(از عنقا)

شعر چھوڑوں مشاغلہ جائے   لذتِ غم علیحدہ جائے

انکو تجھ سے مشابہ کرتے ہیں   بھاڑ میں آفتاب و مہ جائے

دل سے جتنا نکالنا چاہا ہوں   عشق اتنا ہی تہ بہ تہ جائے

جب گیا ہی نہیں جبیں سے تری   دل سے پھر نہ کیوں گرہ جائے

میں بھی پھولوں کی سیر کو جاؤں   رشک کا گر کنا کشہ جائے

ایسے عاشق کا کیا مداوا ہو   اور بحفل سے بے نگہ جائے

فرق پھر گیا ہے مجھ میں اور اسمیں   آپ میں شکوہ و گلہ جائے

واں سے شاید ہوا صبا کا گذر   جب کبھی جائے فرش رہ جائے

پھر بھی تیرا پتہ بتا نہ سکوں   اور اتنا تو دل میں رہ جائے

جب تلک قوم اور عنقا ہوں
ان کا باہم معاملہ جائے

نواب کہلاتے تھے ۔ اور احساس ہے کہ اب چند روز میں ۱۵ ہزار روپیہ کی نسبت کے مالک ہونے والے تھے ۔ اور ساتھ ماں کی کثرت خود نمائی نے ... کو نشہ اور بچپن کی تربیت کے فقدان نے نواب اشفاق احمد خان کو تمدن ...

[illegible]

... انتظار اور امانت سمجھا ... زلفین کی ... فیصلہ کو جانتے ہو ...

[illegible]